مولانا مودودیؒ سے ملیے

ان کے پاس آپ کے لیے ایک پیغام ہے

ڈاکٹر سید اسعد گیلانیؒ

ترتیب

دیباچہ

انسانم آرزوست

کہو وہ کون حسین ہے تمھاری بستی میں
کہ جس کے نام کے ساغر اٹھائے جاتے ہیں

زندگی کے شہر میں اولادِ آدم کے انبوہ پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر آن کچھ تعداد پردۂ عدم کے پیچھے چلی جاتی ہے اور اپنے سے زیادہ جانشین پیچھے چھوڑ جاتی ہے مگر ان میں مجسمہ ہائے حسن وخوبی کم ہوتے ہیں۔ اشخاص کروڑوں ہوتے ہیں لیکن شخصیت کم میں پائی جاتی ہے اور پھر ان میں تاب ناک شخصیتیں تو اِکّا دُکّا سامنے آتی ہیں۔ ہمارے اس دور میں اور ہمارے اپنے ہی دیس میں ایک شخص ہیں، جن کو مولانا مودودی کہا جاتا ہے۔ میرے دوست سیّد اسعد گیلانی نے انھی ''مولانا مودودی'' کی شخصیت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

کسی شخصیت نگار کی پرکھ کرتے وقت دیکھنے کی پہلی چیز یہی ہوتی ہے کہ اس نے کس شخصیت پر نگاہ جمائی۔ اس لحاظ سے اسعد گیلانی کا انتخاب اس امر کا ثبوت ہے کہ اُن کی اپنی انسانیت کا معیار خاصا بلند ہے۔

دیکھنے کی دوسری چیز یہ ہے کہ جس مرتبے کی شخصیت سامنے ہے، کیا اس کے مطابق شخصیت نگاری کا حق ادا ہو گیا۔ اس سوال کا جواب نفیاً یا اثباتاً نہ میں دے رہا ہوں اور نہ میں نے یہ جواب سوچا ہی ہے۔ یہ جواب ہمیشہ زمانہ دیا کرتا ہے۔ البتہ اپنے تجربے کی روشنی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خود میں نے مولانا کی شخصیت کا ایک اجمالی خاکہ قلم بند کیا تھا، جو شائع بھی ہو چکا ہے[1] اور ایک آدھ مضمون اس کے علاوہ بھی لکھا۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ مولانا مودودی کے شخصیت نگار

---

(۱) ماہ نامہ نقوش لاہور، شخصیات نمبر جلد دوم

کی ذمے داری سے عہدہ برآ ہونا میرے بس میں نہیں ہے، اس کام کے لیے میرے اندر، جس درجے کا بڑا انسان موجود ہونا چاہیے، وہ شاید موجود نہیں ہے۔

دراصل مولانا مودودیؒ کی شخصیت کی تصویر اتنی پھیلی ہوئی ہے اور اس کے اتنے درخشاں گوشے سامنے ہیں کہ ان سب کا احاطہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر سوال صرف اسے پیش کر دینے کا نہیں۔ پیش اس طرح کرنا ہے کہ قاری یہ محسوس کرے کہ جیسے اس نے تصویر اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

مولانا کے اندر ایک داعیِ حق، ایک متکلم اسلام، ایک مفکر حیات، ایک ادیب ایک خطیب، ایک سیاسی قائد۔ ایک تنظیم کار بیک وقت جمع ہیں۔ ان کی شخصیت سیاسی و تاریخی اور علمی و ادبی ہر دو لحاظ سے بے حد اہم ہے اور پھر اس کے ساتھ حسن کردار کا اجتماع ان کو اپنے دور کی ایک قیمتی شے بنا دیتا ہے۔ مگر کسی ایسی جامع شخصیت کے حسن کو دوسروں تک منتقل کرنا ٹیڑھی کھیر ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کام کو کیا ہی نہ جائے، کوشش ہی کی راہ کامیابی کی منزل کو جاتی ہے۔

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جنھیں ان کے شخصیت نگاروں کا قلم زندگی دیتا ہے ورنہ وہ ہمیشہ گم نامی میں پڑی رہتیں۔ چناں چہ ڈاکٹر جانسن کے متعلق کارلائل نے ٹھیک کہا کہ اس کا نام شاعر اور قصہ گو یا مقالہ نگار اور مؤلف ہونے کی بنا پر زندہ نہیں ہے، بلکہ وہ زندہ ہے تو باسویل کی لافانی تصنیف کے اوراق کے بل پر زندہ ہے۔ اس سوانح عمری کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دنیا کے سوانحی لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔

دوسری قسم کی شخصیتیں وہ ہوتی ہیں کہ جن کی عظمت ان کے سوانح نگاروں کو بھی شہرت و عظمت کے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے۔ شخصیت نگار کو کسی حسین شخصیت کے حسن سے اسی طرح حصہ ملتا ہے، جس طرح مامون نے محبوبہ کی طرف بھیجے ہوئے قاصد کی آنکھوں کے متعلق لکھا تھا کہ ع

أری اثرًا منهُ بعینیک بَیّنًا
لَقدْ اَخذْتَ عَیْناکَ مِنْ عَیْنِهِ حُسْنًا

(تیری آنکھوں نے میری محبوبہ کی آنکھوں سے، جو حسن کا جوہر قبول کیا ہے۔ میں اس کا واضح اثر تیری آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں)

اس کی مثال میں مولانا مودودی کی شخصیت کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی شخص، جو آج یا کل مولانا کی شخصیت یا سوانح کو دنیا کے سامنے شایانِ شان طریق سے لائے گا اس کا نام مولانا مودودیؒ کے نام کے ساتھ ساتھ رہے گا۔ آج نہیں کہا جا سکتا ہے کہ کسے یہ مقام حاصل ہوگا!

مولانا مودودیؒ کی شخصیت اور سوانح میں بہت ہی غیر معمولی اہمیت کیوں پیدا ہوگئی ہے؟

سچ یہ ہے کہ شہرت کی زرنگار قبائیں دیکھ کر نگاہ کتنے ہی مواقع پر بہکی ہوگی مگر وائے ناکامی کہ ان قباؤں میں انسان کم ہی ملا۔ فرماں رواؤں کے طنطنے دیکھے، ادیبوں کے چمنستان ہائے نگارش دیکھے، شعرا کی زمزمہ سنجیوں سے استفادہ کیا، جادو بیان خطیبوں کی طلاقتِ لسانی کے شعبدے دیکھے۔ اہلِ علم کی نکتہ آفرینوں سے بہرہ پایا اور مذہبی شخصیتوں کو عقائد و احکام کی وضاحت کرتے اور کفر و ایمان کے فیصلے کرتے دیکھا۔ مگر کم ہی ایسا ہوا کہ انسانیت کے حسن سے دامن نگاہ بھرا ہو۔ سچ کہا ہے:

آدمیت! تیری تلاش رہی
دیکھے ہیں پردہ ہائے نام بہت

مگر مودودیؒ کے اندر انسان کو موجود پایا اور زندہ پایا اور اسے انسانِ عظیم پایا۔ مودودی کی عظمت تاریخی لحاظ سے یہ ہے کہ اس نے حالات کے دھارے پر بہنے والے انبوہ ہائے کثیر کے بالمقابل دھارے سے لڑنے کا مسلک اختیار کیا ہے۔ بہنے والے وہ بھی ہیں، جو پانی پر پرشکوہ تخت بچھائے بہہ رہے ہیں۔ وہ بھی، جو خوب صورت بجرول میں بہہ رہے ہیں۔ وہ بھی جو براہِ راست موجوں کی آغوش میں جھولے لیتے ہوئے بہہ رہے ہیں اور وہ بھی جو غوطے کھا کھا کر بہہ رہے ہیں اور یہ بہنے والے ایک ایک کر کے ڈوب بھی رہے ہیں۔ مادّہ پرستی کے اس طوفانِ مغرب میں، جو قیمتی عنصر دھارے کے خلاف لڑ رہا ہے یا کم سے کم قدم جمائے کھڑا ہے یا کھڑا رہنے کی سعی کر رہا ہے۔ اس کے درمیان مولانا مودودی کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ کیوں کہ وہ وقت کی ہوا کے ساتھ چلنے پر ایک لمحے کے لیے کبھی راضی نہیں ہوئے بلکہ برابر ہوا کا رُخ بدلنے کے لیے کوشاں ہیں۔

دراصل کسی دینی ملت کی ساری زندگی کشمکش کی زندگی ہوتی ہے۔ کیوں کہ اسے ایک واضح عقیدہ اور ایک معینہ ضابطے کے تحت پورے تمدن کو چلانا ہوتا ہے۔ مگر حالات کی ہوائیں موافق ہی

نہیں، مخالف ہو کر بھی چلتی ہیں۔ مخالف ہواؤں کے چلنے پر سفینۂ تمدن کا رُخ اپنے اصولی نصب العین کی جانب رکھنا ایک کٹھن کام ہے۔ یہی کٹھن فریضہ ملت اسلامیہ کے سر عائد ہے۔ یہ فریضہ خلافتِ راشدہ کے دور تک ملت اسلامیہ نے بہ خوبی سر انجام دیا، مگر بعد میں بدلتے حالات کا مقابلہ کما حقہٗ جاری نہ رہا۔ ایک اصولی نظام کا رُخ تاریخ کسی قدر موڑ لے گئی۔ مسلمانوں پر ماضی میں ایسے دو بڑے خوفناک دور آئے۔ ایک عباسی دور، دوسرا سلطنتِ مغلیہ میں اکبر کا دور۔ ان دونوں موقعوں پر، جو قوت سفینۂ ملت کی ناخدائی کر رہی تھی، وہ طوفانی ہواؤں اور موجوں کے سامنے خم کھا گئی اور ان دونوں موقعوں پر طوفان سے لڑنے اور نظریہ و اصول کو بحال رکھنے کی سعادت اُن مردانِ خدا کے حصے میں آئی، جن کے پاس ایمان، علم اور کردار کے سوا کوئی دوسری طاقت نہ تھی۔ اور اب تیسرا سنگین ترین دور درپیش ہے، جس میں باہر سے فکری، سیاسی اور ثقافتی اثرات کا طوفان خوفناک رفتار سے پورے عالم اسلام میں بہہ رہا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقے اور ان میں سے اُٹھے ہوئے اربابِ قیادت، جن پر قلعہ کے بچاؤ کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ ذہنی غلامی کے روگ نے ان سے تاپ مقاومت سلب کر لی ہے اور وہ ہنستے مسکراتے اور خوش آمدید کہتے ہوئے کنجیاں دشمن کے حوالے کر رہے ہیں۔ عالم وہ ہو گیا ہے کہ

مستی سے اس نگاہ کی لے محتسب خبر
دنیا تمام بزمِ خرابات ہو گئی

یہی وہ خطرناک مرحلہ تھا، جس کے لیے اقبال نے یہ احساس قوم کو دلانا چاہا تھا کہ تم میدانِ جنگ میں ہو اور یہ موقع نوائے چنگ سے لطف اندوز ہونے کا نہیں۔ بلکہ اس مردِ فرد انگر نے "دورِ حاضر کے خلاف" اس بھروسے پر اعلانِ جنگ بھی کر دیا تھا کہ قوم کے نوجوان اس کے اعلان پر صف بستہ ہو جائیں گے۔ آج اگر وہ نغمہ طراز جہاد اٹھ کے دیکھے کہ اس کے شاہین و عقاب کس شان سے پسپا ہوتے ہیں تو اپنے رجز کو واپس لے کر شاید وہ مرثیہ پڑھنے پر مجبور ہو جائے۔ بہر حال اقبال کے اعلان جنگ کی لاج رکھی تو مولانا مودودی نے کہ خود ہی فکری و تہذیبی جنگاہ میں سینہ سپر نہیں ہوئے بلکہ قوم کے اندر سے جی دار اور صاحب کردار عنصر کو اپنے گرد سمیٹا۔

مولانا مودودیؒ نے اس کوشش میں اپنی پوری زندگی کھپا دی ہے کہ حالات کے سامنے

جھک کر اپنے اصولوں کو مسخ کرنے کے بجائے ہم اصولوں کو قائم رکھنے کے لیے حالات سے جنگ کریں۔ اسلام کو ہم اپنی سہل طلبی کی وجہ سے تاریخ کے تابع نہ کردیں بلکہ تاریخ کو مجبور کردیں کہ وہ اسلام کے منشا کے مطابق رہے۔ مودودی کا مشن یہ ہے کہ ہم مغربیت کے سانچے میں آرام سے نہ ڈھل جائیں بلکہ مغربیت کے مقابل میں اسلامی نظریہ، اسلامی نظریۂ حیات اور اسلامی تہذیب کو برپا کریں۔

یہ درحقیقت اپنی خودی کے تحفظ اور اپنی ہستی کی بازیافت کا پیغام ہے۔ اس پیغام سے اثر پزیر ہونے والوں کا احساس یہ ہوتا ہے کہ

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

مادّیت کے مقابلے میں کھڑے ہونے کے لیے جس ایمان و شعور کی ضرورت ہے اسے نوجوانوں میں اُبھارنے کے لیے مولانا مودودی نے ایک عظیم فکری کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ہزارہا صفحوں پر پھیلا ہوا لٹریچر فراہم کیا ہے، جس میں کتاب و سنت کی حکمت اور علومِ حاضر دونوں کی روشنی میں تہذیبِ مغرب کے خلاف اپنا مقدمہ نہایت مدلل طور پر ثابت کیا ہے اور اسلام کی اساسی صداقتوں سے لے کر اس کے اصولی احکام تک ہر چیز کو اس طرح منقح کردیا ہے کہ اس دور کے عقلیت زدہ ذہن اس کے زیرِ اثر فکری انقلاب سے دوچار ہوجاتے ہیں اور انھیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں اپنی گم شدہ ہستی دوبارہ ہاتھ آگئی ہے۔

مولانا مودودی نے اسلام کو انفرادی مذہب کی حیثیت سے نہیں پوری زندگی کے بہترین نظامِ عدل کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے اور بے شمار دِلوں کو اس کی برتری کے اعتراف پر مجبور کردیا ہے۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے اس نظام کو عملاً قائم کرنے کی جدوجہد کے لیے نوجوان طاقت کو اٹھا کر کھڑا کیا ہے۔ شہریوں میں، دیہاتیوں میں، تاجروں میں، ملازمین میں، ادیبوں اور صحافیوں میں، طلبہ میں خواتین میں، مزدوروں میں۔ غرض کہ ہر طبقے میں ایک فعال طاقت موجود ہوگئی ہے۔

اس معرکۂ استدلال میں ایسی بھرپور فتح مولانا مودودی کو حاصل ہوئی ہے کہ بے اختیار یہ شعر نوک قلم پر آگیا ہے ع

مَستنا فَلَمْ نَتْرُكْ مَقَالا لِصَامِتٍ

وَ قُلْنَا فَلَمْ نَتْرُكْ مَقَالاً لِقَائِلِ

''ہم جب خاموش ہوئے تو کسی خاموش بیٹھنے والے کے لیے کہنے کی کوئی بات باقی نہ رہی اور جب ہم نے بات کی تو ہم نے کسی بات کرنے والے کے لیےکوئی موضوع نہ چھوڑا۔''

مولانا مودودی کا لٹریچر آج محض کسی ایک ملک یا کسی ایک بستی میں موجود نہیں ہے، بلکہ متعدد دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوکر عالم اسلام اور یورپ اور امریکہ میں بھی پھیل رہا ہے۔ اس کے نفوذ کا یہ حال ہے کہ مولانا کے مخالفین تک کے ذہنوں میں اس کی صداے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس لٹریچر کے چھیڑے ہوئے مسائل، اس کا طرزِ فکر اور اس کی اصطلاحات کس گوشے میں موجود نہیں۔ بارہا اونچے اونچے ایوانوں سے ایسی تقاریر سنی گئی ہیں، جن میں یہ لٹریچر بول رہا ہوتا ہے یعنی ع

اب وہی سارے زمانے کی ادا ٹھیری ہے

مولانا مودودیؒ محض حکیم و مفکر اور ادیب ہوتے اور صرف اپنا پیغام ہی دے جاتے تو بھی ان کی عظمت کے کنگروں کو چھونا بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا۔ مگر انھوں نے انقلاب کی عملی جدوجہد کی ذمے داریاں بھی اٹھائی ہیں اور مردانہ وار اٹھائی ہیں۔ قوم کو پکارا، لبیک کہنے والوں کو جمع کیا، ان کو نظم میں پرویا، ان کی تربیت کی، نصب العین کے لیے ان کو وقت، قویٰ اور مال کی قربانی دینے کا درس دیا۔ ان کو سیاسی و عمرانی مسائل کا گہرا شعور دیا، ان کو مفاد کی کشمکش سے بے نیاز رہ کر زندگیوں کو انسانی اور ملکی خدمات کے لیے وقف رکھنے کا جذبہ دیا، پھر اس بہم شدہ قوت کے بل پر ایک طرف الحاد پسند، کمیونسٹ، مغرب پرست اور جاہ طلب عناصر کی مزاحمت نظریاتی اور سیاسی میدانوں میں جاری رکھی، دوسری طرف عوام ملک کو اسلامی نظام کے لیے تیار کرنے کی مہم چلائی۔ اخلاقی فساد کا مقابلہ کرنے کے لیے ''انجمن تحفظِ اخلاقِ عامہ'' کی تاسیس کی، تعلیم عوام کے لیے قرآن وحدیث کے درسوں، دارالمطالعوں، تعلیم بالغاں کے اداروں اور اسکولوں اور مدارس کا اجرا

کیا۔ وقت کے مسائل سے جمہور کو آگاہ رکھنے کے لیے سلجھے ہوئے خطیبوں اور مقرروں کی ایک بہت بڑی ٹیم میدان میں اتاری۔ محنت کشوں کو ان کے حقوق دلوانے کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا۔ غریب طبقوں کو بیماریوں سے بچانے اور بڑے بڑے مواقع مصیبت پر سہارا دینے کے لیے شعبۂ خدمت خلق قائم کیا۔ خواتین میں دین اخلاقیات اجتماعی مسائل کا شعور اور جدوجہد کا جذبہ پھیلانے کے لیے ان کی تنظیم کی، نوجوان طلبہ کو الحاد، کمیونزم اور مغربیت کا مقابلہ تعلیمی دائروں میں کرنے کے لیے خطوطِ کار بہم پہنچائے۔ اور ان کو رہ نمائی اور تربیت دی۔ ادب کی دنیا میں اسلامی قدروں کے مشعل بردار کھڑے کیے۔ غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ میں تعمیرِ نو کے لیے ایک حرکت پیدا کر دی۔ آج اتنی رفیع الشان دینی و قومی خدمات کو انجام دینے والی مشین معطل ہو چکی ہے اور اس کے پرزے کھلے پڑے ہیں۔

بدقسمتی سے مولانا مودودیؒ کو نہایت گھٹیا حریفوں سے سابقہ پڑا۔ زمانے نے اس داعیِ فلاح کا خیر مقدم اولاً گالیوں، پھبتیوں، الزام تراشیوں اور تکفیر و تفسیق سے کیا۔ اور پھر غداری، تخریب اور دوسرے سیاسی الزامات وضع کیے گئے۔ قید و بند کے دور آئے اور بالآخر ایک دن اس مسافر راہِ حق نے دیکھا کہ پھانسی کی کوٹھری اس کی منزل بن گئی ہے۔

چلی تھی بات جو منبر سے، دار تک پہنچی
قلم کی نوک سے خنجر کی دھار تک پہنچی
مگر صدا تری گردوں کے پار تک پہنچی

ظلم و جور کی یہ بھٹی ہر داعیِ حق کے لیے گرم کی جاتی ہے کیوں کہ بغیر اس سے گزارے کھرے کھوٹے کا امتیاز نہیں ہو سکتا۔

اسی لیے عشق کی نگری کا دستور یہ ہے کہ کلمہ خیر کہیے اور گالیاں کھایئے۔ پھول برسایئے اور کانٹوں سے دامن بھریئے، موتی لٹایئے اور پتھر کھایئے۔ بے لوث خدمت کیجیے اور مجرم ٹھہریے۔ راستی کے مسلک پر چلیے اور تعزیر بھگتیے۔ مولانا مودودی کی شخصیت بفضلہٖ تعالیٰ ان بھٹیوں سے گزر کر کھرا سونا ثابت ہوئی۔

اور آج اس لمبی کشمکش، عمر بھر کی تعمیری جدوجہد اور امتحان بلا کی لذت کشی نے صورت ایسی پیدا کر دی ہے کہ مولانا مودودی راہِ حق کی ایک علامت ٹھہرے ہیں۔ امام احمدؒ بن حنبل

عقوبت سے گزرنے کے بعد اپنے دور میں علامتِ حق بن گئے تھے اور ان کی ذات معتزلہ اور دوسرے فتنہ طرازیوں کے مقابل میں محاذ سنت کا ایسا مرکز بن گئی تھی کہ ایک شاعر پکار اُٹھا:

تَرَی خَا الهویٰ جهلاً، لِاَحمَد مُبغضًا

وَ تَعْرِف ذا التقویٰ، یُحِبُّ ابن حنبل

''تو بندگان ہوس کو دیکھ کہ وہ جہالت زدہ ہوں گے اور احمدؒ بن حنبل سے بغض رکھتے ہوں گے اور اہلِ تقویٰ کو تو اس علامت سے پہچان کہ ابن حنبلؒ کے لیے ان کے دلوں میں محبت موجزن ہوگی۔''

مولانا مودودی بھی اس دور میں اور اس ملک میں حق کے محاذ کی ایک نمایاں علامت بن گئے ہیں۔ وہ ایک شخص نہیں رہے بلکہ ایک دعوت، ایک پیغام، ایک تحریک، ایک جدوجہد، نظامِ زندگی اور ایک انقلابی محاذ کا مظہر ہیں۔ عینی مشاہدہ ہے کہ صدہا لوگ آتے ہیں، ایک نظر مولانا مودودی کو دیکھتے ہیں اور بس اتنے ہی سے ان کو امیدیں، امنگیں اور ہمتیں استوار ہو جاتی ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ تجدید واحیاے اسلام کا کام اس تاریک ترین دور میں بھی ہوسکتا ہے۔ انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ رات کتنی بھی لمبی ہو اس کی کوکھ سے صبح جنم ضرور لے گی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مودودی کے اندر، جو انسان عظیم پایا جاتا ہے وہ بہ حیثیت انسان کشمکش اور امتحان ہی کے مراحل میں نہیں بلکہ غیر معمولی درجے کی شہرت واعزاز کے درمیان بھی برابر حسن پاش رہا ہے۔ اس کی طرف سے کسی کو کچھ بھی گھٹیا پن کا تجربہ نہیں ہوا۔ ہزار ہا انسان اس سے ہر سال ملتے ہیں۔ ہر روز مختلف طبقوں کے اور علاقوں کے نت نئے ملاقاتی آتے ہیں، مختلف قسم کے ظروف واحوال میں اسے دیکھتے ہیں۔ مگر اُسے دیکھ کر کبھی کسی کو مایوسی نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ اس کے نادان حریف بھی تنہائیوں میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ آدمی بس وہ ایک ہے، جو نہ کبھی بکا، نہ جھکا۔

جی ہاں! لوگوں نے عجیب عجیب حرکتیں کیں۔

بعض نے اسے نظر انداز کرنا چاہا کہ گویا وہ موجود ہی نہیں۔ انھوں نے اس سے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن ان کے مساموں کو بھی دکھائی دیا کہ ایک کوہِ گراں سامنے کھڑا ہے اور یہ تردید نہیں کی جاسکتی کہ وہ موجود نہیں ہے یا وہ محض ایک ذرّہ ناچیز ہے، بعض نے بہت اونچی اونچی مسندیں بچھا کر مصنوعی مناسب کی بلندیوں سے اسے دیکھا کہ شاید وہ اس طرح ان کے مقابلے میں پست

رہ جائے گا مگر اس سرو بلند و بالا کا قامت کوتاہ نہ ہوسکا۔ بعض نے اسے ''ملاّ'' کہہ کر ادنیٰ بنانا چاہا۔ مگر کیا خوب کہا تھا بغداد کے رند شاعر ابونواس نے:

ولا يطمئن - فى ذاك منى طامع
ولا صاحب التاج المحجب فى القصر

مجھ سے میرے مقامِ فخر کو چھیننے کے لیے کسی شائق کا جی نہ للچائے، حتیٰ کہ اس تاجدار کو بھی اس کے درپے نہ ہونا چاہیے، جو تصرف ہی کے سراپردہ میں دربانوں کے درمیان گھرا بیٹھا ہے۔

ایسی درخشاں شخصیت کی سوانح نگاری یا شخصیت نگاری کی ذمے داری اٹھانے والوں کے لیے ایک اہم کام یہ ہے کہ اس کی شخصیت کا صحیح مرتبہ اور مقام اور موقف واضح کریں۔ ہونے کو تو یہ کام از خود ہو رہا ہے اور ایک شمع روشن کے گرد کتنا بھی غبار کیوں نہ پھیلا رہے وہ اپنے تعارف کے لیے اس کی محتاج نہیں ہوتی کہ کوئی قصیدہ خواں یہ بیان کرے کہ یہ شمع ہے اور اس کی روشنی بھی ہے (ابونواس کا جو، شعر اوپر درج ہوا اسی کے ساتھ کا ایک مصرع ہے:

فهى عن جميع الناس حسبى من الفخر

میرا دہن، یعنی زبان تمام لوگوں کے مقابلے میں میرا سرمایۂ افتخار بننے کو کافی ہے۔

اس لیے مولانا مودودی کے لیے بھی ان کا اپنا ایمان و کردار ان کا مقام متعین کرنے کے لیے کافی ہے مگر معاصرت زدہ عناصر جب کسی کام کے آدمی کے گرد تعصّبات اور غلط فہمیوں کا غبار پھیلا دیتے ہیں تو بہت سے لوگ استفادہ کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ تا آں کہ حقیقت از خود ان پر آشکارا ہو۔

بڑا سوال یہ ہے کہ معاشرے میں، تاریخ میں اور اپنے دور میں اس کی جگہ کیا ہے؟

معاشرے میں لوگوں نے اسے زیادہ سے زیادہ زعماء کی صفوں میں جگہ دی ہے۔ تاریخی کشاکش کے لحاظ سے اسے حریفوں نے ایک اقتدار طلب شخصیت کے رنگ میں دکھانا چاہا ہے اور دور کے لحاظ سے اسے بیرونی اور اندرونی مخالفین نے مغرب کے اسلام دشمن پروپیگنڈے کی مروّجہ اصطلاح کے مطابق ایک قدامت پسند اور رجعتی شخصیت ثابت کرنے کی کوشش کی

ہے۔ حالاں کہ معاشرے کے موجودہ طبقوں میں سے کسی میں بھی مولانا کی ذات پوری طرح نصب نہیں ہوتی۔ ان کے لیے ایک نئی جگہ درکار ہے۔ کیوں کہ وہ قدیم و جدید طبقوں کے درمیان بالفاظ خویش ''بیچ کی راس کے آدمی'' کی حیثیت سے کھڑے ہیں۔ تاریخی کشمکش کے لحاظ سے وہ اسلامی نظریے اور اصولوں کو برسرِ اقتدار لانے کے لیے کوشاں ہیں۔ دور کے لحاظ سے وہ علم اور سائنس کی ساری ترقیوں سے استفادہ کرنے اور مسائل تازہ کو اجتہادی زاویہ نگاہ سے حل کرنے کے داعی ہوتے ہوئے مادّیت کا طلسم توڑ کر انسانیت کی لازوال اخلاقی قدروں پر تمدن کی بنیاد رکھنے کے خواہاں ہیں۔ مگر کم لوگ اور مخالفین میں تو بہت ہی کم لوگ ان کے صحیح مقام کو جان سکے ہیں۔ یہ کام مولانا کے سوانح نگار اور شخصیت نگار کا ہے کہ وہ ان کو صحیح مقام پر دکھائے۔

بات آخر لمبی ہو ہی گئی!

محترم دوست اسعد گیلانی نے مولانا مودودی کی شخصیت پر، جو کچھ بھی مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، وہ میری نگاہ میں دو وجوہ سے بڑی قیمتی ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ خود اسعد گیلانی کے اندر کا انسان زندہ و توانا ہے اور وہ مولانا مودودی کی انسانیت کا مطالعہ کرنے اور حاصلِ مطالعہ کو پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے پاس وہ سرمایۂ اخلاص و محبت موجود ہے، جو اس کام کے لیے نہایت ضروری ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ اسعد گیلانی اہل نظر کی اس صف کے ایک فرد ہیں، جنھیں مولانا مودودی سے قریبی تعارف بلکہ رفیقانہ رابطے کی سعادت حاصل ہے۔ وہ استحقاق رکھتے ہیں کہ مولانا کی شخصیت کی عکاسی کریں۔ تیسرے اس وجہ سے کہ موصوف کے ہاتھ میں ایسا حقیقت نگار قلم ہے، جو زبان و ادب پر قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ قاری کے دل میں تحریک پیدا کر سکتا ہے۔

پس میں یہ پیشین گوئی کر سکتا ہوں کہ مولانا کی شخصیت اور سوانح کے اب تک، جو خاکے مرتب ہوئے ہیں، ان میں اس تازہ خاکے کا اضافہ نہایت قابلِ قدر ہوگا۔

مبارک ہیں وہ ہاتھ، جو تاریکی میں کاغذی فانوس کے اندر حسن انسانیت کی ایک شمع روشن کر رہے ہیں۔

نعیم صدیقی

حرفِ اول

۱۹۵۳ میں میں نے ارادہ کیا تھا کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پر ایک کتاب لکھوں۔ اس وقت مولانا مودودی جیل میں تھے اور وقت کے اربابِ اقتدار سے سزائے موت سننے کے بعد ۱۴ سال کی عمر قید گزار رہے تھے۔ میرے چند ایک مضامین رسائل میں شائع ہوئے تو بعض احباب نے بھی اِس طرف توجہ دلائی کہ میں اس موضوع پر ایک کتاب تیار کردوں۔ جیل میں محبوس ایک محترم دوست سید نقی علی صاحب سے ارادے کا اظہار کیا تو انھوں نے بھی اس کی پرزور تائید کی اور میں نے اس پر کام کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ بلکہ لاہور کے ایک پبلشر کو اشاعت کے لیے خط بھی لکھا۔ پبلشر کا جواب آنے سے پہلے ہی ایک روز کراچی کے ایک نہایت ذمہ دار دوست نے مجھے بلاکر پوچھا ''کیا تم مولانا مودودی پر کوئی کتاب لکھ رہے ہو'' میں نے حیرانی کے ساتھ اپنے ارادے کا اقرار کیا۔ حیرانی اس لیے ہوئی کہ میں نے اس بات کا تذکرہ ان سے یا کسی اور سے نہیں کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ آج مجھے ایک خاص ذریعے سے سی آئی ڈی دفتر سے یہ معلوم ہوا ہے کہ انھیں لاہور سے وائرلیس آئی ہے کہ چھاپہ مار کر تمھاری اس کتاب کے مسوّدے پر قبضہ کرلیا جائے اور ہوسکتا ہے کہ اسی رات چھاپہ پڑ جائے اس لیے کہ ارباب اقتدار اس کتاب کی اشاعت کو ناپسند کرتے ہیں۔ تم اپنا مسودہ محفوظ کرلو۔ میں نے وہ نامکمل سا مسودہ محفوظ کرلیا۔ لیکن پھر چھاپہ نہیں پڑا۔ وہ نامکمل مسودہ پھر کچھ ایسا محفوظ ہوا کہ اس پر برسوں گزر گئے۔ ۱۹۵۴ کے وسط میں مجھے تبلیغی کام کے سلسلے میں مشرقی پاکستان جانا پڑا اور ۱۹۵۶ میں وہاں سے واپس آ کر دوسرے تبلیغی کاموں میں ایسا مصروف ہوا کہ پھر اس طرف توجہ ہی نہ کرسکا۔ یہاں تک کہ مارشل لا نے ہر قسم کی مصروفیت کے کاموں سے فارغ کر دیا اور مجھے لکھنے پڑھنے کی طرف دوبارہ توجہ دینے کا موقع ملا۔ اب اس پرانے مسودے کو دیکھا تو اس کی حیثیت محض کام کے لیے جذبہ پیدا کرنے اور رُخ

متعین کرنے کے لیے ایک بنیاد کی تھی اس سے زیادہ کچھ نہ تھا، لیکن دوسری طرف اس کام کی ضرورت موجودہ حالات میں سب سے زیادہ محسوس ہوئی۔ چناں چہ پھراس کام کو اٹھالیا۔ اس کام کے لیے مولانا کے لٹریچر کو نئے سرے سے دیکھنا پڑا ہے، جو خود میرے لیے بہت مفید ثابت ہوا ہے اور دل ودماغ کی بہت سی اُلجھنیں اور کثافتیں صاف ہوگئی ہیں۔ یہ فائدہ ہے، جو میں نے خود اس کام سے اٹھایا ہے۔ دوسری طرف اس کام کے دوران میں گویا اتنی دور بیٹھ کر بھی مجھے مولانا کی صحبت میسر رہی ہے، جو ہمیشہ قلب وضمیر کی زندگی میں اضافہ کرنے والی اور ایمان کی حرارت کو بڑھانے والی ہوتی ہے۔ اس لیے میرے اس کام سے دوسرے لوگ کچھ فائدہ اٹھا سکیں یا نہ اُٹھا سکیں لیکن میں نے ضرور اس سے فائدہ اٹھایا ہے اور اس طرح اپنی محنت کی قیمت وصول کر لی ہے۔

اس کتاب میں میرا موضوع نہ تاریخ ہے نہ سوانح اور نہ محض شخصیت بلکہ مولانا مودودی کی شخصیت کے وہ بیرونی مظاہر، جو دعوت اور مشن پر مشتمل ہیں اور جو اقامتِ دین کی جدوجہد کے ذریعے ہم سب پر ظاہر ہوئے ہیں۔ جن کے سبب میرا اور ہزاروں بندگانِ خدا کا تعارف ان سے ہوا ہے اور جن کے سبب مجھے اور ہزاروں اور لاکھوں افراد کو ان سے گہری محبت اور بہت سے حضرات کو ان سے گہرا بغض وعناد ہے۔ اگر اس پہلو کے علاوہ کسی اور خاص دائرے میں بند ہو کر مجھے یہ کام کرنا پڑتا تو شاید میں کبھی ہمت نہ کرتا۔ میرا عمومی موضوع تو بس مولانا کی دعوت اور مشن ہی ہے۔ یہ آسان اور اہم ترین موضوع تھا، جو میں لے سکتا تھا۔ اسی کام نے مولانا کو ایک شخصیت بنایا ہے اور اب اتنی وزنی وسیع الاطراف اور وسیع الصفات شخصیت بنا دیا ہے کہ ان کی شخصیت پر ہاتھ ڈالنا کوئی آسان کام نہیں رہ گیا ہے نہ نگارش کے لیے اور نہ آزمائش کے لیے۔ میں نے تو اس وسیع شخصیت کے بیرونی مناظر کا صرف ایک پنسل اسکیچ ہی پیش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ بس ایک اندازہ ہو جائے کہ وہ شخصیت کس نوعیت کی ہے اور اس جہان فانی میں کیا کام کر رہی ہے، جو اِسے حیاتِ جاوداں عطا کرنے والا ہے۔

مولانا مودودی کی پوری شخصیت پر لکھنا میرے لیے تو ایک نہایت مشکل بلکہ ناممکن سا کام ہے، میں اس کا پوری طرح احاطہ نہیں کرسکتا۔ مولانا مودودی سیاست داں ہیں مدبر ہیں۔ اجتہادی صلاحیتیں رکھنے والے عالم دین ہیں۔ مفسر قرآن ہیں، مقرر ہیں، اعلیٰ پائے کے ادیب ہیں۔ بہترین قائد ہیں منتظم ہیں۔ ایک عالمگیر نظریے کے علم بردار ہیں۔ ماہر معاشیات ہیں۔ معاشرتی مصلح ہیں۔ پرعزیمت مجاہد ہیں۔ ایک شفیق اور غم گسار رفیق اور ساتھی ہیں۔ قانون داں

ہیں۔ ماہر تعلیمات ہیں۔ یہ محض گنتی پوری کرنے کے لیے نہیں بلکہ ان سب شعبوں میں انھوں نے اعلیٰ درجے کا علمی، تحقیقی اور عملی کام کیا ہے اور وہ کیا ہوا کام ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کے سامنے موجود ہے۔ سیاست دوراندیشی اور فراست کا عالم یہ ہے کہ دین حق کی اقامت میں کافر حکومت اور نسلی مسلمانوں کی قومی حکومت کا تذکرہ کرتے ہوئے ۱۹۳۸ میں وہ لکھتے ہیں:

''وہ قومی حکومت، جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوا ہے، اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس سے بھی زیادہ جری اور بے باک ہوگی، جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے وہ مسلم قومی حکومت ان پر سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دے گی۔ اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمۃ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔'' (سیاسی کش مکش، حصہ سوم)

اس بات کے پورے پندرہ سال بعد ایک مسلم قومی حکومت نے، جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوا تھا، اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے کے لیے خود مولانا مودودی کو انتہائی ڈھٹائی جرأت اور بیباکی سے سزائے موت سنائی۔ تین دن رات پھانسی کی کوٹھری میں بند رکھا اور پھر عوام کے شدید احتجاج اور داخلی اور خارجی دباؤ پر اس جرم بے گناہی کی سزائے موت کو عمر قید سے بدل دیا گیا۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے تو کیا یہ اس نور فراست کا بہترین نمونہ نہیں ہے۔

مولانا مودودی ایک مدبر ہیں۔ تقسیم ملک سے بہت پہلے مولانا مودودی نے جماعتِ اسلامی کے ایک اجلاس منعقدہ مدراس میں کہا:

''رفیقو اور دوستو! اس وقت ہم ہندستان کی تاریخ کے ایک بہت نازک اور فیصلہ کن مرحلے سے گزر رہے ہیں اور یہ مرحلہ، جس طرح ہندستان کی قسمت کے لیے فیصلہ کن ہے اسی طرح ہماری اس تحریک کے لیے بھی فیصلہ کن ہے۔ جس تغیر کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ عنقریب ملک تقسیم ہو جائے گا۔ ہندوؤں کو ان کی اکثریت کے علاقے اور مسلمانوں کو ان کی اکثریت کے علاقے الگ الگ مل جائیں گے۔ دونوں اپنے اپنے علاقوں میں پوری طرح خود مختار ہوں گے۔ اور اپنی مرضی کے مطابق

اپنے اسٹیٹ کا نظام چلائیں گے۔ ہمیں بھی اپنی تحریک کو دو مختلف طریقوں پر چلانا ہوگا۔ جہاں تک مسلم علاقے کا تعلق ہے اس پر میں یہاں بحث نہ کروں گا۔ کیوں کہ اس کے لیے موزوں مقام شمال مغربی حلقے کا اجتماع ہے، جو عنقریب ہونے والا ہے۔ آپ کے سامنے مجھے صرف ہندستان کے مستقبل پر گفتگو کرنی ہے کہ یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کو کن حالات سے سابقہ پیش آنے والا ہے اور ان حالات میں آپ کو کس طرح کام کرنا ہوگا۔''

اس کے بعد مولانا نے تفصیل سے ان اجتماعی حالات کا ذکر کیا ہے، جو آزادی کے بعد ہندستان میں آج تک مسلمانوں کے ساتھ خصوصی طور پر پیش آتے رہے اور آرہے ہیں اور جس رُخ پر ہندستان جارہا ہے اس کی نشان دہی آج سے ۱۵ سال پہلے صحیح صحیح کردی۔ پھر وہاں کی تحریک اسلامی کے سامنے، جو کام کا نقشہ رکھا وہ یہ تھا:

☆ قومی کش مکش کا خاتمہ کیا جائے، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برپا ہے تا آں کہ مسلمانوں کا دعوتی وجود متشخص ہوجائے۔

☆ مسلمانوں میں وسیع پیانے پر اسلام کا علم پھیلائیں اور ان میں دعوت و تبلیغ کا عام جذبہ پیدا کریں۔ اور ان کی اخلاقی اور تمدنی اور معاشرتی زندگی کی اس حد تک اصلاح کریں کہ ان کے ہمسایہ غیر مسلموں کو خود اپنی سوسائٹی کی بہ نسبت ان کی سوسائٹی صریحاً بہتر محسوس ہونے لگے۔

☆ ملک کی ذہنی طاقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ اپنی دعوت کے لیے فراہم کریں۔

☆ ہندستان کی مختلف زبانوں کو سیکھا جائے۔ ان میں تقریر و تحریر کی صلاحیت پیدا کی جائے اور ان میں جلدی سے جلدی اسلامی لٹریچر کا ضروری حصہ منتقل کیا جائے۔

مولانا مودودی کی ایک تقریر

یہ شریعت بزدلوں اور نامردوں کے لیے نہیں اُتری ہے۔ نفس کے بندوں اور دنیا کے غلاموں کے لیے نہیں اُتری ہے۔ ہوا کے رُخ پر اُڑنے والے خس و خاشاک اور پانی کے بہاؤ پر بہنے والے حشرات الارض اور ہر رنگ میں رنگ جانے والے بے رنگوں کے لیے نہیں اتری ہے۔ یہ ان بہادر شیروں کے لیے اتری ہے، جو ہوا کا رُخ بدل دینے کا عزم رکھتے ہوں۔ جو دریا کی

روانی سے لڑنے اور اس کے بہاؤ کو پھیر دینے کی ہمت رکھتے ہوں۔ صبغۃ اللہ کو دنیا کے ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہوں اور اسی رنگ میں تمام دنیا کو رنگ دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں، مسلمان جس کا نام ہے وہ دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی آفرینش کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے دریا کو اس راستے پر رواں کردے، جو اس کے ایمان واعتقاد میں راہِ راست ہے۔ صراطِ مستقیم ہے۔ اگر دریا نے اپنا رُخ اس راستے سے پھیر دیا ہے تو اسلام کے دعوی میں وہ شخص جھوٹا ہے، جو اس بدلے ہوئے رُخ پر بہنے کے لیے راضی ہو جائے۔ حقیقت میں جو سچا مسلمان ہے وہ تو اس غلط رو دریا کی رفتار سے لڑے گا اس کا رُخ پھیرنے کی کوشش میں اپنی پوری قوت صرف کردے گا۔ کامیابی اور ناکامی کی اس کو قطعاً پرواہ نہیں ہوگی۔ وہ ہر اُس نقصان کو گوارا کرے گا، جو اس لڑائی میں پہنچے یا پہنچ سکتا ہو۔ حتی کہ اگر دریا کی روانی سے لڑتے لڑتے اس کے بازو ٹوٹ جائیں اور پانی کی موجیں اس کو نیم جان کر کے کسی کنارے پر پھینک دیں تب بھی اس کی روح ہرگز شکست نہ کھائے گی۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس کے دل میں اپنی اس ظاہری نامرادی پر افسوس یا دریا کی رَو پر بہنے والے کافروں یا منافقوں کی کامرانیوں پر رشک کا جذبہ راہ نہ پائے گا۔“

اور مولانا مودودی کے نزدیک یہ باتیں صرف زورِ خطابت میں کہنے اور ابھارنے کے لیے ہی نہیں ہیں بلکہ خود عمل کرنے کے لیے ہیں۔ چناں چہ گزشتہ ربع صدی سے وہ دریائے جاہلیت کے خلاف، جس پامردی سے لڑ رہے ہیں اور اس کا رُخ پھیرنے کے لیے وسیع تدابیر عمل میں لا رہے ہیں، ان سے کوئی شخص بھی اب ناواقف نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی اس عملی جدوجہد میں کھپائی ہے۔ سیاہ بال سفید کیے ہیں لیکن ان کی ہمت وجرأت کا یہ حال ہے کہ سخت مایوس کن حالات میں بھی اگر ان کی صحبت میں آدمی جا کر تھوڑی دیر بیٹھ آئے تو ہمت و جرأت اور قوت وعمل کا ایک وسیع ذخیرہ اور ولولہ اپنے سینے میں لے کر آتا ہے۔ مایوسی، نامرادی دل شکستگی اور افسردگی کا ان کے قریب کہیں گزر نہیں ہے۔ وہ اپنا سفینہ دربارِ حبیبؐ کی طرف کھیتے چلے جا رہے ہیں اور اس سے قطعی بے نیاز ہیں کہ مخالف لہروں کے تھپیڑے کتنے شدید اور طوفان کے جھکڑ کتنے جان لیوا ہیں۔ جب تک دینے والے مالک نے اپنی آخری امانت جان واپس نہیں لے لی ہے۔ مومن کو مالک کے بتائے ہوئے راستے پر آگے ہی آگے بڑھتے چلے جانا ہے۔

ایک مصلح کی حیثیت سے وہ اصلاح قوم میں ساری قوتیں لگانا ضروری سمجھتے ہیں اس سلسلے

میں وہ اپنی قوم کے علماء ومشائخ کو خصوصی طور پر توجہ دلاتے ہیں اور خدا کی پکڑ سے ڈراتے ہیں۔

''ـــــ ظالم جفا کار اور عیش پسند امرا اور ایسے امرا کی خوشامدیں کرنے والے علما ومشائخ کا تو خیر کہنا ہی کیا ان کا جو حشر خدا کے ہاں ہوگا اس کے ذکر کی حاجت ہی نہیں لیکن جو امرا اور علما و مشائخ اپنے محلوں اور اپنے گھروں اور اپنی خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے زہد وتقویٰ اور عبادت و ریاضت کی داد دے رہے ہیں۔ وہ بھی خدا کے ہاں جواب دہی سے بچ نہیں سکتے کیوں جب ان کی قوم پر ہر طرف سے گم راہی اور بداخلاقی کے طوفان اُمڈے چلے آ رہے ہوں تو ان کا یہ کام نہیں ہے کہ گوشوں میں سر جھکائے بیٹھے رہیں بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ مردِ میدان بن کر نکلیں اور جو کچھ زور اور اثر اللہ نے ان کو عطا کیا ہے اس کو کام میں لاکر اس طوفان کا مقابلہ کریں۔ طوفان کو دور کرنے کی ذمے داری بلاشبہ ان پر نہیں مگر اس کے مقابلے میں اپنی پوری امکانی قوت صرف کر دینے کی ذمے داری تو یقیناً ان پر ہے اگر وہ اس میں دریغ کریں گے تو ان کی عبادت وریاضت اور شخصی پرہیز گاری ان کو یوم الفصل کی جواب دہی سے بری نہ کر دے گی۔ آپ محکمۂ صفائی کے اس افسر کو کبھی بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے، جس کا حال یہ ہو کہ شہر میں وبا پھیل رہی ہو اور ہزاروں آدمی ہلاک ہو رہے ہوں۔ مگر وہ اپنے گھر میں بیٹھا خود اپنی اور اپنے بال بچوں کی جان بچانے کی تدابیر کر رہا ہو۔ عام شہری اگر ایسا کریں تو چنداں قابل اعتراض نہیں لیکن محکمہ صفائی کا افسر ایسا کرے تو اس کے مجرم ہونے میں شک نہیں کیا جا سکتا۔''

وہ ملحدانہ اشتراکی ڈکٹیٹر شپ کے سخت ناقد ہیں۔ اور اسے انسانیت کے لیے سخت خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ وہ روس میں اشتراکی تجربے اور انسانیت پر جبر وظلم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ـــــ جب کوئی کارکن اپنے گھر پر نہیں پہنچتا تو اس کی بیوی خود ہی سمجھ جاتی ہے کہ پکڑا گیا۔ دوسرے دن وہ اس کی ضرورت کی چیزیں آپ ہی آپ پولیس کے دفتر میں پہنچانی شروع کر دیتی ہے اور ان کا قبول کر لیا جانا

یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کا قیاس صحیح تھا۔ وہ کوئی سوال کرے تو دفتر کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ یہ ہے وہ قیمت جو دو وقت کی روٹی اور برے وقت کی دست گیری کے لیے اشتراکی روس کے باشندوں کو ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ بلاشبہ ایک فاقہ کش آدمی بسا اوقات بھوک کی شدت سے اتنا مغلوب ہو جاتا ہے کہ وہ جیل کی زندگی کو اپنی مصیبت بھری آزادی پر ترجیح دینے لگتا ہے لیکن کیا انسانیت کے لیے دو وقت کی روٹی ملنے کی اب یہی ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ ساری روئے زمین ایک جیل خانہ ہو اور چند کامریڈز اس کے جیلر اور وارڈر ہوں۔"

مولانا مودودیؒ ایک مجاہد فی سبیل اللہ ہیں۔ ایک ایسے مجاہد، جن کی ساری عمر کفر و ضلالت و جاہلیت کی تاریکیوں اور طاغوت کے ظلم و تشدد اور قہر بانی کے خلاف جہاد کرتے گزر گئی ہے۔ نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے وہ، جس نوعیت کے مجاہدین کا گروہ کھڑا کرنا چاہتے ہیں اس کا معیار یہ ہے۔

"____ جو گروہ بغیر کسی معاوضے کی خواہش، بغیر کسی دھن دولت کے لالچ، بغیر کسی ذاتی نفع کی تمنا کے محض خدا کی خاطر دنیا کو فتنہ سے پاک کرنے کے لیے اور اس ظلم کو دور کر کے اس کی جگہ عدل قائم کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے اور اس نیک کام میں اپنی جان و مال، اپنی تجارت کے فوائد، اپنے بال بچوں اور باپ بھائیوں کی محبت اور اپنے گھربار کے عیش و آرام سب کو قربان کر دے۔ اس سے زیادہ اللہ کی محبت اور اللہ کی رضامندی کا مستحق کون ہو سکتا ہے اور لیلائے کامرانی کی آغوش اس کے سوا اور کس کے لیے کھل سکتی ہے۔ جہادِ فی سبیل اللہ کی یہی فضیلت ہے، جس کی بنا پر اسے تمام انسانی اعمال میں ایمان باللہ کے بعد سب سے بڑا درجہ دیا گیا ہے۔"

اس معیار پر اور کوئی پورا اُترے یا نہ اُترے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے اپنی ساری زندگی کی گواہی اس معیار پر پیش کر دی ہے۔

مولانا مودودیؒ کی ایک بڑی خصوصیت ان کا انتہائی شریفانہ کردار ہے۔ وہ نمونے کے

شریف انسان ہیں۔ ان کا اپنے مخالفوں کے ساتھ طرزِ عمل بھی اتنا شریفانہ رہا ہے کہ اس بات کے خود ان کے مخالف بھی معترف ہیں۔ انھوں نے اپنی طویل پبلک لائف میں گالیاں کھائی تو بہت ہیں لیکن دی کسی کو نہیں، الزامات ان پر لگائے تو بہت گئے ہیں لیکن انھوں نے کسی پر کبھی کوئی جوابی الزام نہیں لگایا۔ ان کو بے شمار دکھ دیے گئے ہیں۔ لیکن انھوں نے کبھی اپنے قول و فعل سے کسی کو دکھ نہیں دیا۔ گالیوں کے مقابلے میں صبر و تحمل۔ زیادتیوں کے مقابلے میں حلم اور غنڈہ گردی کے مقابلے میں شرافت و عالی ظرفی یہ مولانا مودودی کا طرہ امتیاز ہے، جس سے ان کے شریف النفس مخالفین متاثر ہوتے اور کمینہ فطرت مخالفین شہ پاتے ہیں۔ وہ ہر شخص کے ساتھ انتہائی شریفانہ طرزِ عمل اپنی آخری حد تک نبھاتے ہیں اور اگر کوئی شخص کسی حد کو پھاندے بغیر نہ چھوڑے، تو خاموشی سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ الزامی طرزِ عمل جوش بلا ہوش کا طریقہ کار۔ اشتعالی انداز اور خدا نا ترسانہ رنگ ڈھنگ کی ان کے ہاں کھپت نہیں ہے وہ کسی سے اختلاف بھی کرتے ہیں تو انتہائی شرافت۔ سلیقہ اور مہذب طریقے سے، عقلی استدلال اور معقول دلائل سے اور دوسرے کے حق و اظہا، بیان اور اختلاف کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اس دور کے سیاسی اور علمی میدان میں ان سے زیادہ شریف النفس انسان دور دور تک کہیں نہیں پایا جاتا۔

ان کے مزاج کی ایک اور خصوصیت حق کا بے باکانہ اظہار ہے۔ اظہارِ حق میں وہ کسی مداہنت، کسی مصلحت، کسی خوف، ڈر، لالچ یا دھن دھونس اور دھمکی کی پرواہ نہیں کرتے۔ حق اگر ان کے کسی عزیز ترین دوست کے خلاف پڑتا ہو تو وہ اس کا اظہار کیے بغیر نہیں رہتے اور اگر سلطانِ جابر کے خلاف جاتا ہو تو وہ اس کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔

نیا عائلی قانون، جو چند اپوا کی خواتین اور مغرب پرست افراد پر مشتمل کمیشن کی دی ہوئی سفارشات پر مشتمل ہے۔ جب حکومت نے جبر و تشدد سے عوام کے احتجاج و اضطراب کے باوجود نافذ کرنا چاہا اور حکومت کی نازک مزاجی شدت اور ذکاوتِ حس کا یہ عالم ہوگا کہ اگر کسی نے پرائیویٹ گفتگو میں بھی اس پر مخالفانہ اظہار رائے کیا تو اسے بھی پولیس اور سی آئی ڈی کے ذریعے دھمکانے کی کوشش کی گئی۔ تمام فرقوں کے علما نے ایک مشترکہ بیان اس پر تنقید کرتے ہوئے دیا تو سرکاری افسران اطلاعات کی معرفت اخبارات کو ہدایت کی گئی کہ کوئی اس بیان کو شائع نہ کرے۔ اس بیان کو ہینڈ بل یا پمفلٹ کی صورت میں چھپنے سے روکنے کے لیے پریسوں کو سخت ہدایات دی گئیں، جس کے سبب کوئی پریس اسے کاروباری نقصان کے خطرے سے چھاپنے کی ہمت نہ

کر سکا۔ کسی خطیب نے اگر اس پر کچھ خطبہ جمعہ میں کہہ دیا تو اسے بلا کر تنبیہ کی گئی کہ آئندہ وہ اس قرآن حکیم کو بیان کرنے کی جرأت نہ کرے۔ ایک صاحب نے لاہور میں وہ بیان پمفلٹ کی صورت میں چھاپا تو اسے ایک سال کی سزا بلا دلیل و اپیل سنا کر جیل پہنچا دیا گیا۔ نفاذ کی تاریخ پر اس کے امکانی مخالفین کو پولیس کے گرگوں نے جا بجا یہ بات پہنچانے کی کوشش کی کہ اگر انھوں نے اس پر اظہار اختلاف کیا تو ان کے وارنٹ گرفتاری تیار رکھے ہیں ـــ ایسے حالات میں مولانا مودودیؒ نے اس فرمان پر بار بار تبصرہ کیا اور اس کی مطلق پرواہ نہ کی کہ شاہی پیشانی پر کتنے بل پڑ جائیں گے۔ انھوں نے خدا کے ایک فرمان کی خلاف ورزی ہوتے دیکھ کر ہر قسم کے فرمان کو بالائے طاق رکھ کر اظہارِ حق کر دیا اور کہہ دیا:

> ”ـــ اس عائلی قانون سے اختلاف کا اظہار ہرگز کوئی سیاسی کام نہیں ہے بلکہ یہ سراسر ایک مذہبی کام ہے۔ ہم اسے قرآن کے صریح احکام کے خلاف پاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اگر قرآن بھی ہمارا مذہب نہ ہو تو پھر کسی معاملے کو بھی ہمارا مذہبی معاملہ نہیں کہا جا سکتا۔ میں یہ اعلان کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ یہ قانون قرآن اور سنت کے خلاف ہے اور ہم کو جب بھی موقعے ملے گا ہم اسے بدلوا کر رہیں گے۔“

انھوں نے حق کے اظہار میں عمر بھر میں کبھی ایک بار بھی مداہنت کو قریب نہیں آنے دیا۔ سزائے موت کے مقدمے میں ان کا وکیل مولانا کے ایک بیان کا خاص مفہوم عدالت میں پیش کرتا تھا۔ جس کے سبب وہ قانونی راستہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مولانا نے اس سے اختلاف کر کے صاف صاف خود کہہ دیا کہ میرا مدعا وہی ہے، جو لیا جا رہا ہے۔ میں اس میں ایک لفظ کا ردّ و بدل بھی نہیں کرنا چاہتا۔

ان کی ایک اور خصوصیت ان کے مزاج کی جمہوری افتاد ہے وہ اعلیٰ درجے کے جمہوری ذہن کے آدمی ہیں۔ اپنی بات زبردستی کبھی کسی پر نہیں ٹھونستے۔ استدلال سے قائل کرتے اور عقل و دلائل سے اپنی بات کا وزن ثابت کرتے ہیں اور جب تک مخاطب مطمئن نہ ہو جائے وہ اپنی بات کو سمجھانے کے لیے معقول استدلال کرتے رہتے ہیں اور اگر مخاطب کی بات میں وزن پاتے ہیں تو اسے فوراً قبول کر لیتے ہیں، جس طرح وہ جماعت کے اندر ہمیشہ جمہوری روح کو بیدار رکھتے اور جمہوری شعور کو بڑھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح وہ ملکی معاملات میں بھی

جمہوریت کے قائل ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر بات عوام کی مرضی سے طے ہو اِن پر کوئی بات ٹھونسی نہ جائے۔

ان کے مزاج کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مخاطب کو رعب داب سے یا زبردستی کوئی بات منوانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہر معاملے میں ان کی اپروچ انتہائی عقلی (Rational) ہوتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے انھیں جن مخالفین سے واسطہ پڑا ہے۔ ان میں سے چاہے وہ قدیم طبقے سے تعلق رکھتے ہوں یا جدید سے وہ اپنے مسائل میں نہ دلیل کے قائل ہیں نہ معقولیت کے اور نہ رائے عامہ کے احترام کے۔ قدیم طبقے کو تو خیر چھوڑیے۔ وہ آزاد خیالی کے مدعی بھی نہیں ہیں۔ لیکن جدید طبقہ میں جو لوگ اپنی عقلیت پرستی (Rationalism) اور آزاد خیالی (Libralism) کا ڈھنڈورا پیٹتے پیٹتے نہیں تھکتے وہ بھی مولانا مودودی کے معاملے میں انتہائی غیر معقول (Irrational) اور تنگ ظرف (Narrow minded) ثابت ہوئے ہیں۔ گزشتہ تیرہ سال سیاسی جدوجہد میں مغرب پرست طبقہ، جسے جمہور کا اعتماد یقیناً حاصل نہیں ہے اور جس کا علم خود اسے بھی ہے، جو سوئے اتفاق سے انگریز کے قرب کے سبب اس کی وراثت پا گیا ہے۔ مولانا مودودی کے بارے میں جتنے تنگ ظرفانہ نامعقول اور جارحانہ طرزِ عمل کا اظہار کر چکا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس نے ایک بار بھی یہاں رائے عامہ معلوم کرنے کے لیے عام انتخابات نہیں ہونے دیے اور مولانا مودودی کو عوام کے اسلامی جذبات کا ترجمان جاننے کے باوجود ان کے ساتھ، جس جس قدر مظالم اور زیادتیاں کیں۔ جھوٹے الزامات لگائے۔ جیلوں میں جھونکا اور جبر کی قوتوں کو بے دریغ استعمال کیا اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اس طبقے نے جیسا وقت دیکھا اسی کے مطابق عوام کی خواہشات کے علی الرغم کرسیوں کی چھینا جھپٹی میں ہاتھ رنگے اور ہاتھ مارے۔ وزارتیں توڑیں۔ اسمبلیاں برخاست کیں۔ دستور منسوخ کیے۔ مارشل لا لگائے غرض ملک کے اندر نظم وضبط اور امن وامان کو برباد کرنے کی کوئی تدبیر بھی بچا نہ رکھی اور اپنے ہر ظلم وزیادتی کا الزام عوام اور اسلامی عناصر پر رکھا۔ برسوں کے بعد دستور بنایا۔ پھر خود ہی اس کی خلاف ورزی کی اور پھر خود ہی اسے توڑ دیا۔ اور پھر یہ کہہ دیا کہ وہ ناقابل عمل تھا۔ جمہوریت کو بار بار سیفٹی قوانین ظلم و جبر، زیادتیوں، محلاتی سازشوں اور انتخابی دھاندلیوں سے خراب کیا۔ پھر خود ہی اسے اٹھا کر پھینک دیا اور کہہ دیا کہ عوام میں جمہوریت کا شعور ہی نہیں۔ غرض اس سب کچھ کے مقابلے میں مولانا مودودی انتہائی صبر وضبط سے ہمیشہ جمہوری اصولوں کی شدت سے پابند رہے اور قوانین ملکی

کا احترام کرتے چلے جاتے ہیں اور شاید مولانا کی یہی وہ کمزوری ہے، جسے اربابِ اقتدار نے اپنے حق میں مفید پا کر ہر قسم کی دھاندلی کو روا رکھا ہوا ہے۔

مولانا مودودی کا علم ہمارے ملک میں روشنی کا مینار ہے وہ وقت کے جدید ترین تقاضوں کو سمجھتے ہیں اور ان کی ضروریات کو احسن طریق سے پورا کر سکتے ہیں۔ وہ مذہب کے اصولوں کو جدید حالات میں زندگی کے عملی مسائل پر منطبق کرنے کی بہترین صلاحیت اور خداداد استعداد رکھتے ہیں اور اپنی تصانیف میں بیشتر جدید مسائل کا اسلامی حل پیش کر چکے ہیں۔ پھر بھی جو لوگ بار بار زور زور سے کہتے رہتے ہیں کہ اسلام کو آج تک کسی نے جدید تقاضوں کی روشنی میں پیش نہیں کیا اور جب تک اس میں جدید تقاضوں کی گنجائش پیدا نہ کی جائے گی، مذہب اسلام چل نہیں سکتا۔ وہ دراصل اپنی کم علمی اور ناواقفیت کا اظہار کرتے رہتے ہیں یا پھر وہ حقیقتاً مغربی تہذیب پر اسلام کا لیبل لگا کر ہی اسے قبول کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے مولانا مودودی کے پاس ایک پرعزیمت اظہارِ حق اور اس پر استقامت کے سوا اور کوئی جواب نہیں ہے۔

مولانا مودودی کی شخصیت ایک نہایت وسیع الاطراف شخصیت ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ اسے کسی ایک مجموعے میں سمیٹ سکے تو یہ بہت مشکل ہے۔ اس کے لیے بڑے علم، بڑے مطالعے اور بڑے زوردار قلم کی ضرورت ہے۔ شاید اسے ان صفات میں مولانا مودودی کے لگ بھگ ہی ہونا چاہیے اس لیے میرے لیے یہ سعی لاحاصل ہے۔ البتہ اس کی ضرورت بڑی شدید ہے کہ مولانا کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو کتابچوں کی صورت میں مختلف لکھنے والے مرتب کریں تاکہ اس قوس قزح کے سارے رنگ علیحدہ علیحدہ دیکھے جا سکیں۔ امید ہے کہ مولانا مودودی سے زیادہ قربت رکھنے اور قریبی مطالعہ کرنے والے اہل قلم اس طرف ضرور توجہ کریں گے۔ یہ بھی وقت کا اہم تقاضہ ہے۔ یہ شخصیتیں انسانوں کو متاثر (Inspire) کرتی ہیں اور اعلیٰ کردار کا جادو وہ ہے، جو ہمیشہ سر پر چڑھ کر بولتا ہے اور جس کے وزن کو ہر معاشرے نے ہمیشہ تسلیم کیا ہے۔ یہ وہ جادو ہے، جو اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتا۔

میں نے اس کتاب میں مولانا مودودیؒ کی سوانح نہیں لکھی ہے۔ آپ کو اس کتاب میں مولانا کے خاندان کے شجرۂ نسب یا دیگر ابتدائی حالات کہیں نظر نہ آئیں گے۔ میں نے اس میں مولانا کی شخصیت بھی پیش نہیں کی ہے۔ آپ کو کہیں اس میں مولانا کے داخلی مشاغل، ان کا ذوق و

افتادِطبع، فارغ اوقات کی مصروفیات، بیوی بچوں کے درمیان کی زندگی اور ایسی ہی بیسیوں شخصی اور ذاتی خصوصیات کی کہیں نشان نہ ملے گا، مجھے دراصل اس مرحلے میں ان کی زندگی کے ان پہلوؤں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرے نزدیک یہ سب ثانوی چیزیں ہیں، جن پر مجھ سے بہت بہتر طور پر لکھنے والے دوسرے بہت سے حضرات موجود ہیں، مجھے تو ان کی دعوتی زندگی اور اس کی مختلف جھلکیوں اور حیثیتوں سے بحث ہے۔ وہ ایک بامقصد آدمی ہیں تو ان کا مقصدِ زندگی کیا ہے وہ کس لیلائے مقصد کے عاشق ہیں۔ اس عشق میں ان کا درجہ کتنا بلند ہے۔ اس کے لیے انھوں نے کیا کیا وادیاں، کیسی کیسی گھاٹیاں اور کیسے کیسے دشوار گزار راستے طے کیے ہیں۔ اس عاشق کے لیے کیسے کیسے دار ورسن کے جھولے نصب کیے گئے ہیں، جن میں جھول جانے کے لیے ان کے قدموں میں ذرّہ بھر بھی لغزش نہیں پائی گئی۔ اس راہِ عشق میں ان کا مقام کتنا بلند ہے۔ ان کے اس عشق کے چرچے کہاں کہاں تک پہنچے ہیں۔ اپنی اس آرزو کو لیے لیے کہاں کہاں سے وہ گزرے ہیں۔ اپنی نظر میں وہ کیا ہیں دوسروں نے انھیں کیا پایا ہے۔ حق کے عشق کی راہ سلوک میں کہاں کہاں تک ان کا قدم پہنچا ہے، جنھوں نے ان کو آزمایا ہے انھوں نے انھیں کیسا پایا ہے۔ ان کے علم وادب کا چمن کتنا سرسبز ہے اور اس میں کیسے کیسے تر و تازہ اثمار ہیں، جو انسان کے قلب کو منور اور روح کو سرشار کرتے ہیں۔

بس اس کتاب میں میرا یہی موضوع رہا ہے۔ شاید اس موضوع کے علاوہ مولانا کے بارے میں مجھ میں کسی دوسرے موضوع پر قلم اٹھانے کی ہمت بھی نہ تھی۔ یہ وادی بھی مجھے ایسی دشوار گزار محسوس ہوئی ہے کہ بڑی مشکلوں سے قدم قدم چل کر اسے عبور کیا ہے اور کسی کو کچھ ملے یا نہ ملے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قلمی اور ذہنی سفر میں میں نے بہت کچھ پایا ہے اور جو کچھ پایا ہے اس کا نہایت ادھورا حصہ خلقِ خدا کی تواضع کے لیے اس کے سامنے رکھ دیا ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اسعد گیلانی

سرگودھا

ایک قلمی خاکہ

کسی شخصیت کے تعارف میں اس کی تصویر بھی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ تصویر کی ضرورت کے لیے انسان کے دو جذبے اس کا تقاضا کرتے ہیں: پہلا جذبہ تو یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کا تعارف کرایا جارہا ہے، اس کی صورت دیکھنے کو خواہ مخواہ جی چاہنے لگتا ہے۔ اس کا چہرہ کیسا ہے، لباس کیسا ہے یا خدوخال کیسے ہیں یہ انسانی فطرت ہے اور اس تقاضے کو معدوم کرنا بڑا مشکل ہے۔ دوسرا جذبہ اس شخصیت کے چہرے مہرے، خدوخال، تراش خراش اور شناخت و پرداخت سے اس کی داخلی کیفیات اور شخصیت کے وزن کا اندازہ لگانے کا ہوتا ہے۔ انسان دوسرے کی شخصیت کو نظروں سے تولتا اور وزن مقرر کرتا ہے۔ اس کے بارے میں ازخود ایک رائے قائم کرتا اور حسن و قبح اور شخصیت کی اچھائی برائی کے بارے میں اپنے قول سے خود ایک فیصلہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مردم شناس لوگ دوسروں کے چہرے دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ یہ کیسا آدمی ہے۔

چوں کہ مولانا مودودیؒ تصویر کے قائل نہیں ہیں، اس لیے میں یہاں ان کا ایک قلمی خاکہ پیش کررہا ہوں:

چہرہ مہرہ

پہلی نظر میں مولانا مودودیؒ ایک شریف کم گو اور متین آدمی نظر آتے ہیں، جن کے چہرے پر ذہانت نمایاں طور پر چمکتی ہے۔ پرعزم دہانہ اور بامروت آنکھیں۔ قدیم بزرگوں کی سی شان، گول چہرہ، جو خاصی مشرع داڑھی کے باوجود گولائی لیے ہوئے ہے۔ پیشانی کشادہ، جس میں سفیدی اور سرخی کی جھلک ہے۔ ابرو گھنے اور خم دار رنگ گورا، جو سرخی لیے ہوئے ہے۔ اگر چہ

مسلسل محنت اور بیماری نے اسے بہت ہلکا کر دیا ہے۔ موٹے موٹے خدوخال۔ عینکیں بالعموم دو استعمال کرتے ہیں۔ ایک دور کے لیے دوسری لکھنے پڑھنے کے لیے، جو تقریر کرتے وقت بالعموم سامعین کی طرف دیکھنے اور تقریر کے نوٹس دیکھنے کے لیے بدلتے ہیں۔ ناک ذرا چھوٹی اور موٹی ہے۔ رخسار ہموار اور ہلکے ذرا نیچے کی طرف ڈھلکتے ہوئے۔ دہانہ فراخ اور کشادہ ہے۔ دانتوں اور مسوڑھوں پر پان کھانے کے نہایت خفیف سے اثرات نظر آتے ہیں۔

داڑھی مشرع۔ کم از کم ڈیڑھ مٹھی، جو چہرے پر موزوں معلوم ہوتی ہے۔ سلیقے سے ترشی ہوئی۔ بالکل سفید۔ گھنے اور بھرپور گنجان بال۔ سر بڑا اور گولائی لیے ہوئے ہے۔ بال سیدھے اور باریک اور اور سر پر پٹھے۔

ڈیل ڈول

جسم گٹھا ہوا جیسے ورزشی ہو۔ بھاری تو نہیں ہے، لیکن مائل بہ فربہی ہے، پیٹ کچھ کچھ خفیف سا نکلا ہوا۔ قد لمبا نہیں ہے، لیکن ٹھگنا بھی نہیں ہے، درمیانہ ہے۔ جسم دیکھنے سے وہ دنیوی نعمتوں سے بہرہ اندوز نظر آتے ہیں۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ دیکھنے میں پرعزم اور پختہ مزاج آدمی نظر آتے ہیں۔ کندھے کشادہ لیکن خفیف سے آگے کی طرف جھکے ہوئے۔ فروتنی کا سا انداز۔ ہاتھ پاؤں مضبوط۔ آواز میں جذبہ رفاقت ومروت۔ آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر بولنے کی عادت۔

لباس

گھر سے باہر۔ سر پر اونچی دیوار کی ٹوپی، کبھی سیاہ، کبھی سلیٹی۔ لمبے دامن کی حیدر آبادی فیشن کی شیروانی۔ تنگ مہری کا علی گڑھ پاجامہ۔ بلا تسمے جوتے جو بالعموم سیاہ پمپ ہوتے ہیں۔ تسمے والے جوتے نمازی کے لیے بار بار وضو میں جس طرح مخل ہوتے ہیں۔ غالباً اسی لیے انھیں ترک کر دیا ہے، گھر میں دلی طرز کا کھلے پائچوں کا سفید پاجامہ اور اس پر بالعموم گرمیوں میں سفید کھلی آستینوں کا ململ کا کرتا اور سردیوں میں سفید بلا کالر کی قمیص۔ اس پر سویٹر اکثر براؤن رنگ کا ہوتا ہے۔ لنگی پہنے ہوئے کبھی نہیں دیکھے گئے، غالباً اسے غیر ساتر سمجھ کر ترک کر دیا ہے۔ ویسے بھی دلی کے شرفا کی تہذیب میں لنگی کا استعمال کم ہی ہوتا ہے۔ لباس میں اسلامی وضع کے شدت سے قائل ہیں اور غیر قوموں کے ملبوسات کو استعمال کرنا ذہنی غلامی کی دلیل سمجھتے ہیں۔

چال ڈھال

کندھے خفیف سے آگے کی طرف جھکا کر سبک رفتاری سے چلتے ہیں، جس سے کبرو تکبر کی بجائے فروتنی اور حقیقی عجز بندگی نمایاں ہوتا ہے۔ خصوصاً جب نماز میں کھڑے ہوں تو یہ عجز اور فروتنی جسم پر لباس کی طرح پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ چلتے ہوئے مجمع میں اکڑ کر چلنے یا نمایاں ہونے کا مطلق انداز نہیں ہوتا۔ بلکہ بے تکلف احباب کے اندر جیسے کوئی سنجیدہ متین لیکن شگفتہ مزاج، بے تکلف بزرگ رفیق چلا جا رہا ہے۔

بات چیت ہمیشہ ٹھہر ٹھہر کر کرنے کے عادی ہیں۔ لہجہ نمایاں لیکن دھیما۔ تقریر کرتے ہوئے احساسِ ذمے داری سے چہرہ سامعین کی طرف پوری طرح متوجہ اور چہرے کے انداز اور خدوخال سنجیدگی اور متانت کا پورا پورا احساس لیے ہوئے۔ اتنی ٹھہر ٹھہر کر تقریر کرتے ہیں کہ تیز لکھنے والا پوری تقریر رواں خط میں لکھتا جائے چناں چہ میاں طفیل محمد صاحب، جو عرصۂ دراز سے مولانا کے رفیق خاص ہیں، عموماً مولانا کی تقاریر معمولی فروگزاشتوں کے ساتھ پوری ہو بہو نوٹ کر لیتے ہیں۔ لہجہ اور تلفظ اتنا صاف ہوتا ہے کہ سامعین میں سے ہر شخص اچھی طرح بات سمجھ لیتا ہے۔ پنجاب اور سرحد کے دیہاتی عوام، جو اردو زبان سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے، وہ بھی بات پوری طرح پا لیتے اور اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ تقریر کے دوران کبھی کبھی لہجے میں ہلکا سا جوش پیدا ہوتا ہے۔ جس کا سامعین پر کئی گنا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ پرجوش تقریروں کے قائل نہیں ہیں۔ جذبات ابھارنے اور بھڑکانے سے ہمیشہ اجتناب کیا ہے۔ دشمنوں کے طعن و تشنیع اور الزام و بہتان کا جواب بھی اگر کبھی دیا تو ٹھنڈے استدلال اور افہام و تفہیم سے دیا۔ فحش اور نفرت انگیز کلمات ان کی زبان سے کبھی نہیں سنے گئے۔

مجلسی بات چیت میں بھی لہجہ ہمیشہ متین، سنجیدہ اور باوقار ہوتا ہے۔ البتہ گفتگو میں کبھی کبھی نہایت شستہ مزاج کی پھلجڑی سی چھوٹ جاتی ہے، جس سے مخاطب محظوظ ہوتا ہے۔ لیکن کسی کی دل آزاری کبھی نہیں مقصود ہوتی۔ مزاح اور شگفتہ گوئی سے ان کی مجلس ہمیشہ شگفتہ رہتی ہے ایک غمگین آدمی بھی تھوڑی دیر کے لیے اپنا غم بھول جاتا ہے۔ دوسری چیز، جو آدمی کو ان کی مجلس میں حاصل ہوتی ہے وہ غمِ دنیا اور غمِ روزگار سے رہائی ہے۔ وقتی طور پر آدمی ہر قسم کے آلام و تفکرات سے بے نیاز ہو کر سکونِ قلب اور اطمینانِ ذہنی حاصل کر لیتا ہے۔ ہر قسم کے انسانی مسائل، جو چاہے علمی، تحقیقی اور فلسفیانہ نوعیت کے ہوں یا معاشرتی، اقتصادی سیاسی یا مجلسی۔ مولانا کے پاس

سوالات کے بہترین مدلل جوابات اور الجھاوؤں کے لیے بہترین مشورے موجود ہوتے ہیں۔

گفتگو صاف اور پاکیزہ دلّی کی ڈھلی ہوئی اردو میں کرتے ہیں۔ البتہ جدید طبقے کے ذہن کے مطابق تسہیل فہم کے لیے مناسبتِ مضمون سے کہیں کہیں انگریزی کے اصطلاحی الفاظ بھی آجاتے ہیں۔ گفتگو میں استدلال کا انداز وہی ہوتا ہے، جو اِن کے مضامین میں پایا جاتا ہے وہ کسی سوال یا مسئلے کا الزامی یا منفی جواب نہ دیں گے اور سائل کے ذہن کی مناسبت سے عملی استدلال اور مثال سے بات کو سمجھانے اور واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر بات ضرورت سے زیادہ طول پکڑ جائے اور سائل اپنی رائے یا خیال پر بضد یا مصر ہو تو اسے نہایت شستگی اور سلیقے سے مزید سوچنے اور رائے قائم کرنے کا مشورہ دے کر بات ختم کردیں گے۔ گفتگو کے دوران جابجا مسکراہٹ شاملِ کلام رہتی ہے۔ خشک اور تلخ چہرے یا لب ولہجہ کے ساتھ میں نے ان کو کبھی بات کرتے نہیں دیکھا۔ ان سب کچھ کے باوجود مولانا مودودیؒ ایک خاموش طبع آدمی ہیں۔ جب کوئی بات موضوعِ بحث نہ ہو تو وہ خواہ مخواہ بات نہ چھیڑے رکھیں گے۔ بلکہ خاموش بیٹھ جائیں گے۔ لیکن ایسی طویل خاموشی نہیں، جو مجلس کو بوجھل بنادے۔

تقریر کرتے ہوئے کسی وقت انگلی یا ہاتھ سے اشارے بھی کرتے ہیں، جس سے بات کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ ورنہ اسٹیج پر دورانِ تقریر بہت زیادہ نقل وحرکت کے قائل نہیں ہے۔ واعظین کے رائج الوقت اندازِ وعظ سے اِن کا اندازِ تقریر قطعی مختلف ہوتا ہے۔ وہ وعظ نہیں کرتے تقریر کرتے ہیں اور تقریر نہیں کرتے بلکہ مسلسل گفتگو کرتے ہیں، جس میں یقین، اعتماد، توکل، تفہیم، مخاطب سے ہمدردی اور استدلال کا رنگ گہرا ہوتا ہے۔ تقریر میں ادب کی چاشنی بڑی نمایاں ہوتی ہے اور بعض بعض جملے تو تاریخی یادگار بن جاتے ہیں۔ زبان پر قدرت حاصل ہے۔ جس بات کو پھیلا کر بیان کریں گے، اس کے تمام گوشے شرح وبسط سے سامنے آجائیں گے اور جسے اختصار سے بیان کریں گے، اس میں قادرالکلامی کا جوہر ایسا نمایاں ہوگا کہ موضوع کے تمام گوشے بھی آجائیں گے۔ اہم استدلال کا رنگ بھی نمایاں ہوگا اور بات بھی مختصر ہوگی۔ اس کے کئی نمونے موجود ہیں۔ ''الجہاد فی الاسلام'' جو ۶۰۷ سو صفحات پر پھیلی ہوئی کتاب ہے اور ''جہاد فی سبیل اللہ'' جو ۴۸ صفحات کا ایک پمفلٹ ہے یا ''اسلامی ریاست'' جو کئی سو صفحات کی کتاب ہے اور ''اسلام کا نظریۂ سیاسی'' جو ایک مختصر پمفلٹ ہے یا پھر ان کی ریڈیائی تقاریر جو ''اسلام کا نظامِ حیات'' کے نام سے چھپ چکی ہیں مختصر اور جامع تحریر کے بہترین نمونے ہیں۔ لیڈروں میں تصنع

اور بناوٹ کا کچھ نہ کچھ عنصر آ ہی جاتا ہے۔ یہ چیز مولانا کے ہاں قطعی نہیں پائی جاتی۔ جیسے بے تکلف وہ اپنی پرائیویٹ مجلس میں ہیں۔ ایسے ہی ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی میں جابجا پردے لٹکے ہوئے نظر نہیں آتے۔ حسنِ کلام اور سادہ بیانی ان کی خصوصیت ہے۔

تقریر

اس موضوع پر اگرچہ پہلے ضروری باتیں آ گئی ہیں۔ لیکن ایک خصوصی چیز مولانا کی ہر تقریر کے لیے مناسب تیاری ہے۔ تیاری کے بغیر مولانا حتی الامکان تقریر نہیں کرتے۔ ان کی تقریر کا موضوع متعین ہوتا ہے۔ اس پر مضمون سوچا سمجھا جاتا ہے، اس کے لیے کہی جانے والی باتوں کے مفصل اشارات نوٹ ہوتے ہیں۔ تقریر کو کہاں سے شروع ہونا اور کہاں ختم ہونا ہے۔ یہ سب باتیں پہلے سے طے ہوتی ہیں۔ بے ہنگم مسلسل بے انتہا اور لاطائل تقریر، جس میں مقرر الفاظ کے جھولے میں لطائف وظرائف اور قصہ کہانی بیان کرتا ہے اور دائیں سے بائیں ہاتھ مارتا رہتا ہے یہ چیز یہاں نہیں ہے، تقریر میں کوئی بات نہ ضرورت سے زائد بیان ہوتی ہے اور نہ کم۔ جب وہ بات کہہ دی، جو کہنی تھی تو پھر بات آگے نہ چلے گی۔ مولانا اوقات کے سختی سے پابند ہیں۔ مقررہ وقت پر شروع کریں گے اور متعین وقت پر تقریر ختم کردیں گے۔ دیر سے شروع کرنا اور پھر سامعین کو اضطراب میں رکھ کر مسلسل بولتے چلے جانا ان کے مزاج کے خلاف ہے۔

تقریر میں عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں لیکن ایک خاص معیار سنجیدگی سے نیچے نہیں اترتے۔ عوامی تقریروں میں بھی وہ عامیانہ زبان نہیں بول سکتے۔ لیکن ان کی بات کو ان کی قوم کا ہر شخص سمجھ لیتا ہے۔ موقعے کی نزاکت کے پیش نظر بعض اوقات مولانا اپنی ہمت اور استعداد سے بڑھ کر بھی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ تھکے ہوئے جسم خشک گلے اور مسلسل تکان کے باوجود جس چیز کو اتمامِ حجت کے طور پر پیش کرنا ہوتا ہے، اس کے لیے اپنے جسم کی ساری قوت صرف کردیتے ہیں۔ ان کی بعض خاص خاص مواقع کی تقاریر اس پر شاہد ہیں۔ مثلاً ان کی ایک تقریر، جو انھوں نے تقسیم سے قبل ''دارالسلام کے ایک اجتماع میں کی جب مولانا سخت بیمار تھے، پتھری کا آپریشن کروانے والے تھے اور وہ رفقاء کے سامنے ''ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان'' کی صحیح صحیح تشریح کرکے مومنین کی زندگی میں ان کا مقام متعین کردینا چاہتے تھے۔ اس تقریر میں ایک عجیب پرسوز

الوداعی رنگ ہے اور تربیتِ اخلاق کی بہترین تقاریر میں سے ہے، جو اَب ''تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔

احباب کا دل موہ لینے کی خوبی بھی مولانا کو خدا نے وافر عطا فرمائی ہے۔ ترش کلامی ان سے بالکل بعید ہے۔ اپنے حلقۂ جماعت میں بھی انھوں نے شدید سے شدید تنقیدیں ہمیشہ ٹھنڈے دل و دماغ اور کشادہ پیشانی سے سنیں اور مخاطب کو کبھی خاموش کرانے کی کوشش نہیں کی۔ جماعت کے اندر پالیسی اور لائحہ عمل کے موضوع پر، جو شدید اختلاف رائے ہوا تھا۔ اس میں دوسری رائے رکھنے والے بعض حضرات نے جس طرح ذاتی اور شخصی طور پر بھی دکھ دینے والی باتیں مولانا پر چھانٹیں، یہ ان کا ہی دل گردہ تھا کہ اس کی ہوا تک انھوں نے نہیں نکالی اور سب کچھ سہہ گئے اور اس کے باوجود کہ مخالف رائے رکھنے والے حضرات دو فیصد بھی نہ تھے لیکن ان کو مطمئن کرنے کے لیے مولانا نے ہر سوال اور اعتراض کا جواب دیا۔ چند افراد کے اطمینان کی خاطر پوری جماعت کو کئی دن ایک جگہ بٹھائے رکھا اور مجلس مذاکرہ سی قائم رکھی اور اس سارے دوران میں مولانا کا طرزِ عمل خالص عقلی، استدلالی اور جمہوری رہا۔

تقریر میں مولانا مثالیں دینے کا ایک خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ ہر مثال مفہوم اور حالات پر اس طرح منطبق ہو جاتی ہے کہ سننے والا نہ صرف قائل ہوتا ہے بلکہ لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔ مولانا کے استدلال میں مخاطب کے لیے ''یہ تو میرے دل میں تھا'' کا عموماً انداز ہوتا ہے اور مخاطب محسوس کرتا ہے کہ اس کے دل کی بات کہہ دی گئی ہے اور اگر وہ خود یہ بات کہتا تو شاید یوں ہی کہتا۔

عام حالات

مولانا اپنے ملنے جلنے والوں کو خاصا وقت دیتے ہیں۔ ملنے والوں کا ایک سلسلہ قائم رہتا ہے، جن میں ہر قسم کے ملاقاتی آتے ہیں۔ حکمراں طبقے کے سوا ہر طبقے کا آدمی مولانا سے ملنے آتا ہے۔ دیہاتی جو دور دور سے آتے ہیں، شہری، جدید، علما، فضلا، یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبا، جنھیں اپنے مختلف موضوعات پر مولانا سے سوالات کرنا اور مواد لینا ہوتا ہے۔ اخبار نویس اور دور و نزدیک کے احباب اور معتقدین، ریٹائرڈ سرکاری افسران، سیاسی لیڈر، غیر ملکی جو تحقیق حال کی خاطر آتے ہیں۔ ان سب کو مولانا ملاقات کا وقت دیتے ہیں۔ بعض اوقات ملاقاتی ان کے لکھنے پڑھنے اور آرام کرنے کا وقت بھی لے جاتے ہیں۔ دور سے آنے والوں کے لیے بعض اوقات اپنے آرام کے دوران بھی باہر نکل آتے ہیں۔ ویسے نمازِ عصر سے عشا تک بالعموم دفتر

ترجمان القرآن کے صحن میں کھلی مجلس ہوتی ہے، جس میں ہر قسم کے ملاقاتی متفرق نوعیت کے سوالات پوچھتے اور گفتگو کرتے رہتے ہیں اور مولانا سب کی باتوں کا جواب دیتے ہیں۔

احباب کی عیادت کے لیے جانا۔ ان کی چھوٹی چھوٹی دعوتوں میں شوق سے شریک ہونا اور ان کی مشکلات میں مفید مشورے اور مدد دینا مولانا کا روز مرّہ کا معمول ہے۔ آدمی سے اس کے مرتبے کے مطابق تواضع سے پیش آتے ہیں۔ بعض اوقات وہ ہم جیسے معمولی آدمیوں کا بھی اس فروتنی سے کھڑے ہوکر استقبال کرتے ہیں کہ آدمی ان کی بلند اخلاقی اور اپنی کم مائیگی پر نادم سا ہو جاتا ہے۔

گھر میں میں نے ان کو مکان کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے بھی دیکھا ہے۔ بجلی کا فیوز اُڑ گیا تو اسے درست کر رہے ہیں۔ گھڑی رُک گئی تو اسے کھول کر معمولی خرابی دور کر لی۔ کتابیں سلیقے سے رکھ لیں۔ کسی قسم کی بناوٹ یا تصنع ان کے اِردگرد دور دور تک نہیں ملتی۔ آج تک نہ انھوں نے اپنے لیے کوئی جائداد بنائی ہے اور نہ کوئی مکان تعمیر کیا ہے۔

کھانے پینے کا ذوق صاف ستھرا ہے۔ مذاق دہلوی ہے اور دہلوی طرز کے کھانے ہی وہ زیادہ پسند کرتے ہیں، لیکن ویسے جو مل جائے وہ کھا لیتے ہیں۔ نہاری پسند ہے البتہ بکری کے گردے پسند نہیں ہیں، جس کی وجہ غالباً گردوں کا مخزن پیشاب ہوتا ہے۔ پانی بہت ٹھنڈا استعمال کرتے ہیں اور فارسی کی مثل نانِ گرم اور آبِ خنک کے پوری طرح قائل ہیں۔ گرمیوں میں برف کا پانی کثرت سے استعمال کرتے ہیں، جو اتنا ٹھنڈا ہوتا ہے کہ ہمارے لیے تو اس کا استعمال ہی مشکل ہوتا ہے، مجلس میں یا کھانا کھاتے ہوئے عموماً آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہیں، جس کی وجہ غالباً جسم کا بھاری پن ہے۔ سفر میں عموماً سادہ لباس پہنتے ہیں۔ کھلا پاجامہ۔ قمیص ٹوپی اور کوئی سستا یا پرانا جوتا۔ عموماً سفر میں باٹا کا ربڑ کا سستا جوتا پہنے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ سفر میں اپنا بستر ضرور ہمراہ رکھتے ہیں۔ چاہے اس کے استعمال کی ضرورت پیش آئے یا نہ آئے۔ دوسرا لوٹا ہے، جو لازماً ہمراہ ہوتا ہے ایک بار مسکرا کر کہا کہ جواہر لال نہرو کے نزدیک ہماری تہذیب آخر اونچا پاجامہ اور لوٹے کے سوا کیا ہے۔ اس لیے انھیں کیسے ترک کیا جا سکتا ہے۔ سفر میں اگر دوسرے ساتھی بھی ہمراہ ہوں تو بالعموم اسی درجے میں سفر کرتے ہیں، جس میں دوسرے سفر کر رہے ہوں۔ زیادہ اونچے درجے میں کسی خصوصی تکلیف یا ضرورت کے سوا سفر کرتے نہیں دیکھے گئے۔

مولانا کی حاضر جوابی اور شگفتہ مزاجی ان کے ملنے جلنے والوں کے لیے بڑی نعمت ہے۔ وہ مجلس کو کبھی بوجھل بننے نہیں دیتے۔ ان کے بیسیوں لطائف، جو حقیقتاً 'تکلم لطیف' کے بہترین

نمونے ہیں۔ان کی مجلس میں بیٹھنے والوں کو یاد ہیں۔ ہر تھوڑے وقفے کے بعد مولانا کسی نہ کسی بات میں سے نہایت سادگی کے ساتھ مزاح کا کوئی ایسا پہلو پیدا کر لیتے ہیں، جو پوری مجلس کو شگفتہ کر جاتا ہے۔ مزاح دراصل مولانا کے ایک خاص اندازِ کلام کا ایک پہلو ہے، جو وہ بات اور الفاظ کے اندر سے پیدا کر لیتے ہیں۔اسے بلند قہقہہ بار لطیفوں یا ضلع جگت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔

مولانا کا خط نہایت پاکیزہ اور نفیس ذوق تحریر کا آئینہ دار ہے۔ چھوٹے چھوٹے خوب صورت حروف، ہمیشہ پورے حروف لکھتے ہیں۔ شوشے، کامے، نکتے، زیر، زبر اور تشدید کا خاص اہتمام رکھتے ہیں۔فن کتابت کے لحاظ سے بھی کبھی غلطیاں نہیں کرتے۔ حروف ایک سلیقے سے قطار اندر قطار چلے جاتے ہیں۔ سطریں سیدھی، پورے صفحے پر کہیں کاٹ چھانٹ نہیں ہوتی، جو ان کی راست فکری اور ذہنی یک سوئی پر دلالت کرتی ہے اور لکھا ہوا صفحہ بلا پڑھے خود بتا دیتا ہے کہ جس شخص نے لکھا ہے اس کا ذہن ہر قسم کے الجھاوؤں سے صاف اور استدلال کے اعتبار سے محکم ہے۔تحریر اتنی پختہ ہے کہ آج سے بیس برس پہلے کی لکھی ہوئی تحریر اور آج کی تحریر کے خط میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

مولانا کی نماز ایک خاص کیفیت کی حامل ہوتی ہے نماز میں کھڑے ہوئے بندگی کی پوری کیفیت ان کے بدن پر طاری ہوتی ہے، جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ خفیف سا جھکا ہوا سر، دبے ہوئے کندھے، سمٹا ہوا جسم، فروتنی کا ایک مجسم نمونہ۔قرأت کا لہجہ بڑا صاف سادہ اور مخصوص سوز و گداز کا حامل ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آدمی ان کے پیچھے نیت باندھتے ہی اچانک ذہنی اور قلبی یکسوئی محسوس کرتا ہے۔ دل و دماغ سے سارے اضطراب اور اندیشے اور تفکرات و خیالات دھل جاتے ہیں اور آدمی ہمہ تن اپنے مالک کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔اس چیز کو میں نے بارہا آزمایا ہے اور کبھی اس میں فرق نہیں آیا۔ مولانا کا قرأت کا لہجہ بھی خاص ہے الفاظ ٹھہر ٹھہر کر سادہ طریق سے ادا ہوتے ہیں۔ جن میں مروج قرأت کے پیچ و خم تو بالکل نہیں ہوتے۔البتہ ہر آیت کا آخری لفظ ذرا کھینچ کر پڑھتے ہیں اور ہلکا سا وقفہ کر کے آگے چلتے ہیں۔آواز بھی عجز و بندگی کا اظہار لیے ہوئے ہوتی ہے، جس کے سبب مقتدی کا ذہن آواز، الفاظ اور ان کے معانی پر جم جاتا ہے اور ہر طرف کی پریشان خیالی سے سمٹ آتا ہے۔

مولانا مودودی کا پیغام

مسلمانوں کے نام میرا یہ پیغام ہے کہ وہ ان ذمے داریوں کو سمجھیں اور ادا کریں، جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی ہیں۔ آپ صرف اتنا کہہ کر نہیں چھوٹ سکتے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم نے خدا کو اور اس کے دین کو مان لیا۔ بلکہ جب آپ نے خدا کو اپنا خدا اور اس کے دین کو اپنا دین مانا ہے تو اس کے ساتھ کچھ ذمے داریاں بھی عائد ہوتی ہیں، جن کا شعور آپ کو ہونا چاہیے اور جن کے ادا کرنے کی آپ کو فکر ہونی چاہیے۔ اگر آپ انھیں ادا نہ کریں گے تو اس کے وبال سے نہ دنیا میں چھوٹ سکیں گے اور نہ آخرت میں۔ وہ ذمے داریاں کیا ہیں؟ وہ صرف یہی نہیں ہیں کہ آپ خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور یومِ آخرت پر ایمان لائیں۔ وہ صرف اتنی بھی نہیں ہیں کہ آپ نماز پڑھیں روزہ رکھیں۔ حج کریں اور زکوٰۃ دیں۔ وہ صرف اتنی بھی نہیں ہیں کہ آپ نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ کے معاملات میں اسلام کے مقرر کیے ہوئے ضابطے پر عمل کریں۔ بلکہ ان سب کے علاوہ ایک بڑی اور بہت بھاری ذمے داری آپ پر یہ بھی عائد ہوتی ہے کہ آپ تمام دنیا کے سامنے اس حق کے گواہ بن کر کھڑے ہوں، جس پر آپ ایمان لائے ہیں۔ مسلمان کے نام سے آپ کو ایک مستقل امت بنانے کی واحد غرض، جو قرآن میں بیان کی گئی ہے۔ وہ یہی ہے کہ آپ بندگانِ خدا پر شہادت حق کی حجت پوری کر دیں۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ
وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (البقرۃ:۱۴۳)

”اور اس طرح بنایا ہم نے تم کو وسط شاہراہ پر قائم رہنے والی امت تا کہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دو اور رسولؐ تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے۔“

یہ آپ کی امت کا عین مقصد وجود ہے، جسے آپ نے پورا نہ کیا تو گویا اپنی زندگی ہی اکارت گنوادی۔ یہ آپ پر خدا کا عائد کیا ہوا فرض ہے کیوں کہ خدا کا حکم یہ ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، خدا کی خاطر اٹھنے والے اور ٹھیک ٹھیک راستی کی گواہی دینے والے بنو۔''

اور یہ نرا حکم ہی نہیں بلکہ تاکیدی حکم ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ

''اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا، جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس فرض کو انجام نہ دینے کا نتیجہ کیا ہے۔ آپ سے پہلے اس گواہی کے کٹہرے میں یہودی کھڑے کئے گئے تھے مگر انھوں نے کچھ تو حق کو چھپایا اور کچھ حق کے خلاف گواہی دی اور فی الجملہ حق کے نہیں بلکہ باطل کے گواہ بن کر رہ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے انھیں دھتکار دیا اور ان پر وہ پھٹکار پڑی کہ

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ

''ذلت (ورسوائی) اور محتاجی (وبے نوائی) ان سے چمٹا دی گئی اور وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گئے۔''

یہ شہادت، جس کی ذمے داری آپ پر ڈالی گئی ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ جو حق آپ کے پاس آیا ہے، جو صداقت آپ پر منکشف کی گئی ہے، انسان کے لیے فلاح ونجات کی، جو راہ آپ کو دکھائی گئی ہے۔ آپ دنیا کے سامنے اس کے حق وصداقت ہونے پر اور اس کے راہِ راست ہونے پر گواہی دیں ایسی گواہی، جو اس کے حق وصداقت ہونے کو مبرہن کر دے اور دنیا کے لوگوں پر دین کی حجت پوری کر دے۔ یہ شہادت دو ہی طرح کی ہوسکتی ہے۔ ایک قولی شہادت، دوسری عملی شہادت۔ قولی شہادت کی صورت یہ ہے کہ ہم زبان اور قلم سے دنیا پر اس حق کو واضح کر دیں، جو انبیا کے ذریعے ہمیں پہنچا ہے سمجھانے اور دل نشیں کرنے کے جتنے طریقے ممکن ہیں، ان سب کو استعمال کر کے، تبلیغ، دعوت اور نشر واشاعت کے جتنے ذرائع ممکن ہیں، ان سب سے کام لے کر علوم وفنون نے، جس قدر مواد فراہم کیا ہے وہ سب اپنے ہاتھ میں لے کر ہم دنیا کو اس دین کی تعلیم

سے روشناس کریں، جو خدا نے انسان کے لیے مقرر کیا ہے۔ فکر و اعتقاد میں، اخلاق و سیرت میں، تمدن و معاشرت میں، کسبِ معاش اور لین دین میں، قانون اور نظمِ عدالت میں، سیاست اور تدبیر مملکت میں اور بین الانسانی معاملات کے تمام دوسرے پہلوؤں میں، اس دین نے انسان کی رہنمائی کے لیے جو کچھ پیش کیا ہے، اسے ہم خوب کھول کر بیان کریں۔ دلائل اور شواہد سے اس کا حق ہونا ثابت کریں اور جو کچھ اس کے خلاف ہے، اس پر معقول تنقید کر کے بتائیں کہ اس میں کیا خرابی ہے۔ اس قولی شہادت کا حق ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُمت مجموعی طور پر ہدایت خلق کے لیے اس طرح فکر مند نہ ہو، جس طرح انبیاء علیہم السلام انفرادی طور پر اس کے لیے فکر مند رہا کرتے تھے۔ یہ حق ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ کام ہماری تمام اجتماعی کوششوں اور قومی سعی و جہد کا مرکزی نقطہ ہو۔ ہم اپنے دل و دماغ کی ساری قوتیں اور اپنے سارے وسائل و ذرائع اس پر لگا دیں۔ ہمارے تمام کاموں میں یہ مقصد لازماً ملحوظ رہے اور ہم اپنے درمیان سے کسی ایسی آواز کے اٹھنے کو تو کسی حال میں برداشت ہی نہ کریں، جو حق کے خلاف شہادت دینے والی ہو۔

رہی عملی شہادت تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں ان اصولوں کا عملاً مظاہرہ کریں، جن کو ہم حق کہتے ہیں۔ دنیا صرف ہماری زبان ہی سے ان کی صداقت کا ذکر نہ سنے بلکہ خود اپنی آنکھوں سے خود ہماری زندگی میں ان کی خوبیوں اور برکتوں کا مشاہدہ کر لے۔ وہ ہمارے برتاؤ میں اس شیرینی کا ذائقہ چکھ لے، جو ایمان کی حلاوت سے انسان کے اخلاقی معاملات میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ خود دیکھ لے کہ اس دین کی رہنمائی میں کیسے اچھے انسان بنتے ہیں، کیسی عادل سوسائٹی تیار ہوتی ہے، کیسی صالح معاشرت وجود میں آتی ہے، کس قدر ستھرا اور پاکیزہ تمدن پیدا ہوتا ہے، کیسے صحیح خطوط پر علوم و ادب اور فنون کا نشو و نما ہوتا ہے۔ کیسا منصفانہ، ہمدردانہ و بے نزاع معاشی تعاون رونما ہوتا ہے اور اجتماعی و انفرادی زندگی کا ہر پہلو کس طرح سدھر جاتا ہے، سنور جاتا ہے اور بھلائیوں سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ اس شہادت کا حق صرف اس طرح ادا ہو سکتا ہے کہ ہم فرداً فرداً بھی اور قومی حیثیت سے بھی اپنے دین کی حقانیت پر مجسم شہادت بن جائیں، ہمارے افراد کا کردار اس کی شہادت کا ثبوت دے، ہمارے گھر اس کی خوشبو سے مہکیں اور ہماری دوکانیں اور ہمارے کارخانے اس کی روشنی سے جگمگائیں۔ ہمارے ادارے اور ہمارے مدرسے اس کے نور سے منور ہوں ہمارا لٹریچر اور ہماری صحافت اس کی خوبیوں کی سند پیش کرے۔ ہماری قومی پالیسی اور اجتماعی سعی و جہد اس کے برحق ہونے کی روشن دلیل ہو۔ غرض ہم سے جہاں اور جس حیثیت

میں بھی کسی شخص یا قوم کو سابقہ پیش آئے وہ ہمارے شخصی اور قومی کردار میں اس بات کا ثبوت پالے کہ جن اصولوں کو ہم حق کہتے ہیں وہ واقعی حق ہیں اور ان سے فی الواقع انسانی زندگی اصلح اور اعلیٰ وارفع ہوجاتی ہے۔ پھر یہ بھی عرض کردوں کہ اس شہادت کی تکمیل اگر ہوسکتی ہے تو صرف اس وقت جب کہ ایک اسٹیٹ انھی اصولوں پر قائم ہوجائے اور وہ پورے دین کو عمل میں لاکر اپنے عدل و انصاف سے اپنے اصلاحی پروگرام سے، اپنے حسن انتظام سے، اپنے امن سے، اپنے باشندوں کی فلاح و بہبود سے اپنے حکمرانوں کی نیک سیرت سے اپنی صالح داخلی سیاست سے، اپنی راست بازانہ خارجی پالیسی سے، اپنی شریفانہ جنگ سے اور اپنی وفادارانہ صلح سے ساری دنیا کے سامنے اس بات کی شہادت دے کہ جس دین نے اس اسٹیٹ کو جنم دیا ہے وہ درحقیقت انسانی فلاح کا ضامن ہے اور اس کی پیروی میں نوعِ انسانی کی بھلائی ہے۔ یہ شہادت جب قولی شہادت کے ساتھ مل جائے تب وہ ذمے داری پوری طرح ادا ہوجاتی ہے، جو اُمتِ مسلمہ پر ڈالی گئی ہے۔ تب نوعِ انسانی پر بالکل اتمامِ حجت ہوجاتا ہے اور تب ہی ساری امت اس قابل ہوسکتی ہے کہ آخرت کی عدالت میں نبیؐ کے بعد کھڑی ہو کر شہادت دے سکے کہ جو کچھ حضورؐ نے ہم کو پہنچایا تھا وہ ہم نے لوگوں تک پہنچادیا اور اس پر بھی جو لوگ راہِ راست پر نہ آئے وہ اپنی کج روی کے خود ذمے دار ہیں۔

بس میرا پیغام وہی ہے جو اللہ نے اپنے رسولِ اکرم ﷺ کی زبان سے دلوایا تھا:

تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلاَ نُشْرِکَ بِهٖ شَیْئًا وَّ یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط

(آل عمران: ۶۴)

”آؤ اس امر کی طرف، جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے اور وہ بات یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں، ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے۔“

ہم سب ایک خدا کے بندے، ایک رسولؐ کے پیرو اور ایک کتاب مبین کے ماننے والے ہیں اور ایک ہی قبلہ ہم سب کا مرکز و مرجع ہے۔ آیئے ہم سب اس بات پر متحدہ ہوجائیں کہ اللہ کے سوا اس دنیا میں کسی کی بندگی نہ کریں گے، اس کے قانون کے سوا کسی قانون کی پیروی نہ کریں گے اور اس کے حکم کے سوا کسی کا حکم اس کی زمین پر نہ چلنے دیں گے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین

مولانا مودودی کی کہانی
خود اُن کی زبانی

بچپن

میرا[(۱)] بچپن ریاست حیدر آباد کے مشہور شہر اورنگ آباد دکن میں گزرا ہے۔ میرا خاندان تو دہلی کا تھا۔ لیکن میرے والد مرحوم دہلی سے اورنگ آباد چلے گئے تھے۔ اس وجہ سے میری زندگی کے ابتدائی ۱۳، ۱۴ سال اورنگ آباد ہی میں بسر ہوئے، جو لوگ ایک ہی جگہ پل کر جوان ہوئے ہیں اور ساری عمر اپنے پیدائشی وطن ہی میں بسے ہیں وہ اس بات کا پورا اندازہ نہیں کر سکتے کہ آدمی کو اس جگہ سے کتنی محبت ہوتی ہے، جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا ہو۔

۱۳، ۱۴ سال کی عمر تک میں وہیں رہا۔ پھر میرا یہ پیدائشی وطن مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا۔ برسوں کے بعد جوانی کی عمر میں جب مجھے ایک دفعہ پھر اورنگ آباد جانے کا اتفاق ہوا تو میرے اوپر عجیب کیفیت گزری۔ جوں جوں شہر قریب آتا جارہا تھا، میری بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ریل بہت سست چل رہی ہے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ریل پر سے کود جاؤں اور بھاگ کر شہر میں جا پہنچوں۔ بچپن کی دیکھی ہوئی ایک ایک چیز کو میں پہچاننے کی کوشش کرتا تھا اور میرا دل بے اختیار اس کی طرف کھنچنے لگتا تھا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ آدمی کو اس جگہ سے کتنی گہری محبت ہوتی ہے، جہاں اس کا بچپن گزرا ہو۔

---

(۱) یہ مضمون میں نے مولانا کے مختلف مضامین، مکاتیب اور کتب سے متفرق اقتباسات کے ربط و ترتیب سے مرتب کیا ہے۔ الفاظ ان کے ہیں ترتیب میری ہے۔ یہ مضمون اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ مولانا کی ذاتی داخلی اور خالص نجی باتیں اور تاثرات کی جھلک بھی اس میں آگئی ہے۔ (ا-گ)

بچپن کی یاد

ایک عجیب بات جو میں نے وہاں جا کر محسوس کی وہ یہ تھی کہ بچپن کی دیکھی ہوئی کوئی چیز بھی اتنی بڑی نہ رہی تھی جتنی چند سال پہلے تھی۔ سڑکیں، بازار، گلیاں، عمارتیں سب پہلے سے چھوٹی اور کچھ کچھ تنگ تنگ سی ہوگئی تھیں۔ جن گھروں میں میں وہاں کبھی یا اکثر جایا کرتا تھا۔ وہ بھی پہلے بڑے بڑے تھے اور اب سکڑ کر بالکل چھوٹے ہو گئے تھے۔ حیران تھا کہ جس چیز کو بھی اپنی یاد کے نقشے سے ملا کر دیکھتا ہوں وہ ہے تو اپنی جگہ پر ہی۔ مگر پہلے سے چھوٹی ہو کر رہ گئی ہے۔ آخر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ سارا فرق جو مجھے معلوم ہو رہا ہے، دراصل ان چیزوں کے اندر نہیں بلکہ خود میرے اندر ہو گیا ہے۔ جب تک میں بچہ تھا میری نگاہ چھوٹی تھی اور چیزیں بڑی نظر آتی تھیں۔ جب میں بڑا ہو گیا تو میری نگاہ بھی بڑی ہوگئی اور چیزیں اسی لحاظ سے چھوٹی نظر آنے لگیں۔

بچپن کی باتیں

مجھے اپنی چھوٹی عمر کی باتیں بھی اب تک یاد ہیں۔ مجھے اپنی وہ حیرت اب تک یاد ہے، جو مجھے پہلی مرتبہ یہ سن کر ہوئی تھی کہ ابّا کے ابّا کو دادا اور ابّا کی اماں کو دادی کہتے ہیں۔ میرا دل کسی طرح یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ ابّا بھی کسی کے بیٹے ہو سکتے ہیں اور نہ میں یہ تصور ہی کر سکتا تھا کہ میرے والد بھی کبھی میری طرح بچے ہوں گے۔ اس نئی معلومات پر میں بہت دنوں تک غور کرتا رہا اور یہ بات بڑی تحقیقات کے بعد میری سمجھ میں آئی کہ جتنے لوگ اب بڑے اور بوڑھے ہیں، یہ سب کبھی بچے تھے اور ان کے بھی کوئی ماں باپ تھے۔

اس سے بھی چھوٹی عمر کا اور ایک خیال مجھے اب تک یاد ہے۔ میں اماں اور ابا کے کوئی معنی نہیں جانتا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور میں اُن کے پاس کیسے آگیا ہوں۔ البتہ میں یہ ضرور محسوس کرتا تھا کہ یہ ہیں بڑے اچھے لوگ۔ اپنے والد کو میں دنیا کا سب سے اچھا آدمی اور والدہ کو سب سے اچھی عورت سمجھتا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ لطف اس وقت آتا تھا جب میں بیمار ہوتا یا مجھے کوئی چوٹ لگ جاتی تھی اور میرے والدین میرے لیے پریشان ہوتے تھے۔ اس لطف کی خاطر میں اپنے آپ کو کبھی جان بوجھ کر بھی خطرے میں ڈال دیتا تھا۔ اس وقت

جو بے چینی میری والدہ اور میرے والد کے دل میں پیدا ہوتی تھی، اس سے میرے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا تھا کہ انھیں میری بہت فکر ہے۔ ان تجربات سے ماں اور باپ کے معنی میرے سمجھ میں آئے اور مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ماں اور باپ اور دوسرے لوگوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔

بڑے بھائی

میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ میرے ایک بھائی مجھ سے ۳، ۴ برس بڑے تھے۔ مجھے کھانے کی جو چیز ملتی تھی اسے میں فوراً کھا لیتا تھا مگر بھائی سنبھال کر کسی اچھے وقت پر کھانے کے لیے اٹھا رکھتے تھے۔ اسی طرح جو پیسے ملتے تھے، ان کو بھی میں فوراً خرچ کر ڈالتا تھا۔ اور بھائی صاحب انھیں جمع کر کے کبھی کوئی اچھی چیز خرید لاتے تھے، بس یہ میرے اور ان کے درمیان جھگڑے کی مستقل بنیاد تھی۔ میں ہمیشہ ان کے حصے میں سے اپنا حق وصول کرنے کی کوشش کرتا تھا اور وہ ہمیشہ تھوڑی دیر مقابلہ کرنے کے بعد کچھ نہ کچھ میرے حوالے کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اوّل اوّل تو میں سمجھا کرتا تھا کہ اس طرح میں انھیں شکست دے کر مالِ غنیمت حاصل کرتا ہوں، مگر بعد میں مجھے معلوم ہو گیا کہ بڑے بھائی کو مجھ سے محبت ہے اور انھیں خود بھی اسی میں مزہ آتا ہے کہ میں لڑ بھڑ کر ان سے اپنا حصہ وصول کر لیا کروں۔ اس طرح میں والدین کے حصے میں سے ۷۵ فیصد کا مالک ہوتا تھا، ۵۰ فیصد اپنے حساب میں اور ۲۵ فیصد بڑے بھائی کے حساب میں سے۔ مشہور بات تو یہ ہے کہ ''سگ باش برادرِ خُرد مباش'' چھوٹا بھائی سے کتا بننا زیادہ بہتر ہے مگر میرا تجربہ اس کے خلاف ہے۔

گھر کی تربیت

میرے والد مرحوم نے میری تربیت بڑے اچھے طریقے سے کی تھی۔ وہ دہلی کے شرفاء کی نہایت ستھری زبان بولتے تھے۔ انھوں نے ابتدا سے یہ خیال رکھا کہ میری زبان نہ بگڑنے پائے۔ جب کبھی میری زبان پر کوئی غلط لفظ چڑھ جاتا یا کوئی بازاری لفظ میں سیکھ لیتا تو وہ مجھے ٹوک دیتے اور صحیح لفظ بولنے کی عادت ڈالتے۔ یہی وجہ ہے کہ دکن میں پرورش پانے کے باوجود میری زبان بالکل محفوظ رہی۔ بعد میں مجھ کو ہندستان کے مختلف حصوں میں برسوں رہنے کا اتفاق ہوا ہے

مگر بچپن میں جو زبان پختہ ہو چکی تھی، اس پر کسی جگہ کی بولی کا اثر نہ پڑ سکا۔ وہ راتوں کو مجھے پیغمبروں کے قصے، تاریخ اسلام اور تاریخ ہندستان کے واقعات اور سبق آموز کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ اس کا مفید اثر میں آج تک محسوس کرتا ہوں۔ وہ میرے اخلاق کی درستی کا خیال بھی رکھتے تھے۔ انھوں نے مجھے ایسے بچوں کے ساتھ کبھی نہیں کھیلنے دیا، جن کی عادتیں بگڑی ہوئی ہوں۔ جب کبھی میں کوئی بری عادت سیکھ لیتا تو وہ بڑی کوشش سے اُسے چھڑواتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے ایک ملازمہ کے بچے کو مارا تو انھوں نے اس بچے کو بلا کر کہا کہ تو بھی اسے مار۔ اس سے مجھے ایسا سبق ملا کہ پھر تمام عمر میرا ہاتھ کسی زیر دست پر نہیں اٹھا۔ وہ مجھے زیادہ تر اپنے ساتھیوں کی صحبت میں لے جاتے تھے اور ان کے دوست سب کے سب سنجیدہ شایستہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ان صحبتوں میں بیٹھنے کی وجہ سے میں چھوٹی عمر ہی میں مہذب عادات سیکھ گیا۔ بڑی بڑی باتوں کو سمجھنے لگا۔ میری طبیعت میں جتنی شوخی تھی، والد مرحوم کی اس تربیت کی وجہ سے وہ شرارتوں اور دنگے فساد کے بجائے ظرافت کی شکل میں ڈھل گئی۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں مجھ سے بڑی عمر کے لوگ میرے ساتھ بہت دلچسپی لیا کرتے تھے۔ کیوں کہ میں شرارتیں کرنے کی بجائے بہت مزے مزے کی باتیں کیا کرتا تھا۔

تعلیم

میرے والد مرحوم نے میری ابتدائی تعلیم کا انتظام گھر پر کیا تھا۔ غالباً وہ میری زبان کی حفاظت کے لیے اور مجھے بری صحبتوں سے بچانے کے لیے مدرسے بھیجنا نہیں چاہتے تھے۔ گھر کی اس تعلیم میں مجھ کو بہت سے استادوں سے سابقہ پیش آیا۔ بعض استاد ایسے تھے، جنھوں نے مجھے کند ذہن بنانے کی کوشش کی اور ان کے اثر سے مجھے خود اپنے اوپر ہی شک ہونے لگا کہ شاید میں کچھ پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ بعض استادوں نے مجھے اس سے زیادہ پڑھانے کی کوشش کی، جتنا میں اپنی عمر کے لحاظ سے پڑھ سکتا تھا۔ البتہ بعض استادوں نے مجھے بہت اچھی تعلیم دی اور مجھے جو کچھ حاصل ہوا وہ انھی کا فیض تھا۔ مجموعی طور سے میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ گھر کی یہ تعلیم میرے لیے مدرسے کی بہ نسبت زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ پانچ چھ سال کی اس تعلیم میں مجھ کو اتنا علم حاصل ہو گیا، جتنا دوسرے بچوں کو آٹھ سال میں ہوتا ہے بلکہ جب مجھ کو گیارہ سال کی عمر میں آٹھویں جماعت میں داخل کیا گیا تو اکثر مضمونوں میں میری معلومات اپنے ہم جماعتوں

سے زیادہ تھیں۔ حالاں کہ میں اپنی آٹھویں کلاس میں سب سے چھوٹی عمر کا طالب علم تھا۔

میری ابتدائی تعلیم میں ایک خرابی ایسی تھی، جس کو بعد میں میں نے بری طرح محسوس کیا۔ وہ خرابی یہ تھی کہ عام دستور کے مطابق مجھے بھی سب سے پہلے بغدادی قاعدہ پڑھا کر قرآن مجید پڑھوایا گیا۔ یہ غلطی عام طور پر مسلمان اس زمانے میں بھی کرتے تھے اور آج تک کیے جا رہے ہیں۔ اس کا نقصان یہ ہے کہ بچہ دنیا کی اور ساری چیزیں تو سمجھ کر پڑھتا ہے مگر صرف قرآن ہی کے متعلق وہ خیال کرتا ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے، جسے سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ بس اس کے الفاظ پڑھ لینے کافی ہیں۔ اس غلط طریقے کی وجہ سے مجھے بے سمجھے قرآن مجید کی ایسی عادت پڑی کہ آگے چل کر جب میں نے عربی زبان پڑھ لی، اس وقت بھی برسوں تک قرآن کو بغیر سمجھے پڑھتا رہا۔ ۲۱ برس کی عمر میں مجھ کو پہلی دفعہ اپنی اس غلطی کا احساس ہوا اور میں نے قرآن کو سمجھنے کی کوشش شروع کی۔ میں چاہتا ہوں کہ اب مسلمان بچوں کو اس غلطی سے بچایا جائے اور انھیں قرآن اس وقت پڑھایا جائے جب وہ کم از کم اتنی اردو پڑھ لیں کہ قرآن کا ترجمہ ساتھ ساتھ پڑھ سکیں۔

مدرسہ

اب میں کچھ تھوڑا سا ماحول اپنے مدرسے کا بیان کرتا ہوں۔ ۱۱ برس کی عمر میں جب مجھ کو ہائی اسکول کی آٹھویں جماعت میں داخل کیا گیا، اس وقت مجھے پہلی مرتبہ اپنے ہم عمر لڑکوں سے میل جول کا موقع ملا۔ کیوں کہ اس سے پہلے تک تو میں زیادہ تر بڑوں کی صحبت ہی میں رہا کرتا تھا۔ مدرسے میں اوّل اوّل تھوڑے دنوں میں اجنبی رہا۔ پھر میں نے مدرسے کی اس شریف ٹولی سے دوستانہ تعلقات پیدا کر لیے، جس میں سنجیدہ اور شوقین طالب علم شامل تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے محض اپنی ظرافت کے ذریعے سے شریر ٹولی کے بھی دو تین سرغنوں کو دوست بنا لیا تھا۔ میں ان کی شرارتوں میں شریک نہیں ہوتا تھا۔ مگر مذاق اور لطیفہ گوئی کی وجہ سے میں نے ان کو رام کر لیا تھا۔ اس طرح میں شریف ٹولی کا دوست بھی رہا اور شریر ٹولی سے بھی تعلقات نہیں بگڑے۔ استادوں میں سے اکثر میرے اوپر بہت مہربان تھے۔ خصوصاً ایک استاد تو ایسے شفیق بن گئے کہ آج تک ان کے خاندان سے میرے تعلقات قائم ہیں اور ان کے صاحب زادے کو میں اپنے بھائی کی طرح عزیز رکھتا ہوں۔ مدرسے ہی میں مجھ کو پہلی مرتبہ مضامین لکھنے اور تقریری مباحثوں میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ اس سے مجھ کو احساس ہوا کہ مجھ میں زبان اور قلم سے کچھ کام لینے کی

صلاحیت ہے۔ مدرسے کی زندگی میں چند مہینے ہی گزارنے کے بعد مجھے اس سے اتنی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی کہ چھٹی کا دن مجھ کو سخت ناگوار ہوتا تھا۔ جب لمبی چھٹیاں آتی تھیں تو پہلے ہی سے ہم چند لڑکے آپس میں یہ پروگرام طے کر لیتے تھے کہ روزانہ ایک جگہ جمع ہوا کریں گے۔ مل کر کچھ کیا کریں گے اور مل کر ہی تفریح بھی کریں گے۔

کھیل کود

کھیل سے مجھے ابتدائی عمر میں کم دلچسپی تھی۔ جب کبھی ہوش سنبھالا تو بنّوٹ کے فن سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ میری والدہ صاحبہ کے خاندان میں یہ فن بہت مقبول تھا۔ خصوصاً میرے ماموں اس کے بہت بڑے ماہر تھے۔ میں نے اپنے خالہ زاد بھائیوں سے یہ فن سیکھا اور کچھ مدت تک بس یہی میرا کھیل رہا۔ مدرسے میں داخل ہونے کے بعد مجھے فٹ بال اور کرکٹ سے دلچسپی پیدا ہوئی مگر صرف تفریح کے لیے اس میں شریک ہوتا تھا۔ اچھا کھلاڑی میں کبھی نہیں بن سکا۔

[۱۹۲۰ میں ۱۷ سال کی عمر میں مولانا نے صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ روزنامہ 'تاج' (جبل پور) 'مسلم' اور 'الجمعیۃ' دہلی کے ایڈیٹر رہے۔ اِسی دور میں مشہور علمی کتاب 'الجہاد فی الاسلام' لکھی۔ ۱۹۲۳ میں حیدرآباد دکن سے ترجمان القرآن جاری کیا اور ۱۹۳۸ تک سیکولر جمہوری اسٹیٹ اور متحدہ قومیت کے نظریات کے خلاف مسلسل جہاد کرتے رہے اور بتدریج احیائے اسلام کو اپنا نصب العین زندگی بنالیا]

کانگریس

وہ لوگ جو صرف ہندستانی ہیں، یا پہلے ''ہندستانی'' اور پھر سب کچھ ہیں تو ان سے مجھے کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔ وہ ایک جہاز کے مسافر ہیں اور میں دوسرے جہاز کا مسافر ہوں۔ اِن کی منزلِ مقصود دوسری ہے اور میری منزلِ مقصود دوسری۔ ان کو صرف ''ہندستانی'' کی حیثیت سے سیاسی آزادی اور معاشی استقلال درکار ہے۔ عام اس سے کہ مسلمان رہیں یا نہ رہیں اور مجھے وہ آزادی درکار ہے، جس کے ذریعے سے میں اپنی زوال پزیر اسلامی طاقت کو سنبھال لوں۔

''۱۹۲۷ میں یکا یک یہ خطرہ سامنے آ گیا کہ ہندستان کے مسلمان کہیں اس وطنی قومیت کی

تحریک کے شکار نہ ہوجائیں جو آندھی اور طوفان کی طرح ملک پر چھائی چلی جارہی تھی۔ یہ ظاہر بات ہے کہ ہم موجودہ ظالمانہ نظامِ حکومت کے خواہ کتنے ہی مخالف ہوں اور ہمارے دل میں اس کے پنجے سے نکلنے کی خواہش چاہے کانگریسی حضرات سے بھی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو، مگر ہم کسی طرح بھی گوارا نہیں کر سکتے کہ جو لوگ اس وقت تھوڑے یا بہت اسلام کے حلقۂ اثر میں ہیں ان کو ہندستانی قوم پرستی کی تحریک اپنی ربط عوام کی تدبیروں سے اور اپنی وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم کے ذریعے سے اور اپنے سیاسی و معاشی تفوق کے زور سے اپنے اندر جذب کرلے اور ان کے نظریات اور ان کی زندگی کو اتنا متغیر کردے کہ ایک دو پشتوں کے بعد ہندستان کی آبادی میں اسلام اتنا ہی اجنبی ہوکر رہ جائے جتنا جاپان اور امریکہ میں ہے۔ اس خطرہ کو زیادہ پریشان کن جس چیز نے بنادیا وہ یہ تھی کہ محض انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے لالچ میں مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کا ایک سب سے زیادہ بااثر طبقہ وطنی قوم پرستی کی تحریک کا معاون بن گیا۔ اور اس نے انگریز دشمنی کے اندھے جوش میں اس چیز کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کرلیں کہ اس تحریک کا فروغ ہندوستان میں اسلام کے مستقبل پر کس طرح اثر انداز ہوگا۔ لہٰذا اس خطرے کا سدباب کرنے کے لیے میں نے ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ ۱۹۳۷ کے آخر میں اور پھر دوسرا سلسلہ ۱۹۳۹ کے آغاز میں شروع کیا۔ ان مجموعوں میں میرے پیش نظر صرف یہ چیز تھی کہ مسلمان کم از کم اپنی مسلمانیت کے موجودہ مرتبے سے نیچے نہ جانے پائیں اور اپنے تشخص کو گم نہ کردیں۔ اس لیے میں نے ان کے اندر اسلامی قومیت کا احساس بیدار کرنے کی کوشش کی۔'' ان کو اس جمہوری اور لادینی نظامِ حکومت سے آگاہ کیا، جو واحد قومیت کے مفروضہ ہندستان میں قائم کیا جارہا تھا۔''

مسلم لیگ

میرے ضمیر نے قطعی فیصلہ کرلیا ہے کہ اس نئی تحریک کے دور میں عامۃ المسلمین کی قیادت و رہنمائی ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی ہے، جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبے کے تحت اپنی قوم کے دنیوی مفاد کے لیے کام کررہا ہے۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندستان میں اس سے پہلے کبھی عام مسلمانوں کا اعتماد علمائے دین سے ہٹ کر اس شدت کے

ساتھ غیر دین دار اور ناواقفِ دین رہنماؤں پر نہیں جما تھا۔ میرے نزدیک یہ صورت حال اسلام کے لیے وطنی قومیت کی تحریک سے کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔ اگر ہندستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علاحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ٹرکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھودی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کم بخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رل مل جائے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں نِری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایک مرتبہ اس امر کی شکایت کرتے ہوئے سنا گیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے دولت مند مسلمان اینگلو انڈین فاحشات کے ہاں جاتے ہیں حالاں کہ مسلمان طوائفیں ان کی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں۔ اس حد کمال کو پہنچ جانے کے بعد اس مسلم قوم پرستی کے ساتھ مزید رواداری برتنا میرے نزدیک گناہِ عظیم ہے۔

مقصدِ حیات

میں ایک نومسلم ہوں خوب جانچ اور پرکھ کر اس مسلک پر ایمان لایا ہوں، جس کے متعلق میرے دل و دماغ نے گواہی دی ہے کہ انسان کے لیے فلاح و صلاح کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے۔ میں صرف غیر مسلموں ہی کو نہیں بلکہ خود مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اس دعوت سے میرا مقصد اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کو باقی رکھنا اور بڑھانا نہیں ہے، جو خود ہی اسلام کی راہ سے بہت دور ہٹ گئی ہے۔ بلکہ یہ دعوت اس بات کی طرف ہے کہ آؤ اس ظلم و طغیان کو ختم کر دیں، جو دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ انسان پر انسان کی خدائی کو مٹا دیں اور قرآن کے نقشے پر ایک نئی دنیا بنائیں، جس میں انسان کے لیے بحیثیت انسان شرف و عزت ہو، حریت اور مساوات ہو عدل اور امان ہو۔

(۱۹۳۸ میں علامہ اقبال مرحوم کی دعوت پر مولانا پنجاب منتقل ہو گئے)

تشکیل جماعت

میں نے اور میرے ہم خیال لوگوں نے کامل تین سال اس امر کی کوشش کی کہ مسلمانوں میں، جو بڑی بڑی جماعتیں اس وقت قائم ہیں، وہ سب یا کم از کم ان میں سے کوئی ایک اپنے نظام اور پروگرام میں ایسی تبدیلی کرے، جس سے اسلام کی یہ ضرورت پوری ہو جائے اور ایک نئی جماعت بنانے کی حاجت باقی نہ رہے۔ مگر افسوس کہ ہمیں اس کوشش میں پوری ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ ان لوگوں کو جمع کریں، جو موجودہ جماعتوں کے طرزِ عمل سے غیر مطمئن اور صحیح اسلامی اصول پر کام کرنے کے خواہش مند ہیں۔ چناں چہ شعبان ۱۳۶۰ (اگست ۱۹۴۱) میں ہم نے ان لوگوں کا اجتماع منعقد کیا اور باہمی مشورے سے ''جماعت اسلامی'' قائم کی۔

اسلام کا شعور

ایک وقت تھا کہ عام مسلمانوں کی طرح میں خود بھی روایتی اور نسلی مذہبیت کا قائل اور اس پر عمل پیرا تھا۔ جب ہوش آیا تو محسوس ہوا کہ اس طرح محض مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآئَنَا کی پیروی ایک بے معنی چیز ہے۔ آخر کار میں نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف توجہ کی، اسلام کو سمجھا اور جان بوجھ کر اس پر ایمان لایا۔ پھر آہستہ آہستہ اسلام کے مجموعی اور تفصیلی نظام کو سمجھنے اور معلوم کرنے کی کوشش کی۔ جب اللہ تعالیٰ نے قلب کو اس طرف سے پوری طرح مطمئن کر دیا تو جس حق پر خود ایمان لایا تھا، اس کی طرف دوسروں کو دعوت دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس مقصد کے لیے ۱۳۵۲ میں ''ترجمان القرآن'' جاری کیا۔ ابتدائی چند سال الجھنوں کو صاف کرنے اور دین کا ایک واضح تصور پیش کرنے میں صرف ہوئے۔ اس کے بعد دین کو ایک تحریک کی شکل میں جاری کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری زندگی میں دین داری محض ایک انفرادی رویّے کی صورت میں جامد و ساکن ہو کر نہ رہ جائے۔ بلکہ ہم اجتماعی صورت میں اس نظامِ دینی کو عملاً نافذ و قائم کرنے اور مانع و مزاحم قوتوں کو اس کے راستے سے ہٹانے کے لیے جدوجہد بھی کریں۔ ''ادارہ دار الاسلام'' کا قیام اس سلسلے کا پہلا قدم تھا۔ ۱۳۵۷ (۱۹۳۸) میں یہ قدم اٹھایا گیا اور اس وقت صرف چار آدمی رفیق کار بنے۔ اس چھوٹی سی ابتدا کو اس وقت بہت حقیر سمجھا گیا۔ مگر الحمد للہ کہ ہم بد دل نہ ہوئے

اور اسلامی تحریک کی طرف دعوت دینے اور اس تحریک کے لیے نظری حیثیت سے ذہن ہموار کرنے کا کام لگاتار کرتے چلے گئے۔ اس دوران میں ایک، ایک دو، دو کر کے رفقا کی تعداد بڑھتی رہی۔ ملک کے مختلف حصوں میں ہم خیال لوگوں کے چھوٹے چھوٹے حلقے بھی بنتے رہے اور لٹریچر کی اشاعت کے ساتھ ساتھ زبانی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ آخر کار تحریک کے اثرات کا گہرا جائزہ لینے کے بعد محسوس ہوا کہ اب جماعتِ اسلامی کی تاسیس اور تحریک اسلامی کو منظّم طور پر اٹھانے کے لیے زمین تیار ہو چکی ہے اور یہ وقت دوسرا قدم اٹھانے کے لیے موزوں ترین وقت ہے۔ چناں چہ اسی بنیاد پر ایک اجتماع منعقد کر کے تحریک کی بنیاد ڈال دی گئی۔

انفرادی حیثیت ختم

میرا کام آپ کو ایک جماعت بنا دینے کے بعد پورا ہو جاتا ہے۔ میں صرف ایک داعی تھا۔ بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری تمام مساعی کی غایت یہ تھی کہ ایک نظامِ جماعت بن جائے۔ جماعت بن جانے کے بعد میں آپ میں کا فرد ہوں۔ اب یہ جماعت کا کام ہے کہ اپنے میں سے کسی اہل تر آدمی کو اپنا امیر منتخب کرے اور پھر یہ اس امیر کا کام ہے کہ آئندہ اس تحریک کو چلانے کے لیے اپنی صواب دید کے مطابق ایک پروگرام بنائے اور اسے عمل میں لائے۔ میرے متعلق کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ جب دعوت میں نے دی ہے تو آئندہ اس تحریک کی رہنمائی کو بھی میں اپنا ہی حق سمجھتا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ نہ میں اس کا خواہش مند ہوں، نہ اس نظریے کا قائل ہوں کہ داعی کو ہی آخر کار لیڈر بھی ہونا چاہیے۔ نہ مجھے اپنے متعلق یہ گمان ہے کہ اس عظیم الشان تحریک کا لیڈر بننے کی اہلیت مجھ میں ہے اور نہ اس کام کی بھاری ذمے داریوں کو دیکھتے ہوئے کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ حماقت کر سکتا ہے کہ اس بوجھ کو اپنے کندھوں پر لادے جانے کی خود تمنا کرے۔

میری تمنا

میری غایت تمنا اگر کچھ ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ایک صحیح اسلامی نظامِ جماعت کے ماتحت ایک چپراسی کی خدمت انجام دینا بھی میرے نزدیک اس سے زیادہ قابلِ فخر ہے کہ کسی غیر اسلامی نظام میں صدارت اور وزارتِ عظمیٰ کا منصب مجھے حاصل ہو۔

امارتِ جماعت

میں آپ کے درمیان نہ سب سے زیادہ علم رکھنے والا تھا، نہ سب سے زیادہ متقی، نہ کسی اور خصوصیت میں مجھے فضیلت حاصل تھی۔ بہر حال جب آپ نے مجھ پر اعتماد کر کے اس کارِ عظیم کا بار میرے اوپر رکھ دیا ہے تو میں اب اللہ سے دعا کرتا ہوں اور آپ لوگ بھی دعا کریں کہ مجھے اس بار کو سنبھالنے کی قوت عطا فرمائے اور آپ کے اس اعتماد کو مایوسی میں تبدیل نہ ہونے دے۔ میں اپنی حدِ وسع تک انتہائی کوشش کروں گا کہ اس کام کو پوری خدا ترسی اور پورے احساسِ ذمے داری کے ساتھ چلاؤں۔ میں قصداً اپنے فرض کی انجام دہی میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ میں اپنے علم کی حد تک کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ اور خلفاے راشدینؓ کے نقشِ قدم کی پیروی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ تاہم اگر مجھ سے کوئی لغزش ہو اور آپ میں سے کوئی محسوس کرے کہ میں راہِ راست سے ہٹ گیا ہوں تو مجھ پر یہ بدگمانی نہ کرے کہ میں عمداً ایسا کر رہا ہوں۔ بلکہ حسنِ ظن سے کام لے اور نصیحت سے مجھے سیدھا کرنے کی کوشش کرے۔ آپ کا مجھ پر حق ہے کہ میں اپنے آرام و آسایش اور اپنے ذاتی فائدوں پر جماعت کے مفاد اور اس کے کام کی ذمے داریوں کو ترجیح دوں، جماعت کے نظم کی حفاظت کروں، ارکانِ جماعت کے درمیان عدل اور دیانت کے ساتھ حکم کروں، جماعت کی طرف سے جو امانتیں میرے سپرد ہوں، ان کی حفاظت کروں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے دل و دماغ اور جسم کی تمام طاقتوں کو اس مقصد کی خدمت میں صرف کر دوں، جس کے لیے آپ کی جماعت اٹھی ہے میرا آپ پر یہ حق ہے کہ جب تک میں راہِ راست پر چلوں آپ اس میں میرا ساتھ دیں۔ میرے حکم کی اطاعت کریں، نیک مشوروں سے اور امکانی امداد و اعانت سے میری تائید کریں اور جماعت کے نظم کو بگاڑنے والے طریقوں سے پرہیز کریں۔ مجھے اس تحریک کی عظمت اور خود اپنے نقائص کا پورا احساس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ وہ تحریک ہے، جس کی قیادت اولوالعزم پیغمبروں نے کی ہے اور زمانۂ نبوت گزر جانے کے بعد وہ غیر معمولی انسان اس کو لے کر اٹھتے رہے ہیں، جو نسلِ انسانی کے گل سرسبد تھے۔ مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے بارے میں یہ غلط فہمی نہیں ہوئی کہ میں اس عظیم الشان تحریک کی قیادت کا اہل ہوں۔ بلکہ میں تو اس

کو ایک بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ اس وقت اس کارِ عظیم کے لیے آپ کو مجھ سے بہتر کوئی آدمی نہ ملا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے فرائضِ امارت کی انجام دہی کے ساتھ برابر تلاش میں رہوں گا کہ کوئی اہل تر آدمی اس کا بار اٹھانے کے لیے مل جائے اور جب میں ایسے آدمی کو پاؤں گا تو خود سب سے پہلے اس کے ہاتھ پر بیعت کروں گا۔ نیز میں ہمیشہ ہر اجتماعِ عام کے موقعے پر جماعت سے بھی درخواست کرتا رہوں گا کہ اگر اب اس نے کوئی مجھ سے بہتر آدمی پالیا ہے تو وہ اسے اپنا امیر منتخب کرے اور میں اس منصب سے بہ خوشی دست بردار ہو جاؤں گا۔ بہر حال میں ان شاء اللہ اپنی ذات کو کبھی خدا کے راستے میں سدِ راہ نہ بننے دوں گا اور کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ دوں گا کہ ایک ناقص آدمی اس جماعت کی رہنمائی کر رہا ہے۔ اس لیے ہم اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔ میں کہتا ہوں کہ کامل آئے اور یہ مقام جو آپ نے میرے سپرد کیا ہے ہر وقت اس کے لیے خالی ہو سکتا ہے۔ البتہ میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں کہ اگر کوئی دوسرا اس کام کو چلانے کے لیے نہ اُٹھے تو میں بھی نہ اُٹھوں۔ میرے لیے تو یہ تحریک عین مقصدِ زندگی ہے۔ میرا مرنا اور جینا اس کے لیے ہے۔ کوئی اس پر چلنے کے لیے تیار ہو یا نہ ہو۔ بہر حال مجھے تو اسی راہ پر چلنا ہے اور اسی راہ میں جان دینا ہے۔ کوئی آگے نہ بڑھے گا تو میں بڑھوں گا۔ کوئی ساتھ نہ دے گا تو میں اکیلا چلوں گا۔ ساری دنیا متحد ہو کر مخالفت کرے گی، تو مجھے تن تنہا اس سے لڑنے میں باک نہیں ہوگا۔

میرا دینی فہم

میں نے دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کی بجائے ہمیشہ قرآن اور سنت ہی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے میں کبھی یہ معلوم کرنے کے لیے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مومن سے کیا چاہتا ہے؟ یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ فلاں اور فلاں بزرگ کیا کہتے ہیں۔ بلکہ صرف یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ قرآن کیا کہتا ہے اور رسولؐ نے کیا کہا یا کیا؟

فقہی مسلک

میرا مسلک یہ ہے کہ ایک صاحب علم آدمی کو براہِ راست کتاب و سنت سے حکم صحیح معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس تحقیق و تجسس میں علمائے سلف کی ماہرانہ آرا سے بھی

مدد لینی چاہیے۔ نیز اختلافی مسائل میں اسے ہر تعصب سے پاک ہو کر کھلے دل سے تحقیق کرنی چاہیے کہ ائمہ مجتہدین میں سے کس کا اجتہاد کتاب وسنت سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ پھر جو چیز حق معلوم ہو اسی کی پیروی کرنی چاہیے۔

میرے نزدیک صاحب علم آدمی کے لیے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ اپنی تحقیق کی بنا پر کسی ایک اسکول کے طریقے اور اصول کا اتباع کرنا اور چیز ہے اور تقلید کی قسم کھا بیٹھنا بالکل دوسری چیز اور یہی آخری چیز ہے، جسے میں صحیح نہیں سمجھتا۔

نظریۂ ادب

معاش کے لیے کوئی ادب پیدا کرنا میرے نزدیک غلط چیز ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ آدمی معاش کے لیے اینٹیں ڈھولے۔ ادب دماغوں کو ڈھالنے والی چیز ہے، یہ کام محض معاش کے لیے نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ اس کو تو بالکل اپنے نظریۂ ومسلک پر کرنا ہوگا۔

ارباب جفا پیشہ کو اطلاع

میں نے اپنی عمر کا تقریباً دو تہائی حصہ مطالعہ و تحقیق اور غور و فکر میں صرف کیا ہے اس تیس سال کی مدت میں پڑھ کر، سن کر، سوچ کر، سمجھ کر اور مشاہدہ و تجربہ کر کے میرے ذہن کا ایک خاص سانچہ بن چکا ہے۔ میری زندگی کا ایک نصب العین قرار پا چکا ہے۔ میری فکر کا ایک خاص انداز اور سوچنے کا ایک خاص طرز قائم ہو چکا ہے۔ میں کچھ رائیں رکھتا ہوں، جن کی پشت پر برسوں کے مطالعے سے فراہم کیے ہوئے دلائل ہیں۔ میں نے کچھ چیزوں کو حق پایا ہے اور ان پر میں پورے قلبی و دماغی اطمینان کے ساتھ ایمان لایا ہوں اور کچھ چیزوں کو میں نے باطل پایا ہے اور ان کو قلب و دماغ کے متفقہ فیصلے کے ساتھ رد کر چکا ہوں۔ میرے ذہن اور ضمیر کے یہ فیصلے میری ذات کی حد تک بھی محدود نہیں رہے ہیں۔ بلکہ میں برسوں سے ان کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ ہزاروں آدمیوں کو میں نے اپنے نصب العین کی طرف کھینچا ہے، جسے میں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنایا تھا۔ ہزاروں کو اس حق کا قائل کیا ہے، جس حق کا میں خود قائل ہوا تھا۔ ہزاروں کا رشتہ اس باطل سے کٹوایا ہے، جس سے میں نے خود اپنا رشتہ کاٹا تھا۔ ہزاروں بندگانِ خدا کی زندگیوں کو احقاق حق اور ابطال باطل کی اس جدوجہد میں مبتلا کر دیا ہے، جس میں میں خود مبتلا ہوں۔ اب اگر

کسی نے یہ سمجھا تھا کہ میرے ذہن اور خیالات اور مقصد زندگی ہر چیز کو محض طاقت کی دھونس اور جیل کی دلیل سے بدلا جا سکے گا، تو میں اس کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کا صحیح مقام ایوانِ حکومت نہیں بلکہ شفا خانہ امراض دماغی ہے اور اگر اس نے یہ توقع قائم کی تھی کہ اس دباؤ میں آ کر اپنا ضمیر اس کے ہاتھ رہن رکھ دوں گا اور آئندہ سے راشن کیے ہوئے خیالات ظاہر کرنے لگوں گا تو میں اس کو مطلع کرتا ہوں کہ اس نے میری سیرت کو اپنی سیرت پر قیاس کرنے میں غلطی کی ہے۔ میرا دل صداقت کے لیے تو ہر وقت کھلا ہوا ہے اور میری رائے کو علمی و عقلی دلائل سے بدلا جا سکتا ہے، لیکن میرا ایمان و ضمیر کوئی قابل بیع و رہن چیز نہیں ہے۔ اس کی کوشش پہلے بھی، جس نے کی ہے ناکام ہوا ہے اور آئندہ بھی، جو کرے گا ان شاء اللہ منہ کی کھائے گا۔

(مولانا مودودی مطالبہ نظام اسلامی کی سزا بھگتنے کے دوران میں ۱۹۴۸ سے ۱۹۵۰ تک ملتان جیل میں رہے)

توکل

بلا مبالغہ آج شاید روئے زمین پر مجھ سے زیادہ مطمئن کوئی آدمی نہیں ہے۔ بال بچوں اور متعلقین کی مجھے فکر نہیں کیوں کہ انھیں خدا کے حوالے کر آیا ہوں۔ قوم کی مجھے کوئی فکر نہیں۔ کیوں کہ اس معاملے میں خدا کی طرف سے جتنی ذمے داری مجھ پر تھی وہ سب موجودہ حکمراں گروہ نے اپنے ذمے لے لی ہے جماعت اور دعوتِ اسلامی کی مجھے فکر نہیں کیوں کہ گرفتار ہوتے ہی عنداللہ بری الذمہ ہو چکا ہوں اور اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی سو فیصد یقین رکھتا ہوں کہ اس کام کو میرے قید ہوئے رہنے سے قطعاً کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ بلکہ اس کے برعکس فائدہ ہی پہنچے گا۔

راہِ حق میں صبر

یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ سینکڑوں خدا کے بندے ایسے ہیں، جنھوں نے اپنے نفس کی خاطر چوری، ڈاکہ، قتل اور دوسرے جرائم کیے ہیں اور ان کی پاداش میں کئی کئی سال کی قیدیں برداشت کر رہے ہیں۔ انتہائی تکلیف کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے لیے نہ یہاں کوئی راحت ہے اور نہ حیاتِ اُخروی کے لیے ہی ان کے پاس کوئی تسلی کا سامان ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر انسان یہ سب کچھ چند لمحوں کے عارضی فوائد اور بلندیوں کی خاطر برداشت کر جاتا ہے تو کیا ہم کو یہ زیب

دیتا ہے کہ جو کچھ ہم نے اپنے نفس کے لیے نہیں بلکہ خدا اور اس کے دین کے لیے کیا اور جس پر ہم ابدی زندگی میں اجر پانے کی توقع بھی رکھتے ہیں، اس کی پاداش میں بندوں کی کسی انتقامی کارروائی کو ہم ٹھنڈے دل سے برداشت نہ کریں اور اس ذرا سی اذیت پر جو ہمیں پہنچ رہی ہے۔ مضطرب ہونے لگیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ بندگانِ نفس کی بہ نسبت بندگانِ حق کو اگر دو گنے اور چوگنے مصائب وشدائد سے بھی سابقہ پیش آئے تو ان کی پیشانی پر بل نہ آنا چاہیے۔''

ایک مستقل عارضہ

جس روز میں گرفتار ہوا تھا، اس سے پانچ چھ روز پہلے مجھے محسوس ہوا کہ ایک پتھری گردے سے مثانے میں منتقل ہوچکی ہے۔ چناں چہ میں نے پیس کر پینے کی دوا اور جوشاندے کا استعمال فوراً شروع کر دیا۔ جس سے پتھری بالکل مثانہ میں آ کر اڑ گئی اور پیشاب رُک رُک کر آنے لگا، جو اس بات کی علامت تھی کہ اب پتھری خارج ہوا چاہتی ہے۔ ٹھیک اسی زمانے میں وہ تاریخ آ گئی، جو خدا نے میری گرفتاری کے لیے مقرر کی تھی، اس حالت میں ظاہر ہے کہ نہ پیس کر پینے کی دوائیں استعمال ہوسکتی تھیں اور نہ جوشاندے کا اہتمام ہوسکتا تھا، اس لیے دوائیں چھوڑ چھاڑ کر پولیس کے ساتھ ہولیا۔ لائل پور جیل میں تین چار روز پیشاب بے حد تکلیف سے آتا رہا۔ بلکہ ایک دن تو بالکل ہی رُک گیا تھا۔ اس وقت اگر دوا مل جاتی تو غالباً اسی وقت پتھری خارج ہوجاتی۔ مگر دوا نہ ملنے کی وجہ سے رفتہ رفتہ پتھری پیشاب کے راستے سے ہٹ گئی اور تکلیف جاتی رہی۔ اس وقت پتھریاں پھر اخراج کی طرف مائل ہیں۔ مگر خدا کی مرضی کچھ اور معلوم ہوتی ہے اور غالب بہرحال اسی کی مرضی کو ہونا ہے۔

عزیمت

بالمشافہ ومعائنہ کر کے علاج کے بارے میں رائے قائم کرنا مفید ہوسکتا ہے، لیکن معلوم ہوا کہ قواعد میں اس کی گنجایش نہیں ہے۔ اب صرف یہ صورت رہ جاتی ہے کہ میں بطورِ خاص حکومت سے یہ رعایت مانگوں کہ وہ مجھے اپنے معالج سے مشورہ لینے کی اجازت دے۔ لیکن ظالم سے رعایت کا مطالبہ کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ میں جان دے سکتا ہوں مگر رعایت کی درخواست نہیں کرسکتا۔

تنقید کا مسلک

''میں نے اپنی پوری پبلک لائف میں گالیاں کھائی تو بہت ہیں مگر الحمدللہ کہ کبھی گالی دی نہیں۔ میں نے اصولاً جس کی رائے اور پالیسی کو صحیح سمجھا اس کی تائید کی ہے اور جس کی بھی رائے یا پالیسی سے مجھے اتفاق نہیں رہا ہے، اس پر بے خوف تنقید کی ہے، مگر نہ میں تملق سے ملوث ہوا ہوں اور نہ بدزبانی سے۔ شخصی طور پر میں نے ہمیشہ ان لوگوں کا احترام ملحوظ رکھا ہے، جن سے قومی یا دینی معاملات میں اختلاف کیا ہے۔ میں صرف ایمان دارانہ اور بامقصد تنقید کا قائل ہوں اور خدا اور رسولؐ کے سوا کسی کو بھی تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتا خواہ وہ کوئی بھی ہو۔''

بچوں کی تربیت

میں نے اس لیے بچوں کو ملاقات کے لیے جیل میں لانے سے منع کر رکھا تھا کہ بچوں کے ذہن پر یہاں کے ماحول کا برا اثر پڑنے کا اندیشہ تھا۔ مگر اب غور کرنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انھیں یہ جگہ ضرور دکھانی چاہیے۔ کیا عجب کہ کل جو نسل اٹھنے والی ہے وہ موجودہ نسل سے بھی زیادہ بگڑی ہوئی ہو اور اس کے مقابلے میں ان لوگوں کو ہم سے بھی زیادہ سخت جدوجہد کرنی پڑے۔ میں اپنی اولاد کو عیش کے لیے نہیں پالنا چاہتا بلکہ خیر کی خدمت اور شر سے جنگ کے لیے پالنا چاہتا ہوں۔

کبر کا الزام

نہ میں کوئی رئیس آدمی ہوں اور نہ پیشہ ور لیڈر۔ میرے مکان پر کبھی دربان و پاسبان نہیں رہے، ہر وقت ہر شخص سے آزادانہ ملتا رہا ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ موجودہ زمانے کی عام بگڑی ہوئی فضا میں کسی شخص کا بدگمانیوں سے بچنا مشکل ہے اور بدگمانی کرنے میں بندگان خدا حق بہ جانب بھی ہیں، ہوسکتا ہے کہ کوئی صاحب میرے پاس تشریف لائیں اور میں مکان پر موجود نہ ہوں یا بیمار ہوں یا کسی سے عذر کیا جائے اس پر یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ یہ عذر نہیں بہانہ ہے۔ لوگوں کو آئے دن ایسے تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے کچھ شکایت نہیں اگر وہ کسی کے صحیح عذر کو بھی نہ ملنے کا بہانہ سمجھیں۔

میرا فن

مجھے ارواح خبیثہ اور جنوں اور شیاطین کے بارے میں نہ تو کچھ علم ہی حاصل ہے اور نہ ان چیزوں کے دفعہ کرنے کے طریقے ہی جانتا ہوں۔ میری واقفیت صرف ان ارواحِ خبیثہ اور شیاطین تک محدود ہے، جو خود انسانوں میں موجود ہیں اور آج تک جو کچھ سیکھا اور عمل کیا ہے وہ بھی انہی کو دفع کرنے کے لیے ہے۔

میرا حاصل مطالعہ

میرا عمر بھر کا مطالعہ مجھے بتاتا ہے کہ دنیا میں کبھی وہ طاقتیں زندہ نہیں رہ سکی ہیں، جنھوں نے قلعوں میں پناہ لینے کی کوشش کی ہے۔ کیوں کہ میدان کے مقابلے میں جی چرانا اور قلعوں کے پیچھے چھپنا بزدلی کی کھلی علامت ہے اور خدا نے اپنی یہ زمین بزدلوں کی فرماں روائی کے لیے نہیں بنائی ہے۔ اسی طرح میرا مطالعہ مجھے یہ بھی بتاتا ہے کہ جن لوگوں کا کاروبار جھوٹ اور فریب اور مکر کے بل پر چلتا ہے اور جن کے لیے حقیقت و صداقت کا روشنی میں آجانا خطرے کا حکم رکھتا ہے اور جن کو اپنی حکمرانی کی حفاظت کے لیے ''سیفٹی'' قسم کے قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے، ایسے اخلاقی بزدلوں کی چوبی ہنڈیا زیادہ دیر تک چولھے پر کبھی نہ چڑھی رہ سکی ہے اور نہ رہ سکتی ہے۔ یہ چیز عقل کے خلاف ہے۔ قانونِ فطرت کے خلاف ہے اور ہزارہا برس کے تجربات اس پر شاہد ہیں کہ ان سہاروں پر چلنے والے تھوڑی دیر کے لیے چاہے کتنا ہی زور باندھ لیں بہر حال وہ دیر تک نہیں جی سکتے۔

خلقِ خدا کی نظر میں

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ گزشتہ ربع صدی سے اس راہ پر چل رہے ہیں، جس پر چلتے ہوئے بڑے بڑوں کا زہرہ آب ہوا کرتا ہے۔ جو راہ اس صفحۂ ہستی پر سب سے زیادہ کٹھن ہے، جس پر اللہ کے سب سے زیادہ پرعزم بندے حقِ بندگی ادا کرنے کے لیے تاریخ کے ہر دور میں چلتے رہے ہیں اور جس سے زیادہ پرخار وادی شاید دنیا کی اس زندگی میں اور کوئی نہیں ہے۔ مولانا مودودیؒ نے ملت اسلامیہ کے کروڑوں افراد کے درمیان پکار کر کہا:

"آؤ ہم سب صرف اسی ایک اللہ کی بندگی کریں۔ اسی کے حکم پر چلیں، اسی کو مالک الملک کہیں اور اسی کا قانون دنیا میں نافذ کریں۔ جو ہم سب کا مالک اور واحد الٰہ ہے۔"

یہ آواز سن کر زمانے کے سمندر میں ایک معمولی لرزش بھی پیدا نہ ہوئی۔ ملت کے اجتماعی شعور نے سوچا۔ ایسی آوازیں اٹھتی ہی رہتی ہیں اور پھر چند دن کی معمولی یا غیر معمولی تگ وتاز سے مسلمانوں کو ادھر ادھر بھٹکانے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ انھی کی طرح یہ بھی کوئی آواز ہوگی۔ سننے والوں نے ایک مدہوشی کے عالم میں یہ آواز سنی اور پھر ایک گہری غفلت میں گم ہو گئے۔ طاغوتِ وقت جس کی حاکمیت کو یہ آواز کھلا کھلا چیلنج دے رہی تھی، زبان حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ اس قسم کی آوازیں تو مسلمان قوم کے لیڈری پیشہ حضرات کا وطیرہ بن گئی ہیں، جن کے پیچھے کوئی عزم، کوئی استقلال کوئی حوصلہ اور کوئی دم خم نہیں ہوتا۔ اگر کچھ کرو تو پھر ہم بھی جانیں گے کہ ان بازوؤں میں کتنی طاقت ہے۔ لیکن جس نے پکار لگائی وہ کوئی گم کردہ راہ مسافر نہ تھا وہ تو رحیل کاررواں

بلکہ ایک قافلہ سالار تھا۔ اس کے قافلے کی رفتار سے تو راستے ہموار ہونے والے تھے، اس کے قدموں کی چاپ سے تو بھولے بھٹکے راہ پانے والے تھے۔ چناں چہ وہ اس راہ پر بڑھتا رہا اور اکا دکا مسافر اس کی رفاقت اختیار کرتے چلے گئے۔ یہ وقت تھا جب کئی برسوں کے بعد طاغوتِ وقت جاگا۔ افسوس کہ وہ طاغوت خود اُمت مسلمہ کے اندر سے پیدا ہوا تھا۔ آخر وہ کون سا مصلح ہے، جسے مارنے کے لیے اس کی اپنی ہی قوم میں سے کچھ بد بخت ہاتھ بلند نہیں ہوتے۔

یہی وقت تھا کہ جب طاغوت وقت نے بھی جانا کہ یہ آواز بے حوصلہ غیر مستقل مزاج اور کسی موقع پرست آدمی کی آواز نہ تھی بلکہ ایک قوت تھی، جو اپنا راستہ خود ہموار کرنے، اپنی منزل پر خود پہنچنے اور اپنی راہ خود چلنے کا داعیہ لے کر اٹھی تھی اور جو منزل پر پہنچنے سے پہلے کسی دوسری دلچسپی میں نہیں الجھا کرتی اور ملت نے بھی جان لیا کہ یہ باتیں کہنے والا شخص ان لوگوں سے علیحدہ کردار کا آدمی تھا۔ جو اس قسم کی بولیاں روز بول بول کر اس پر منڈلایا کرتے تھے۔ طاغوت نے حملہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اس کے وجود کو سب سے بڑا خطرہ اگر کوئی تھا تو اسی قافلہ راہِ حق سے تھا۔ چناں چہ اس نے دنیا کے چوراہے پر پھانسی گاڑی اور اس شخص کو پھانسی پر لٹکا دینے کی سعی نامشکور تک کر ڈالی۔ لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس زبردست پشت پناہ نے، جو زمین و آسمان کا خالق ہے۔ اس پھانسی کو ایک عظیم الشان مینار بنا دیا اور اس مردِ خدا کو اس مینار پر کھڑا کر دیا۔ تاکہ ساری دنیا والے دیکھ لیں کہ وہ کتنا عظیم الشان تھا۔ اس کا حوصلہ کتنا بلند تھا۔ اور اس کا عزم کتنا ارفع تھا۔ چناں چہ جو لوگ اسے جانتے تھے، وہ جان گئے، جو اسے درخور اعتنا نہ سمجھتے تھے ان کے دل اس کی عظمت اور محبت سے معمور ہو گئے اور جو لوگ اسے نظر انداز کرتے تھے وہ خود اس کے رفعِ ذکر کا سبب بن گئے۔ بے شمار صاحبانِ علم و دانش اور اربابِ ادب و صحافت نے اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اور اس کی دعوت کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ یہ بیشتر اقتباسات اس وقت کے اظہارِ خیالات میں سے لیے گئے ہیں، لیکن بہت سے اقتباسات ایسے ہیں خصوصاً علما کرام کی ایک بڑی تعداد کے، جو دوسرے مختلف اور متفرق اوقات میں اعترافِ حقیقت اور جذبہ محبت و رفاقت کے تحت لکھے گئے تھے۔ اُنھی کو میں نے یہاں تین عناوین کے تحت مرتب کر دیا ہے۔

اربابِ علم و دانش کی نظر میں

الشیخ محمد البشیر الابراھیمی الجزائری

''علاّمہ مودودی ایسی شخصیت کے مالک ہیں کہ میں نے کم ہی ایسے باکمال دیکھے ہیں۔ بلکہ وہ اپنی چند ممتاز خصوصیات کے لحاظ سے فردِ واحد ہیں، جس کی نظیر میں اس زمانے کے علماء میں نہیں پاتا۔ مثلاً حق کے مقابلے میں نہایت سخت، مداہنت سے کوسوں دور، اور راہِ حق میں ابتلا و محن کے وقت صبر و ثبات کے پیکر، حکامِ وقت کے تقرب سے متنفر، خوشامد و تملق تو دور کی بات ہے۔ پاکستان اور ہندستان کے، جن فضلا سے میں متعارف ہوا ہوں یا جن کے علم و فضل کے متعلق میری غائبانہ معلومات ہیں، ان میں سب سے زیادہ تفقہ فی الدین رکھنے اور اسلام کے تاریخی و تشریحی حقائق پر بصیرت رکھنے والے ہیں۔ وہ معلومات کا سمندر ہیں، دقیقہ سنج اور بلا کے ذہین ہیں۔ روشن خیال، تدبیر کے بادشاہ اور روحانیت کے صاف و شفاف آئینہ ہیں۔ مسائل حاضرہ کو اسلامی اصول پر تطبیق دینے میں ماہر اور استنباط کی بے پناہ قدرت رکھتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ ایک مستقل جدید طرز استدلال کے موجد ہیں۔ شریعت کے مزاج شناس اور اس کے بنیادی مقاصد کے رمز آشنا ہیں اور جزئیات میں بلاضرورت الجھنے سے محترز، باریک بیں، دوررس اور پیکر یقین ہیں، جس کی جھلک ان کے اعمال و کردار میں بہ صورتِ عزم و ثبات نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

سیّد مودودی قرآن و حدیث پر کامل عبور، کتب دینیہ میں ماہرانہ دست گاہ اور تطبیق اور استنباط پر قدرت تامہ رکھتے ہیں۔ وہ علومِ جدیدہ میں بھی مہارت رکھتے ہیں، موجودہ تہذیب کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہیں۔

علامہ مودودی اپنے پہلو میں ایسا دل رکھتے ہیں، جو مسلمانوں کی موجودہ پستی و زبوں حالی کے درد سے تڑپتا رہتا ہے اور ان کے شاندار ماضی کے عشق میں وارفتہ ہے۔ وہ نظام اسلامی کے داعی و علم بردار ہیں۔ ان کا ایمان ہے اور پوری بصیرت اور عالمانہ تحقیق و دقت نظر کے ساتھ ایمان ہے کہ انسانی زندگی کا عادلانہ اور کامیاب ضابطۂ حیات اسلام اور صرف اسلام ہے۔ کیوں کہ اسلامی نظام ہی ایسا نظام ہے، جو عدل وقسط کا پیکر ہے۔ یہی نظام بشری رجحانات، ذاتی مصالح، نسلی قومی اور گروہی عصبیتوں اور طبقاتی مفاد سے منزہ ہے۔ اسلامی حکومت کا نظریہ ان کے اسی فکر و بصیرت اور شرح صدر کا نتیجہ ہے۔

تصنیف و تالیف کے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ کتابیں حجم کے لحاظ سے چھوٹی ہونی چاہئیں، تاکہ ان کا پڑھنا آسان اور پھیلنا عام ہو سکے اور اسی انداز کی انھوں نے تقریباً اپنی تمام کتابیں تصنیف کی ہیں، جو مختلف موضوعات پر ہیں اور دیکھنے میں کتابچے اور پمفلٹ ہیں مگر اپنے معانی و مضامین کے لحاظ سے وہ ایسے کوزے ہیں، جن میں دریاؤں کو بند کیا گیا ہے۔

ہم اس واقعے کے اظہار پر مجبور ہیں کہ مودودی ہی کی وہ واحد شخصیت ہے، جو پاکستان میں مطلوبہ اسلامی دستور کے وضع و ترتیب پر قدرت رکھتی ہے اور وہی اتنی دقت نظر اور مہارت رکھتے ہیں کہ اس دستور کو کتاب و سنت، شریعت کے مقتضا، تشریع اسلامی کے مقاصد عامہ اور امت کے متفق علیہ اصولوں سے مستنبط اور منطبق کر سکیں۔

مودودیؒ کی شخصیت کسی ایک ملک اور کسی ایک خطہ زمین کے لیے نہیں بلکہ وہ پوری دنیا کے سارے مسلمانوں کو فیض رسانی کے لیے عالمِ اسلام کی ایک امانت ہے۔''

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

صاحبِ ترجمان القرآن کا تعارف ناظرین سے کرانا تحصیل حاصل ہے۔ ان کی دقتِ نظر، نکتہ سنجی، بہترین خدمت دین کا ذکر ان صفحات میں بار بار آچکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دورِ حاضر کے فتنوں کے سد باب میں ابوالاعلیٰ صاحب کا سینہ خاص طور پر کھول دیا ہے اور تجدد زدہ گروہ کے حق میں ان کے قلم کی ایک ایک سطر آبِ حیات ہے۔ طبقہ علما میں مولانا کی ذات اس حیثیت سے بہت ہی بلند و ممتاز ہے کہ وہ صحیح معنوں میں مفکرِ ملت ہیں۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی سلیم فطرت، متوازن دماغ اور گہری نظر پر مجھے ہمیشہ اعتماد رہا ہے۔ وہ ایک خداداد سلیقے سے سرفراز ہیں۔ مسائل میں ان کی نظر محیط اور ہمہ گیر واقع ہوئی ہے۔ بحث کا مشکل سے ہی کوئی ایسا پہلو باقی رہ جاتا ہے، جسے ان کے قلم نے تشنہ چھوڑا ہو۔ طرزِ ادا دل نشین، طریقہ تعبیرِ دل آئینہ۔ اس کے ساتھ ان کی فطرت کی بلندی کی شہادت تو متعدد بار ادا کر چکا ہوں۔ خود خاکسار نے مولانا عبدالباری کی رفاقت میں مولانا سے جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری کی طرف ایک دفعہ نہیں بار بار توجہ دلائی، لیکن جس وقت ان کے مالی ذرائع تقریباً صفر کی حیثیت رکھتے تھے، انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ مولانا نے ہم لوگوں کے مشورے کو مسترد فرمایا۔ غنا قلب کے مقامِ رفیع پر، جو اپنے قدم استوار کر چکا ہو، اور ذہنی اور دماغی اور تحریری و انشائی حیثیت سے ان خداداد خصوصیتوں کا مالک ہو۔ زیادہ عرض کرنے کی تو جرأت نہیں کرتا لیکن میں اتنا عرض کردوں کہ حق تعالیٰ نے مودودی کے ساتھ، جو غیر معمولی فیاضیاں فرمائی ہیں اور ایمان کی، جو راسخ قسم کی روشنی کم از کم مجھے ان کے سینے میں جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہے، محمد رسول اللہؐ پر بے اتھاہ اور بے لاگ اعتماد کی دولت سے وہ سرفراز فرمائے گئے ہیں۔ نیز اسی کے ساتھ مختلف قسم کی اچھی اچھی قابلیتوں کے شباب عاملین ان کے اِردگرد جمع ہو گئے ہیں۔ ان تمام ایمانی و علمی و ذہنی قوتوں کے ساتھ الدعوت الی سبیل اللہ کو نصب العین بنا کر اگر وہ کھڑے ہو جائیں گے اور اردو، انگریزی اور ہندی زبانوں میں کچھ دن یہی کام کیا گیا تو ممکن ہے کہ قبول کرنے میں لوگ جلدی نہ کریں۔ لیکن اسلام جن فطری سوالوں کا جواب ہے، کم از کم قلوب میں ان سوالوں کے شعلے تو بھڑک اٹھیں گے۔

مولانا قاری محمد طیبؒ

مولانا مودودی نے اسلامی اجتماعیات کے بارے میں نہایت مفید اور قابلِ قدر ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ اس دورِ خلط و اختلاط اور تلبس والتباس میں، جس بے جگری سے انھوں نے اسلامی اجتماعیات کا تجزیہ اور تنقیح کر کے جماعتی مسائل کو صاف کیا ہے، وہ انھی کا حصہ ہے۔ میں انھیں اسلامی اجتماعیات کا ایک بہترین سیاسی مفکر سمجھتا ہوں اور اجتماعیات کی حد تک انھیں ایک بہترین اسلامی لیڈر مان کر ان کی تقریروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا اسلوبِ تحریر، محکم استدلال، اصولی و بنیادی طریقِ بحث اور سب سے بڑھ کر ان کی سلامتِ فکر ہماری افتادِ طبع اور ذہنی ساخت کے عین مطابق ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قلم اپنی خداداد قدرت و قابلیت کے ساتھ ہماری بے زمان ذہن و ذوق کی ترجمانی کر رہا ہے۔ وہ وقت کبھی نہیں بھولتا جب ندوہ کے مہمان خانے کے سامنے، جو دار العلوم کی مسجد کے پہلو میں ہے، ہم چند دوستوں نے محرم ۵۶ھ کے ترجمان القرآن کے اشارات پڑھے تھے، جن میں آنے والے طوفان کی خبر دی گئی تھی۔ یہ مولانا کا وہ ولولہ انگیز مضمون تھا، جس کی بازگشت عرصے تک سنی جاتی رہی۔ ہم سب لوگوں نے مولانا کی فراست، خطرے کی صحیح نشان دہی اور قوتِ تحریر کی دل کھول کر داد دی۔ اس کے بعد بھی مولانا کے جو مضامین شائع ہوتے رہے، ہمارا ذہن و ذوق ان کو اچھی طرح ہضم کرتا رہا۔

مولانا محمد منظور نعمانیؒ

مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کی خدمات اور حسنات میں، جس چیز کی اس عاجز کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت اور قدر رہے، وہ یہ ہے کہ ہزاروں بلا مبالغہ ایسے نوجوان ہوں گے، جو مغربی تعلیم اور اس کی تعلیم گاہوں کی الحاد پرور فضا کے اثرات سے تشکیک اور بے یقینی کی بیماری میں مبتلا ہو کر اسلام سے بالکل نکل چکے تھے یا نکل جانے والے تھے اور اس حال میں مرجانے کی صورت میں بلاشبہ جہنم میں خدانخواستہ ان کا ٹھکانا ہونے والا تھا۔ لیکن مولانا مودودی کی تحریروں نے اور جماعت اسلامی کی دعوتی سرگرمیوں نے ان کو نہ صرف پھر مسلمان بنا دیا بلکہ ان میں سے بہت سوں کا تعلق دین سے اتنا گہرا ہو گیا اور ان کی عملی زندگی میں دین کا ایسا رنگ آ گیا کہ بہت سے پشتینی اور موروثی دین دار اِن سے سبق لیں اور عبرت حاصل کریں۔

پروفیسر الفرائڈ اسمتھ

مولانا مودودی نے عصر حاضر کی اسلامی فکر پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں اور ان کی جماعت پاکستان کی نمایاں ترین طاقتوں میں سے ایک ہے۔ اس تحریک نے بہ نفسہٖ جو لٹریچر پیدا

کیا ہے وہ بہت ضخیم اور وسیع ہے یہ لٹریچر زیادہ تر اردو زبان میں چھپا ہے۔ تاہم اس کے عربی اور انگریزی تراجم بھی روز افزوں سرعت کے ساتھ میسر آنے لگے ہیں۔ مودودی صاحب کا نمایاں ترین امتیاز ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے خیالات کو آہستہ آہستہ اور بڑے تسلسل سے ایک مربوط اور پرکشش نظامِ حیات کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ مودودی صاحب عصرِ حاضر میں اسلام کے متعلق بڑے منظّم اور بااصول انداز میں سوچنے والے مفکر معلوم دیتے ہیں۔ انھوں نے اسلام کو ایک نظام میں ڈھالنے کے جدید رجحانات کو پیرایۂ اظہار عطا کیا ہے۔ مودودی صاحب پہلے آدمی ہیں، جو اسلامی قانون کو زمانۂ حاضر کا ایک مثبت اور قابلِ عمل نظام بنا کر پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے اسلام کو ایک نظامِ حیات کی صورت میں پیش کیا ہے، جس نے آج سے صدیوں پہلے بعد میں آنے والے ہر زمانے میں بنی نوعِ انسان کو پیش آنے والے مختلف مسائل کے متعین جوابات فراہم کر رکھے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام کوئی ایسا مذہب نہیں، جو ہر نئی صبح کے ساتھ انسان کو اپنے مسائل کا خود ہی حل ڈھونڈنے کے لیے ایک نیا خدائی علم عطا کرنے کا ایک نیا جھنجھٹ مول لیتا ہو۔ جس نظامِ فکر کو انھوں نے بتدریج استوار کیا ہے، اس کا ماخذ اسلام کا ابتدائی عہد ہے، جو گویا اس نظام کی عمارت کی اساس فراہم کرتا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے کافی حد تک جدید نظریات اور افکار سے بھی استفادہ کیا ہے اور یہی وہ مقام ہے، جہاں مودودی صاحب اپنے روایت پسند کٹر قسم کے ہم عصر علما سے بہت مختلف نظر آتے ہیں۔

علاّمہ سید سلیمان ندویؒ

میں اس وقت ایک نوجوان لیکن ایک بحرِ ذخّار کا تعارف آپ حضرات کے سامنے کرانے کے لیے کھڑا ہوں۔ مولانا مودودی سے علمی دنیا پورے طور پر واقف ہو چکی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ آپ اس دور کے متکلم اسلام اور ایک بلند پایہ عالمِ دین ہیں۔ یورپ سے الحاد و دہریت کا جو سیلاب ہندستان میں آیا تھا، قدرت نے اس کے بند باندھنے کا انتظام بھی ایسے ہی مقدس اور پاک طینت ہاتھوں سے کرایا ہے، جو خود یورپ کے قدیم و جدید خیالات سے نہایت اعلیٰ طور پر کماحقہٗ واقفیت رکھتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی قرآن و سنت کا اتنا گہرا اور واضح علم رکھتا ہے کہ موجودہ دور کے تمام مسائل پر اس کی روشنی میں تسلی بخش طور پر گفتگو کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ملحدوں اور دہریوں نے اس شخص کے دلائل کے سامنے ڈگیں ڈال دی ہیں۔ یہ بات

واضح طور سے کہی جاسکتی ہے کہ مودودی سے ہندستان اور عالمِ اسلام کے مسلمانوں کی بہت سی توقعاتِ دینی وابستہ ہیں۔

بیگم مولانا مودودی[1]

میں کئی پشت سے دلّی جیسے شہر میں رہنے کی وجہ سے شہری زندگی کی عادی تھی۔ جب مولانا حیدر آباد سے دار الاسلام منتقل ہوئے تو میری زندگی کے لیے ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔ گاؤں کا سادہ گھرانا، بجلی، نہ نل نہ دوسری سہولتیں۔ یہ بڑا صبر آزما مرحلہ تھا۔ ایک دفعہ ہمارے پاس لکڑی نہ تھی مولانا صبح ناشتہ کرکے دفتر چلے گئے۔ میں حیران بیٹھی تھی کہ کیا کروں۔ گھر آئے تو کہا کیا بات ہے میں نے کہا لکڑی نہیں ہے۔ آپ نے کہا بس اتنی سی بات کے لیے پریشان ہو یہ کہا اور ہاتھ میں کلہاڑی اٹھا کر باہر چلے گئے۔ گھر کے سامنے بغیر چری لکڑی پڑی تھی خود جا کر پھاڑنے لگے۔ ابھی انھوں نے ایک دو ہاتھ ہی مارے تھے کہ آس پاس کے کئی آدمی دوڑے ہوئے آئے اور آن کی آن میں لکڑی کا ڈھیر لگ گیا۔ اسی طرح ایک روز پانی بھرنے والا کسی وجہ سے پانی نہیں لایا۔ گرمی سخت تھی، مولانا گھر میں آئے تو میں پریشان بیٹھی تھی۔ پوچھا کیا بات ہے میں نے کہا پانی نہیں ہے، سنتے ہی دو بالٹیاں اٹھا کر کنویں پر پہنچ گئے اور پانی بھرنا شروع کیا۔ لوگ دیکھتے ہی دوڑ پڑے اور ذرا سی دیر میں پانی ہی پانی تھا۔ مولانا کا طرزِ عمل گھریلو زندگی میں وَان تعفو اقرب للتقوی و لا تنسو الفضل بینکم رہا ہے، جو لوگ اپنی خانگی زندگی میں اصلاح اور مسرت چاہتے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ خود حدود اللہ کے مستقل مزاجی سے پابند ہوں اور آپس میں تجارتی لین دین کا معاملہ کرنے کی بجائے احسان سے کام لیں۔

مولانا ملک غلام علی (مولانا مودودی کے خصوصی معاون)

مولانا کے ساتھ چند ماہ رہ کر ہی میں نے محسوس کرلیا تھا کہ آپ کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ مولانا کی خدمت میں تھوڑا ہی عرصہ رہ کر میں نے یہ واضح طور پر محسوس کرلیا کہ وہ اپنے باطن میں اپنے ظاہر سے بھی اور اپنی خلوت میں اپنی جلوت سے بھی زیادہ بہتر و برتر ہیں۔ ان کا دل اسلامی محبت واخوت اور انسانی دل سوزی اور شفقت کے گہرے جذبات سے بھرپور ہے۔

---

(۱) یہ اقتباس محض مولانا مودودی کی زندگی کی ایک داخلی جھلک پیش کرنے کے لیے دے دیا گیا ہے۔ (ا،گ)

مولانا امین احسن اصلاحی

میں مودودی صاحب کو ایک بڑا اور بہت بلند آدمی سمجھتا تھا۔ ایسے آدمی کم پیدا ہوتے ہیں۔ مگر آج تک میں ان کو اتنا بڑا نہیں سمجھتا تھا جتنا وہ آج بڑے ہو گئے تھے مجھے اس کا کبھی اندازہ نہیں تھا کہ خدا نے ان کے لیے ایک ایسی سعادت مخصوص کر رکھی ہے کہ وہ اس کے دین کی راہ میں ایک دن پھانسی کی سزا پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہزار ہا ہستیوں میں سے چن کر ایک اونچے مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔

آغا شورش کاشمیریؒ

مولانا جس مقام پر کھڑے ہیں، اب امتداد زمانہ کی گردشیں بھی انھیں اس مقام سے اتارنے پر قادر نہیں اور نہ ان کی علمی وجاہت اور دینی شامت اتنی ارزاں ہیں کہ ہر کہہ ومہ انھیں کانچ کی شیشیاں سمجھ کر کلوخ اندازی سے توڑ سکتا ہے۔ مولانا مودودی کے بارے میں ہمارے خیالات ہمیشہ سے والہانہ رہے ہیں۔ آج کے لوگ نہ جانیں، یا ان پر بہتان تراشی کر کے اپنے نامہ اعمال کو گندا کر لیں لیکن وہ دن ضرور آئے گا کہ جب یہ دنیا انھیں اسلام کے محسنوں میں شمار کرے گی اور وہ اس صف میں نظر آئیں گے جہاں ہمارے بڑے بڑے دینی اکابر کھڑے ہیں۔

محمد اکرم ملک پامسٹ

ہاتھ دیکھنے سے پہلے مودودی صاحب کے متعلق میرا یہ قیاس نہایت قوی تھا کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح ایک بلند پایہ انشاء پرواز اور ادیب ہیں۔ ان کی سائنٹفک اور عملی صلاحیتوں کے متعلق میری معلومات محدود تھیں مگر ہاتھ کے ذریعے، جو تعارف مجھے ان کی شخصیت کا ہوا ہے اور جو تغیر میرے قیاسات میں بعد ازاں واقع ہوا ہے، اسے میں فقط لفظ حیرت، سے تعبیر کر سکتا ہوں۔

مولانا عامر عثمانیؒ

مولانا مودودی ہی وہ شخص ہیں، جن کی ذہانت، انشا پردازی، فہم دین اور بے انداز خلوص وشوق نے نہ صرف پاکستان بلکہ تمام دنیاے اسلام کو ایک ایسا عظیم الشان لٹریچر دیا کہ اگر کوئی قدر داں ہو تو اس کے صلے میں ہفت اقلیم بھی کم ہیں اور اس زاویہ نظر سے اگر دیکھا جائے

کہ انھوں نے جدید علم وسائنس سے مسلح غالب وقوی مغرب کے قائم کردہ مضبوط محاذِ علم وفن کے مقابلے میں اسلام کا محاذ قائم کیا، اس اسلام کا جو اپنوں کی غفلت اور غیروں کی سطوت کے آگے زنگ آلود تلوار بنا پڑا تھا اور اس اسلام کا جس کے آب مصفا میں اشجار باطل کے لاتعداد گلے سڑے پتے اور گندگی کے انبار آمیز ہو گئے تھے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان کے پیش کردہ لٹریچر کا ایک ایک صفحہ موتیوں سے تولنے کے قابل ٹھیرے گا۔

مولانا ماہر القادریؒ

تری فکرِ رسا نے خاک کے ذرّوں کو چمکایا
کہ تو سچ مچ فلک سے چاند تارے توڑ کر لایا
تری فطرت میں ہے سنجیدگی بھی استقامت بھی
مسرت میں نہ اترایا، مصائب میں نہ گھبرایا
ترے سود و زیاں کا ہے رضائے دوست پیمانہ
کہ تو نے ہر قدم پر عشرتِ باطل کو ٹھکرایا

دعوت، مشن اور اس کے اثرات

امیر المومنین حضرت سیّد احمد شہیدؒ رائے بریلوی کی دعوتِ جہاد و نفاذ نظامِ اسلامی کے خاتمے کے بعد برصغیر ہند و پاکستان میں دعوتِ اسلامی کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔ سید جمال الدین افغانی کی تحریک ''پان اسلامزم'' بھی مسلمانوں کی رگوں میں حرارت کا ایک شعلہ بھڑکا کر سرد ہو چکی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی دعوت بھی چند ایام تک مسلمانوں کو گرمانے کے بعد رُخ بدل چکی تھی۔ علامہ اقبال اپنی دھیمی دھیمی آنچ سے مسلمان نوجوانوں کو سرگرم عمل کرنے کی سعی میں مصروف تھے، لیکن بہ ظاہر کسی منظّم دعوت کسی منضبط پیغام اور کسی مدلل اور دل نشین پکار کے اٹھنے کے امکانات دور دور تک نظر نہ آتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کی پکار نے جھنجھوڑا تھا۔ لیکن مسلمان عالم وحشت و حیرانی میں بے سمجھوں کی طرح ہر پکار پر کان کھڑے کرتا، چند قدم اس کے ساتھ چلتا اور پھر افسردہ دل ہو کر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ لوگ جو ایک دینی دعوت کے متمنی اور اقامت دین کے شیدائی تھے، انھیں اب یہ راستہ ویران اور ان کی امیدیں افسردہ نظر آتی تھیں۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ شاید امام مہدی سے پہلے اب اس دعوت کا علم کوئی لے کر اٹھنے کی ہمت نہ کر سکے گا۔

ایک مردِ خدا اُٹھا

لیکن مولانا مودودی نے ہمت کر ڈالی۔

''ترجمان القرآن'' کے تشویشناک مالی حالات کے باوجود عثمانیہ یونیورسٹی کی پروفیسری کی پیش کش اور انتہائی گریڈ کے مقابلے میں مولانا مودودی کے برادر بزرگ کے ۶ گھنٹے تک

سمجھانے اور قوم کی پست ہمتی اور پست خیالی کی حالت بتانے کے باوجود اس افہام و تفہیم کے جواب میں مولانا مودودیؒ نے کہا:

اب وقت ضائع کرنے کا وقت نہیں رہا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میری آواز میں خلوص ہوا تو میرا جذبہ ناکام نہ جائے گا۔

ان کے بھائی کا کہنا ہے کہ تقریباً ۶ گھنٹے تک اس موضوع پر اِن کی مودودی صاحب سے گفتگو ہوتی رہی۔ اس دوران میں مودودی صاحب کی آواز بھرا گئی اور انھوں نے اپنے بھائی سے کہا کہ

حالات بہت نازک ہو چکے ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ جو سیلاب آنے والا ہے، وہ ۱۸۵۷ کے انگریزی اقتدار کے سیلاب سے بھی کہیں زیادہ مہلک اور تباہ کن ہوگا۔ مسلمانوں کو اس خطرے سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ اپنی ہمت کے مطابق میں ان کی کچھ نہ کچھ خدمت کرنے کی ضرور کوشش کروں گا۔

چناں چہ مولانا مودودی نے اپنی قوم کی خدمت کرنے کا تہیّا کر لیا۔ ''ترجمان القرآن'' کے ذریعے مولانا مودودی نے تقریباً ۱۹۳۳ کے تعمیر افکار و اصلاح کردار کا کام شروع کر دیا۔ یہ ایک سخت جاں گسل، صبر آزما اور جگر دوز کام تھا، جو انھوں نے برسوں تک جاری رکھا۔ مالی مشکلات کے سنگین مراحل آئے، لیکن وہ ہمت و جرأت اور صبر و توکل کے ساتھ اس مشکل ترین راستے پر چلتے رہے۔ سب سے پہلے ایک طویل عرصے تک انھوں نے باطل کے پیدا کردہ نظامِ فکر اور بہ قول اقبال: ''حاضر و موجود پر'' سخت ترین تنقیدیں کر کے اس کا کھوکھلا پن نمایاں کیا۔ جو لوگ اس نظامِ فکر پر مطمئن تھے، انھیں غیر مطمئن کیا۔ جو غیر مطمئن تھے، ان کے سامنے مثبت لائحۂ عمل رکھ کر انھیں یکسو کیا۔ جو یکسو ہو گئے، ان میں اپنے اپنے ماحول میں فکر و عمل کی اصلاح کا شعور پیدا کر کے انھیں اصلاح احوال اور تبدیلی حالات پر تیار اور آمادہ کیا اور جو آمادہ ہو گئے انھیں ایک نظم و ضبط کے تحت سلیقے اور تندہی سے منظّم کام کرنے اور اجتماعی نتائج پیدا کرنے کا ڈھنگ سکھایا۔ یہ کام وہ مدت تک کرتے رہے۔ یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وطنی اور ملکی حالات نئے نئے تقاضے لے لے کر ان کے چاروں طرف منڈلاتے رہے۔ فوری علاج کے مطالبے اٹھتے رہے لیکن وہ پہاڑ کی طرح گرد و پیش سے بے نیاز مسلم قوم کی اصلاح کے ایک ہی پروگرام ''قرآن کو ہاتھ میں

لو، اپنی زندگی پر آزماؤ اور ساری دنیا پر چھا جاؤ" پر پیہم عمل کرتے رہے ان کا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ اسلام محض بہ طور فلسفہ حیات کے اپیل نہیں کر سکتا۔ وہ تو نظامِ زندگی ہے، جب تک اس کا نمونہ زندگیوں میں نظر نہ آئے گا، زبانی جمع خرچ کرتے رہنے سے اسلام کی کوئی خدمت نہ ہو سکے گی۔

قبرستان سے زندوں میں

علامہ اقبال کے اس مشورے پر کہ "جو دعوت آپ پیش کر رہے ہیں، یہ کسی سیاست سے اٹھنا سود مند نہیں ہے۔ انگریز والیِ ریاست کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلا سکتا ہے۔ اس لیے غلامی اور غلامی کے ماحول سے نکل کر آپ کو انگریزی علاقے میں آ جانا بہتر ہے۔" چناں چہ ان کی دعوت پر مولانا ۱۹۳۸ میں حیدر آباد دکن سے منتقل ہو کر پنجاب تشریف لے آئے اور ادارۂ دار الاسلام قائم کر کے اپنے مشن اور دعوت کے لیے مساعی کو تیز تر کر دیا۔

پنجاب کا ماحول اپنی سرکار پرستی کے باوجود مولانا کی دعوت اور مشن کے لیے بڑی حد تک سازگار رہا۔ یہاں لوگوں میں تجسس کا مادّہ تھا، ہر نئی شے کی ماہیت جاننے کی طلب تھی۔ اسلام سے پر جوش لگاؤ تھا اور سیاسی شعور بڑی حد تک حیدر آباد دکن کے مقابلے میں زیادہ بیدار تھا۔ اگرچہ انگریز پنجاب کو ہی اپنے لیے سب سے زیادہ محفوظ خطہ سمجھتا تھا۔ اس لیے کہ اسے یہاں سے فوج کے لیے عمدہ گیہوں اور عمدہ جوان ملتے تھے لیکن قوی جسم عموماً قوی دماغ اور قوی جذبات بھی رکھتے ہیں۔ اس لیے یہاں کے لوگوں نے مولانا کی دعوت پر زیادہ توجہ دی اور تجسس اور تفتیشِ احوال کا سلسلہ فوراً شروع ہو گیا۔ چناں چہ بقول مولانا مودودی:

"میں نے اچانک محسوس کیا کہ قبرستان سے منتقل ہو کر زندہ انسانوں کی بستی میں آ گیا ہوں۔ جو مجھ سے میرا مقصد، پروگرام لائحہ عمل اور طریقہ کار پوچھنے کی ضرورت محسوس کرتے اور اطمینان حاصل ہونے پر تعاون کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہیں۔"

دعوتِ اصلاح

مولانا کی دعوت اصلاح کا پروگرام چار نکات پر مشتمل ہے:

☆ تطہیر و تعمیر افکار

☆ اصلاحِ ذات

☆ اصلاحِ معاشرہ

☆ اصلاحِ نظامِ حکومت

کام کی ابتدا سب سے پہلے افراد کے خیالات وافکار کی اصلاح سے ہوتی ہے، جو بالآخر ذات کی اصلاح کے قوی داعیے پر منتج ہوتی ہے اور جب فرد فرد اس ذہنی انقلاب سے متاثر ہونے لگے تو یہ ایک عام رَو چل پڑتی ہے، جس کی تکمیل صرف اسی صورت میں ممکن ہے، جب نظامِ حکومت بھی اس اصلاحی کام میں معاون ومددگار ہو۔ مزاحم ومخالف نہ ہو۔ اس لیے اقتدارِ مملکت کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اسلامی انقلاب کے اصلاحی پروگرام کا بنیادی پتھر ہے۔ یہ اسلام کے بتائے ہوئے طریق اصلاح کا لازمی جز ہے، جس کے بغیر اصلاح کا تصور محض سراب ہے۔ لیکن یہ طریقِ کار چوں کہ صبر طلب ہے، اس لیے فوری نتائج کے طالب اور تھڑدلے لوگ اس راہ پر تھوڑی دور چل کر نکل بھاگتے ہیں، جیسا کہ مولانا نے خود ایک موقعے پر اپنی قوم کی اس بے صبری کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا:

''کسی ہنگامی کام کے لیے سینے پر گولی کھالینا ان کے لیے آسان ہے، لیکن کسی صبر طلب کام کے لیے چند ماہ تک بھی کسی ضابطے میں کس کر کام کیے چلے جانا ان کے لیے سخت مشکل ہے ان کی مثال جنگلی گھوڑے کی سی ہے۔

صدا بہ صحرا

مولانا نے ۱۹۳۳ سے لے کر ۱۹۴۱ تک انفرادی حیثیت سے شدید ترین مشکلات میں سے گزرتے ہوئے نو سال تک ابتدائی تطہیر وتعمیر افکار کا کام کیا۔ یہ شدید صبر آزما مرحلہ تھا۔ جب ان کے ساتھ کوئی ایک ساتھی بھی نہ تھا۔ نہ وسائل تھے، نہ ذرائع، نہ اسباب میسر تھے اور نہ رفقائے کار۔ یہ گویا کالے کوسوں کا قافلہ تھا، جو تنہا، پیدل اور خطرات کے جنگلات اور مزاحمتوں کے پہاڑوں میں سے ہو کر طے کرنا تھا۔ منزل دور اور ناپید تھی۔ حالات کے وسیع ناپید کنار سمندر میں اپنی ٹوٹی پھوٹی کشتی پر ایک پرانی دنیا سے نئی دنیا تک کا سفر تھا۔ پتوار ٹوٹے ہوئے اور تختے اکھڑے ہوئے تھے۔ بس ایک بازوؤں میں قوت، سینے میں عزم اور مالک کائنات کا سہارا تھا اور یہ سارا کام، جس قوم کے اندر ہو رہا تھا وہ ایسے کٹھن، کڑوے کسیلے اور مشکل کام کے لیے چند افراد

بھی اپنے اندر سے پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم نظر آتی تھی، سات سال تک بادیہ پیمائی کے بعد راہِ حق کے اس مسافر کے ذاتی تجربات کا حال یہ تھا:

''جس جنون میں مبتلا ہوں اس کا مجنوں مجھے کہیں نہیں ملتا برسوں سے جن لوگوں تک اپنے خیالات پہنچاتا رہا ہوں ان کے بھی جب قریب جاتا ہوں تو وہ مجھ سے دور نظر آتے ہیں، ان کی دھن میری دھن سے الگ ان کی گرویدگیوں کے مرکز میرے مرکز گرویدگی سے جدا ان کی روح میری روح سے ناآشنا، ان کے کان میری زبان سے بیگانہ یہ دنیا کوئی اور دنیا ہے، جس سے میری فطرت مایوس نہیں۔''

لیکن بالآخر یہ صحرائے اعظم طے ہوا اور ۹ سال کی جگر کاری کے بعد وہ منزل آئی۔ جب مولانا نے اپنے ہم خیال لوگوں کو ہندستان کے ہر گوشے سے آواز دی پہلی بار کروڑوں کی آبادی میں سے کل ۷۵ افراد جمع ہوئے۔ جنھوں نے ۲۶/اگست ۱۹۴۱ کو مولانا کے ساتھ رفاقت اور ہم مقصدیت کا عہد کر کے اجتماعی طور پر اس دعوت اور مشن کو اٹھانے، پھیلانے اور قائم کرنے کا بیڑا اُٹھایا، جس دعوت اور مشن کو مولانا تنہا لیے چلے جارہے تھے۔ یہ خالص تنقید و تلقین کا مرحلہ تھا اور خطاب خالص مسلمانوں کے صاحبِ فکر وفہم طبقے سے تھا۔ اگست ۱۹۴۷ تک صرف ۶ سال کے مختصر عرصے میں ملک کے طول و عرض میں ہر بڑے شہر میں مولانا کی دعوتِ اسلامی سے متاثر لوگوں کے تبلیغی حلقے منظّم ہو گئے۔ تقسیم کے وقت لاکھوں متاثر افراد کے علاوہ وہ لوگ، جنھوں نے اس اصلاحی دعوت کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالنے، اپنے سارے معاملات کو خدا اور رسولؐ کے احکام کے مطابق انجام دینے، طاغوت سے کلی طور پر اجتناب کرنے اور کفر و باطل کی عدالتوں سے جہاں غیر الٰہی قوانین کی عمل داری تھی۔ کلی عدم تعاون کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ ان کی تعداد بھی سوا چھ سو سے زائد ہو چکی تھی۔ ہفتہ وار تبلیغی اجتماعات اور اصلاحی تبلیغی حلقے جا بجا قائم تھے، جو نوجوانوں میں اسلام کا صحیح شعور پیدا کرنے میں مصروف تھے اور سچی دین داری کی لگن پیدا کر کے مسلمانوں میں دین کے لیے تن من دھن لگانے کا داعیہ پیدا کر رہے تھے۔

لٹریچر

حقیقت یہ ہے کہ مولانا مودودی نے، جو اسلامی لٹریچر تیار کیا ہے وہ ہیرے جواہرات میں ٹکنے کے قابل ہے۔ ہیرے اور جواہرات انسانوں کے گلے میں چمک دمک دکھا کر فنا ہو جاتے

ہیں لیکن مودودی صاحب نے جو لٹریچر تیار کیا ہے وہ انسانوں کے سینوں میں اسلام کی مستقل شمع روشن کر دیتا ہے، جو پھر کبھی نہیں بجھتی۔ یہ انسان سازی کا کام ہے، جو مودودی صاحب گزشتہ رُبع صدی سے انجام دے رہے ہیں اور ایسے لٹریچر کے ذریعے انھوں نے ایک عظیم خاموش انقلابی جدوجہد شروع کر رکھی ہے، جس کا توڑ نہ جیل ہے نہ پھانسی ہے اور نہ ڈنڈا ہے انھوں نے اپنی تصانیف کے زور سے لاکھوں دلوں میں اسلام کی گہری محبت اور روشنی پیوست کر دی ہے اور ان کی زندگیوں کا رُخ بدل دیا ہے انھوں نے لٹریچر کی اس چھلنی سے کروڑوں کی آبادی میں سے چھانٹ چھانٹ کر کام کے آدمی نکالے ہیں، جن کو وہ اپنے مشن کے لیے کام میں لا سکتے ہیں۔ انھوں نے مدت سے قائم شدہ جمود توڑا ہے اور منجمد، افسردہ اور بے مقصد دلوں کو متحرک، پر جوش اور با مقصد بنایا ہے۔ انھوں نے ہزاروں آدمیوں سے غلط کاروبار چھڑوا دیے ہیں۔ ضمیر کے خلاف ملازمتوں سے نکلوایا ہے۔ رشتے اور ناطے، جو مقصدِ زندگی کی راہ میں حائل تھے انھیں تڑوایا ہے اور اپنے انقلابی قلم اور مشن کی قوت سے دلوں میں اسلام کے لیے گہرا جذبۂ محبت وایثار وقربانی پیدا کر دیا ہے اور یہ کام انھوں نے اپنی ساری زندگی کا سرمایہ اس میں کھپا کر سرانجام دیا ہے۔ ان کے سیاہ بال آج سفید ہو گئے ہیں اور مضبوط دانت بقول ان کے پتوں کی طرح جھڑ رہے ہیں۔ لیکن ان کی کمر میں اب بھی اتنا کس بل ہے کہ اسلامی نظام کی جدوجہد کے لیے بڑی سے بڑی رکاوٹ سے لڑ جائیں اور دین وایمان، جس اقدام کا مطالبہ کریں، عقل وضمیر کی روشنی میں اس کے لیے اپنا سب کچھ نثار کر دیں۔ ان کی اب تک ۷۳ سے زائد تصانیف ہیں، جن میں ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی تفہیم القرآن سے لے کر ۴۰ صفحات پر مشتمل ''اسلام کا نظریۂ سیاسی'' تک شامل ہیں۔

چند اہم خصوصیات

مولانا مودودی کی دعوت اور مشن کی بعض خصوصیات نہایت اہم ہیں۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اسلام کو ایک منجمد قدیم نسلی مذہب کے بجائے ایک انقلابی نظریۂ حیات اور ایک تحریک کی صورت میں پیش کیا ہے اور اس کے لیے انھوں نے سب سے بڑا استدلال خود اسلام کے نظامِ فکر کے اندر سے اندرونی شہادت کے طور پر فراہم کیا ہے۔ قرآن کی ولولہ انگیز آیات اس انقلابی تصورِ دین پر گواہ ہیں۔ حضورؐ کی پوری زندگی اس پر شہادت ہے۔ صحابہ کرامؓ کی جدوجہد اس

پر گواہ ہے اور خلافتِ راشدہ کا درخشاں دور اس پر گواہ ہے۔ مولانا مودودی نے قوتِ بیان اور لچھے دار الفاظ کے تانے بانے کے زور سے بات بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ پیش پا اُفتادہ حقائق کو جنھیں صدیوں کے انحطاط سے مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ جھاڑ پونچھ اور نکھار کر ملت کے سامنے رکھ دیا ہے۔ یہ چوں کہ ملت کے دل کی آواز ہے، اس لیے اس کے خلاف دلیل سے کوئی بات کرنا مشکل ہے۔ مخالفت کے لیے دائیں بائیں ہاتھ پاؤں مارے جا سکتے ہیں لیکن رو در رو بات کر کے اسے رد کرنا حقائق کو جھٹلانا ہے، جو کسی بھی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا مودودی کی مخالفت، جس گوشے سے بھی ہوئی ہے، کوئی معیاری، علمی، فکری استدلالی مخالفت نہیں بلکہ گھٹیا، پوچ، ذاتی شخصی اور الزامی مخالفت ہوئی ہے، جو خود اپنی کمزوری پر آپ گواہ ہوتی ہے۔ یہ بات بہر حال اپنی جگہ مسلّم ہے کہ مولانا مودودی کی خشک دعوت کا چہرہ ان کے اعلیٰ ادبی معیار نے بہت کچھ نکھارا اور دلکش بنایا ہے۔ یہ اسی خوبی کا حقیر سا حصہ ہے، جس کا دعویٰ قرآن پاک نے اپنے لیے بڑے پیمانے پر کیا ہے۔

اس دعوت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اسلام کے چہرے کو بالکل نکھار کر پیش کر دیا ہے۔ اسلام کے گوشے گوشے پر روشنی ڈالی ہے، اسے موجودہ حالات پر منطبق کر کے دکھایا ہے۔ موجودہ سائنسی دور کے مذہب پر تمام ممکن اعتراضات کا مدلل جواب دیا ہے۔ اسلامی نظام کا ایک مکمل فکری اور علمی محل تیار کر دیا ہے، جس کی اینٹ اینٹ اور چوکھٹ چوکھٹ اپنی اپنی جگہ فٹ، متناسب اور موزوں لگی ہوئی ہے، کوئی حصہ نامکمل اور ادھورا نہیں ہے اور وہ اپنے قاری کی انگلی پکڑ کر اسے اسلامی نظامِ حیات کے اس محل کا گوشہ گوشہ دکھا دیتے ہیں۔ معاشرتی، سیاسی اقتصادی، تہذیبی، قانونی، تمدنی، زرعی، صنعتی، اخلاقی غرض زندگی کے تمام گوشوں میں اسلام کی پالیسی کو وہ استدلال سے بیان کرتے ہیں اور سمجھنے والوں کے الجھاوے دور کر کے انھیں یقین و عمل کی آخری منزل تک پہنچا کر دم لیتے ہیں۔ اسلام کے جدید تقاضے کیا ہیں اور جدید دور کے اسلام سے کیا تقاضے ہیں، ان سوالات کا مفصل جواب مولانا مودودی دیتے ہیں۔ وہ کمیونزم کو بھی استدلال کے زور سے غلط نظریہ ثابت کرتے ہیں۔ وہ سرمایہ داری کو بھی مہلک ترین تصورِ حیات بیان کرتے ہیں۔ وہ فاشزم، سوشلزم، لبرلزم غرض سارے ہی ازموں کو بنی نوعِ انسان کے لیے انتہائی مہلک سمجھتے ہیں اور ان کا یہ سمجھنا کسی کٹ ملّا کا سمجھنا نہیں ہے، جو محض تعصبات کی بنا پر ہر

جدید کو رد کرتا ہے اور نہ ان کا یہ سمجھنا کسی ''یورپی کٹ مسٹر'' جیسا سمجھنا ہے، جو ہر قدیم کو تعصّبات کی بنا پر رد کرتا ہے بلکہ ان کی ہر بات مدلل، جامع اور افہام وتفہیم کا وسیع دامن اپنے اندر رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ذہین طبقہ اُن سے بہت متاثر ہوا ہے اور اگر اب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اسلام کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالے بغیر اسے اپنانا مشکل ہے یا جدید دور کا یہ چیلنج ہے کہ اسلام کو جدید تقاضوں کے مطابق پیش کیا جائے یا یہ کہ جب تک اسلام جدید سائنسی دور کے سوالات کے مدلل اور تشفی بخش جوابات نہ دے اس کی زندگی مشکل ہے، تو ایسا شخص سوائے اپنی جہالت کے اظہار کے اور کوئی نئی بات نہیں کہتا۔ اس لیے کہ مولانا مودودی نے جدید دور کے ان جدید تقاضوں کا تسلی بخش جواب اپنے لٹریچر میں جابجا پیش کر کے اسلامی نظامِ حیات کی عمارت کا وہ مکمل ترین نقشہ پیش کر دیا ہے کہ اگر کسی معمار میں دیانت خلوص اور قربانی کا جذبہ ہو تو وہ اس نقشے کے مطابق پوری اسلامی زندگی کی عمارت کھڑی کر سکتا ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ مولانا مودودی نے یہ بات حتمی طور پر ثابت کر دی ہے کہ اسلام کوئی محض پوجا پاٹ کا مذہب نہیں ہے کہ سیاست اس سے آزاد ہو بلکہ زندگی کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں ہے، جو اسلام کی گرفت سے آزاد اور باہر ہو۔ اسلام پورا نظامِ زندگی ہے اور سیاست اس زندگی کا ایک شعبہ ہے۔ جب تک اس شعبے کو اسلام کے تابع نہ کیا جائے اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً کا صحیح تقاضا پورا نہیں ہوتا۔

اس دعوت کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ کوئی اندھی بہری قوت نہیں ہے، جو زور یا فتوے یا کسی عقیدت کے بل پر آگے بڑھتی چلی گئی ہے بلکہ یہ سب سے پہلے مخاطب کے فہم کو مطمئن کرتی اس کے ضمیر کو بیدار کرتی اور اس کے جذبات کو اپیل کرتی ہے۔ ان تینوں پہلوؤں سے متاثر کرنے کے بعد وہ مخاطب کو اپنے پیغام کے لیے فتح کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص اس کی طرف آتا ہے وہ ذہن سے قائل، ضمیر سے مطمئن اور دل سے متاثر ہو کر آتا ہے۔ پھر اسے کام کرنے کے لیے اکساتے، اُبھارتے اور تیار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ بھی دعوت کو اختیار کرتے ہیں وہ اسے اپنی دعوت اپنا نصب العین اور اپنا مقصدِ زندگی سمجھ کر اختیار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ کوئی عارضی سیاسی مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ ان کے لیے یہ دین وایمان کا معاملہ، عقیدے کا مسئلہ اور آخرت کی زندگی کا عین تقاضا ہوتا ہے اور انھیں اس سے باز رکھنے کے لیے

کوئی قوت، زور یا دھونس اور دھاندلی کافی نہیں ہوتی۔ سوائے اس کے کہ ان کو ذہنی طور پر اس دعوت سے منحرف کر دیا جائے۔

چند نمایاں اثرات

مولانا مودودی کی دعوتِ اسلامی نے ہماری ملکی زندگی میں گزشتہ برسوں میں نمایاں اثرات چھوڑے ہیں، جن میں سے ہر اثر اپنی بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے۔

سب سے پہلے مولانا مودودیؒ نے انتخابات کے اندر صالح نمائندگی کا تصور پیش کیا۔ اس سے پہلے یہ تصور چلا آ رہا تھا کہ ہر وہ شخص، جو دھاندلی اور غنڈہ گردی میں بڑے بڑے غنڈوں کو مات دے جائے وہی نمائندۂ عوام ہو۔ اس طرح قوم کا بدترین عنصر چھٹ کر اوپر آ جاتا تھا لیکن مولانا مودودی نے سیاسی زندگی کو پاکیزہ کرنے کے لیے یہ تصور پیش کیا کہ امیدواری کا طریقہ ختم کیا جائے۔ اس لیے کہ امیدوار اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لیے بہت کچھ غلط اور اخلاق سے فروتر حرکات کرتا ہے، اس کے مقابلے میں صالح نمائندے کی چند اخلاقی صفات پیش کر دی جائیں جو دیکھ کر ووٹر بے لاگ طور پر اپنا ووٹ استعمال کریں۔ یہ تصور نمائندگی، سیاست کو پاکیزہ کرنے کے لیے بہترین طریقہ کار ہے۔ بہ شرطے کہ عوام میں اس کا کلی شعور پیدا کر دیا جائے اور حکومت کے انتخابی قوانین اس تصور کے نفاذ کے لیے قانونی پوزیشن کو مضبوط کریں۔

دوسرا اثر مولانا مودودی نے یہاں کی سیاست پر ڈالا ہے۔ ہماری سیاست یورپ کی سیاست کا چربہ ہونے کے سبب ہر طرح کے گندے کھیلوں کا نمونہ چلی آتی ہے۔ یہاں تک کہ یہ تصور عام ہو گیا تھا کہ ایک شریف آدمی کا کیا کام ہے کہ وہ سیاست کے گندے کھیل میں حصہ لے خود مولانا مودودی کو ضرورت سے زیادہ ذہین اور عقل مند بہی خواہوں نے ان کو بار بار یہی مشورہ دیا کہ وہ اپنی مقدس ہستی کو اس گندے کھیل سے محفوظ رکھیں۔ اس لیے کہ اس سے ان کے وقار اور مقام کو صدمہ پہنچتا ہے لیکن مولانا نے اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے، کہ سیاست میں بھی راست روی، راست گوئی، حق پرستی، وفاداری اور اصول پر استقامت عین ممکن ہے اور یہ انھوں نے گزشتہ برسوں میں اپنے عمل سے کر کے بھی دکھایا ہے۔ نتیجتہً اب بڑے بڑے جغاوری پرانے لیڈر بھی وہی خدا پرستی اور اصول پرستی کی بولیاں بولنے پر مجبور ہو گئے ہیں، جن کا سبق مولانا مودودی نے بازارِ سیاست میں دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسے لوگوں کی ان بولیوں کا مفہوم لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ کوئلوں پر اشرفی کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔

حق گوئی اوراس پر استقامت، قید و بند اور پھانسی کے پھندے اور موت کے مقابلے میں بھی اپنے اصول پر قائم رہنا، یہ وہ مثال ہے جو مولانا نے بے اصول سیاست کی اس وادی میں پیش کی ہے، جس کا تصور بھی اس وادی کے دوسرے راہرو یا لیڈر زا اپنے ذہن میں نہیں رکھ سکتے۔ مولانا مودودی کی اس دعوت نے یہاں کے ادب پر بھی اثرات ڈالے ہیں۔مولانا خود ایک بلند پایہ ادیب ہیں اور ان کا ادب ہی ایک ایسی چاشنی ہے، جس کی مدد سے آدمی ان کی کتب کا جو خشک ترین موضوعات پر ہوتی ہیں، نہایت ذوق وشوق سے مطالعہ کر جاتا ہے۔ان کے ادب کے زور سے ہمارے اردو ادب میں پاکیزہ تعمیری اور اخلاقی ادب کی ایک رَو چل پڑی ہے، جو کبھی تعمیری ادب کہلاتی ہے، کبھی اسلامی ادب لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے قلم نے پورے میدانِ ادب و صحافت کو متاثر کیا ہے۔ان کی دیکھا دیکھی ان کے اثرات کے تحت بے شمار نئے نئے لکھنے والے انھی کے نظریۂ حیات کی نمایندگی کرتے ہوئے سامنے آگئے ہیں۔ نئے نئے شاعر اپنی دل فریب پاکیزہ نظموں اور غزلوں کے ساتھ بزمِ شعر وادب میں غزل خواں نظر آتے ہیں۔اسلامی ادبی تصورات کی ایک رو ہے، جو پوری فضا میں چل پڑی ہے اور جسے ملک کا ہر شخص محسوس بھی کرتا ہے اور اس سے محظوظ بھی ہوتا ہے۔

مولانا کی دعوت نے جدید وقدیم دونوں طبقات کے تصورِ دین پر بھی نمایاں اثر ڈالا ہے جدید ذہن اسے ایک زائد از ضرورت زندگی کا پرائیویٹ معاملہ سمجھتا تھا۔قدیم ذہن اسے رسومات کا پختہ لگا بندھا ضابطہ سمجھتا تھا، جس سے سرِ مو تجاوز وانحراف انسان کو دوزخ کے گڑھے میں ڈالنے کے لیے کافی تھا۔مولانا مودودی نے دین کے ان دونوں تصورات کو درست کر کے اعتدال پر قائم کر دیا ہے۔دین اسلامی زندگی کا نام ہے اور اسلامی زندگی وہ ہے، جو حضورؐ نے دنیا کے سامنے پیش کی ہے۔بس یہی نجات کا سیدھا راستہ ہے کہ اسی زندگی کو بالفعل قائم ونافذ کیا جائے۔

طلبا جو مدت سے نئے نظامِ تعلیم کے پیدا کردہ اثرات کے تحت ایک سرکش اور بے پرواہ گروہ ہے۔مولانا کی دعوت نے ان کو بھی متاثر کر کے محتاط، ذمے دار اور اسلامی کردار کا حامل و مبلغ بنا دیا ہے۔چناں چہ ہزار در ہزار طلبہ اپنی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں نہ صرف ڈھالنے کی کوشش میں مصروف ہیں بلکہ وہی سانچا لے کر وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی اس میں ڈھالنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

علمائے کرام پر بھی اس دعوت کے بہت بہتر اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ پہلے فرقہ وارانہ تصورات اور مسائل کا بڑا چرچا اور شوروغوغا تھا۔ اسلامی زندگی کا کوئی ایک مستقل لائحۂ عمل نہ تھا۔ مولانا مودودی نے اسلامی نظام کے مطالبے کے ذریعے علماء کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی۔ چاہے علما اپنی انفرادیت پسندی کے سبب مستقل طور پر ایک پلیٹ فارم پر نظر نہ آئیں، لیکن اللہ نے ان کو اتنی توفیق ضرور دی کہ جب کبھی دین کا اجتماعی تقاضا سامنے آیا وہ فوراً یکجا ہوگئے اور اسلامی دستور کے بنیادی اصولوں، جیسے اہم ترین اور انقلابی کام کو جسے اسمبلی کے روشن خیال حضرات برسوں میں نہ سلجھا سکے، چند دنوں میں مرتب کر کے متفقہ طور پر پیش کر دیا۔

اس کے علاوہ بھی جب کبھی دین کا اجتماعی تقاضا سامنے آیا دین کی آبرو کا مسئلہ درپیش ہوا تو وہ سب ایک ہوگئے اور انھوں نے اس پرانی کہاوت کو واقعی ختم کر دیا کہ دو ملاؤں میں مرغی حرام ہوتی ہے، بلکہ اب تو یہ نئی کہاوت چل گئی ہے کہ ''دو وزیروں میں وزارت حرام ہوتی ہے'' یا ''دو مسٹروں میں رشوت حلال ہوتی ہے۔'' مولانا مودودی نے اس محاذ پر، جو خدمات انجام دی ہیں اس کا اعتراف چاہے کوئی کرے یا نہ کرے لیکن اسلامی تقاضوں کو اولیت کا رتبہ دینے اور تمام اختلافات کو وقتی طور پر پس پشت کر دینے کا جذبہ یقیناً ان کا پیدا کردہ ہے اور اگر یہاں ان کی اس خدمت کا اعتراف کرنے والا کوئی نہ ہوا تو آخرت میں ان کا ثواب ان کے مالک کے پاس ان شاءاللہ ضرور ہی محفوظ ہوگا۔

مولانا مودودی کی دعوت نے اخلاق، دیانت اور امانت کے تقاضوں کو بھی بہت نمایاں کیا ہے اور یہ عام احساس پیدا ہوگیا ہے کہ اصل قابلِ قدر چیز یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ان قیمتی صفات سے عاری ہوتے ہیں، وہ بھی اس کا مظاہرہ، اس کی نصیحت اور اسی کا بار بار وعظ کرتے نظر آتے ہیں۔

خدمت خلق کا رجحان عام بھی مولانا مودودی کے کیے ہوئے کام کا نتیجہ ہے۔ آج جو ہر طرف خدمتِ خلق کا تھوڑا بہت جذبہ پایا جاتا ہے وہ اس بات کا لازماً مرہون منت ہے کہ مولانا مودودی کے مشن کے علم برداروں نے ملک میں خدمتِ خلق کا نہایت شاندار ریکارڈ قائم کیا ہے۔ بے مزد خدمت، بے لاگ خدمت، بے اندازہ خدمت یہ کام اس سے پہلے زیادہ تر انھی لوگوں نے کیا، جو مولانا مودودی سے کسی نہ کسی طور پر متاثر تھے۔ اور آج خود امدادی (Self Help) کے

ذریعے، جو خدمت کا جذبہ عوام میں پایا جاتا ہے اُسے بہت کچھ وہاں سے غذا ملتی رہی ہے۔

سب سے بڑا اثر ملک کے اندر عوام و خواص میں قانون کی پابندی، آئین پسندی اور امن و امان کے جمہوری ذرائع سے کام کرنے کا جذبہ ہے، جو مولانا مودودی نے پیدا کیا ہے۔ وہ خود بڑے آئین پسند اور قانون کے پابند آدمی ہیں اور انھوں نے برسوں تک یہی تربیت یہاں کے عوام کو دی ہے۔ وہ ہر کام جمہوری ذرائع اور افہام و تفہیم اور دلیل کی قوت سے کرنے کے قائل ہیں۔ ڈنڈے کی دلیل کو نہ وہ تسلیم کرتے ہیں نہ پیش کرتے ہیں، نہ اس کے سامنے سر جھکاتے ہیں نہ اسے کسی معقول سوسائٹی میں پیش کرنے کے قابل سمجھتے ہیں۔ انھوں نے برسوں تک اپنے قلم و زبان سے اپنے مشن کے ماننے والوں اور اپنی دعوت کے علمبرداروں کو جمہوریت، مساواتِ قانون و آئین کی پابندی کا سبق دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جو تبدیلی جن ذرائع سے آتی ہے انھیں ذرائع سے اس کا ردِ عمل ابھرتا ہے۔ پستول کے زور سے لایا ہوا انقلاب کبھی دیرپا اور عوام میں مقبول نہیں ہو سکتا اور نہ عوام اس پر مطمئن ہو سکتے ہیں اور نہ یہ گارنٹی ہو سکتی ہے کہ اسے اسی پستول کی دلیل سے ہٹایا جائے گا۔ اس لیے یہ لازم ہے کہ عوام کے شعور کے اندر سے ایک تبدیلی ابھرے۔ ان کی رائے سے وہ تبدیلی بروئے کار آئے۔ ان کے ضمیر کی آواز سے وہ ہم آہنگ ہو اور ان کی خواہشوں سے وہ برسرِ اقتدار آئے۔ جب ایسی کوئی تبدیلی کسی معاشرے میں برپا ہو تو پھر اس کی حفاظت کے لیے سنگینوں کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی۔ عوام کے دل و دماغ اور بیدار ضمیر ہی اس کی حفاظت کے لیے کافی ہوتے ہیں۔

موافقین

مولانا مودودی کی اس دعوت کے بے شمار موافقین ہماری ملت میں پائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ، جو ان گنت تعداد میں ملک کے طول و عرض میں معلوم و نا معلوم مقامات پر پائے جاتے ہیں۔ سب سے پہلا موافق عنصر خود پوری قوم کا اجتماعی ضمیر ہے، جو ایک مدتِ دراز سے خلافتِ راشدہ کی بحالی کے لیے اس کے انتظار میں کشمکش کرتا چلا آ رہا ہے، جو لوگ اس نظامِ حیات کو لانے کا پختہ وعدہ کرتے ہیں ان کے وعدوں پر بھروسا کرتا اور ان کے لیے جان و مال کی بازی لگا دیتا ہے۔ اسلام کے لیے کام کرنے والوں کو اچھا سمجھتا، اس کی راہ میں مر جانے والوں کو

شہید تصور کرتا اور انھیں مرنے کے بعد رحمۃ اللہ علیہ کہہ کر یاد کرتا ہے۔ مولانا کی دعوت کی جڑیں ملت کے قلب وضمیر کی اسی گہرائی میں پیوست ہیں، جنھیں آسانی سے اکھاڑا نہیں جا سکتا۔ دوسرا موافق عنصر دنیا بھر کے مسلمانوں کے اندر اسلامی نظام کے لیے ابھرتا ہوا شعور ہے جو روز بہ روز بڑھ رہا ہے اور اس کے مطالبے کی مختلف آوازیں مختلف انداز سے ہر چہار طرف سے آرہی ہیں۔ تیسرا موافق عنصر علمائے امت اور انبیاے کرام کا کیا ہوا کام اور اس کام کے لیے مسلمانوں کے اندر احترام کا گہرا جذبہ ہے، جسے زمانہ کبھی بھول نہیں سکتا اور جس کے احترام سے ہر انسان کی گردن جھک جاتی ہے۔ چوتھا عنصر خود اس کے لیے کام کرنے والوں کا اعتماد، خلوص اور اس کی کامیابی کا قوی بھروسا ہے، جو یقین رکھتے ہیں کہ اللہ کے فرشتے، جنھوں نے حضرت ابراہیمؑ کی مدد کے لیے بھڑکتی چتا میں ہاتھ بڑھائے تھے، جو بدر میں لڑنے والوں کے پہلو بہ پہلو آکر لڑے تھے۔ وہ بہرحال اس دعوت کے معاون و مددگار ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ دعوت خود اللہ کو بھی اس زمین پر سب سے زیادہ محبوب کام ہے، جس کے لیے وہ اپنے محبوب ترین بندوں کو اٹھا کر کھڑا کرتا رہا ہے۔ ایسے موافقین کی حمایت میں مولانا مودودی اپنے مشن اور اپنی دعوت کے لیے زندگی کی آخری سانس تک کام کیے چلے جانے کا داعیہ لیے کام کیے چلے جا رہے ہیں اور ان کی نگاہیں اسی کی مدد پر جمی ہوئی ہیں، جس کا یہ کام ہے۔

بین الاقوامی شخصیت

مولانا مودودی ایک بین الاقوامی مشن کے داعی ہیں، وہ ایک فرد کی اصلاح سے لے کر ایک ریاست کی اصلاح تک اور پھر پوری بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود رہنمائی کا پروگرام رکھتے ہیں۔ اس طرح اپنے پیغام کی نوعیت کے اعتبار سے وہ بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ ربع صدی میں احیائے اسلام کے لیے، جو کام انھوں نے کیا ہے اور اس سلسلے میں، جن جن مراحل سے وہ گزرے ہیں، اس چیز نے انھیں اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے دنیا کی چند نمایاں ترین شخصیتوں میں لا کھڑا کیا ہے۔ وہ چند خصوصیات یہ ہیں:

انھوں نے اسلام کو دنیا کے دوسرے غالب نظاموں کے مقابلے میں ایک جامع نظامِ حیات کے طور پر اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کا ایک ایک گوشہ نہ صرف واضح اور منقح ہو کر سامنے آ گیا ہے، بلکہ دوسرے نظاموں کے مقابلے میں اس کی مدلل برتری بھی ثابت ہو گئی ہے اور اس کام میں دورِ جدید کے تقاضوں کو پورا پورا ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی متعدد تصانیف ہیں، جو انسانی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتی اور جدید مسائل کو اسلامی نکتہ نگاہ سے حل کرتی ہیں۔ ان تصانیف کے تراجم متعدد زبانوں میں ہو چکے ہیں اور مزید ہو رہے ہیں۔

ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ریاست کے جدید ترین نظم مملکت کو اسلامی خطوط پر چلانے کے لیے اسلامی دستور کا ایک واضح نقشہ مرتب کیا۔ اور نہ صرف یہ علمی کام کیا بلکہ جس ملک سے ان کا تعلق ہے وہاں انھوں نے اس دستور کے نفاذ کے لیے ایک زبردست جمہوری مہم چلائی، جو کم و بیش ۸، ۱۰ سال تک جاری رہی، جس کے دوران اس موضوع سے متعلق انھوں نے ہر شبے کا ازالہ کیا، ہر اعتراض کا جواب دیا اور ہر گوشے کو واضح کیا۔ اس مہم کے سبب ملک کے

عوام میں اسلامی دستور کا شعور بہت گہرا ہو گیا اور یہ دو حرفی بات ان کے دلوں میں اتر گئی کہ اسلامی دستور وہ ہے، جو کتاب وسنت پر مبنی ہو۔ اس دستوری مہم کی بازگشت مختلف اسلامی ممالک میں جابجا سنی گئی اور اس کی روشنی میں دیگر مسلم ممالک کے اسلام پسند عناصر نے بھی انھی خطوط پر اپنے ممالک میں دساتیر بنوانے کی کوششیں کیں۔

ان کی تیسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس مہم کے دوران انھیں اپنے ملک کے اربابِ اقتدار کو بھی بار بار متوجہ کرنا پڑا۔ جس کے نتیجے میں انھوں نے مولانا کو راستے سے ہٹانے کے لیے کبھی جیل کے دروازے کھولے اور کبھی پھانسی کے پھندے لٹکائے اس بے غرض بے لاگ اور خالص فی سبیل اللہ جدوجہد کے نتیجے میں وہ اپنے ہی آزاد ملک میں آزادی کا نصف حصہ جیلوں میں گزار آئے اور انھیں ایک ایسا پمفلٹ لکھنے پر موت کی سزا سنائی گئی، جو پمفلٹ لاکھوں کی تعداد میں چھپتا اور پھیلتا رہا اور جس کے حرف حرف سے ملت کے افراد کو اتفاق تھا، جو دیگر کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور اسے پڑھ کر لوگ حیران رہ گئے کہ اس میں موت کی سزا کے لیے کون سی بات تھی۔ اس سزا پر ملتِ مسلمہ کا ضمیر ملک کے اندر ہی نہیں بلکہ ہر چہار طرف سے بیدار ہو کر چیخ پڑا اور اس کے نتیجے میں ملک کے باہر سے بھی بے شمار لوگوں نے اس سزا پر احتجاج کیا۔

ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے مختلف اسلامی ممالک کے دورے کیے۔ کبھی فریضۂ حج کی ادائی کے سلسلے میں تشریف لے گئے، کبھی اپنی مشہور تفسیر تفہیم القرآن کے لیے ارض القرآن کا دورہ کیا اور کبھی مدینہ اسلامی یونیورسٹی کے اجلاس تاسیس میں شرکت کے لیے گئے اور ان دوروں کے درمیان انھیں مختلف شخصیتوں سے واسطہ پیش آیا۔ وہاں اپنے اثرات چھوڑے، تقاریر کیں، پیغام دیے اور اسلامی نظریۂ حیات کے داعی کی حیثیت سے جابجا ان کا گرم جوشی سے استقبال ہوا۔

پھر یہ خصوصیت بھی ہے کہ ان کے علمی، دینی، معاشرتی اور سیاسی کام پر جابجا تحقیقات شروع ہو گئیں۔ بیرونی ممالک کے اربابِ علم ونظر نے مولانا کی شخصیت کو سمجھنے اور ان کے پیغام کو جاننے کے لیے باقاعدہ ریسرچ کرنے اور اپنے آدمی متعین کر کے ان کے بارے میں صحیح صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوششیں کیں۔

پھر یہ خصوصیت کہ مولانا کی تصانیف یا ان سے متاثر افراد جابجا مختلف ممالک میں پہنچے

اور وہاں اپنے اپنے حلقۂ اثر میں مولانا کے مشن کی تبلیغ کی، جس کے سبب جا بجا ان کا تعارف ہوا اور ان کے مشن کے اثرات پھیلے۔

یہ ساری خصوصیات ان کی شخصیت کو بین الاقوامی شخصیت بنانے کے لیے بہت کافی ہیں۔ ان میں سے اگر ایک ایک خصوصیت کا بھی سرسری سا جائزہ لیا جائے تو شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان مختلف خصوصیات کی حامل کوئی ایک شخصیت بھی اس وقت دنیا میں موجود نہیں ہے۔ چاہے شہرت، قوت اور اقتدار میں ان کا پایہ آسمان کے بادلوں سے بھی کیوں نہ لگتا ہو اور فضاؤں میں چھوڑے ہوئے ان کے میزائل فضائی کروں سے بھی آگے کیوں نہ نکل گئے ہوں۔

بین الاقوامی مشن کا علم بردار

سب سے پہلے مولانا کی حیثیت ایک بین الاقوامی مشن کے علم بردار کی ہے۔ بلاشبہ انھوں نے کام کا آغاز اپنے ملک سے کیا ہے لیکن ان کا پیغام دنیا کے لیے مکمل اسلام کی دعوت ہے۔ ان کے نزدیک سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں ہلاکت خیز نظریے ہیں اور ان کے ذریعے دنیا پر پے در پے جنگوں کے بادل منڈلاتے اور بموں کی بارش برساتے رہیں گے۔ امن عالم کا انحصار صرف اسلام اور اس کے نفاذ پر منحصر ہے، اس عالمی برادری پر منحصر ہے، جو اخوت اسلام کے ذریعے ایک خدا، ایک رسولؐ اور ایک کتاب کے سبب وجود میں آتی ہے اور جس کے درمیان زبان رنگ، نسل، لباس، غذا، پہاڑ، دریا سمندر کی کوئی چیز بھی حائل نہیں ہوسکتی۔ جب تک دنیا میں عدل نہ ہوگا، جو اسلام کا لازمی تقاضا ہے، امن قائم نہ ہوگا۔ چناں چہ اردن ریڈیو سے نئے سال پر انسانیت کے نام ایک ریڈیائی پیغام نشر کرتے ہوئے مولانا مودودی نے کہا:

> ''دنیا کے لوگوں کو نئے سال میں کوشش کرنی چاہیے کہ جو کچھ کوتاہیاں دنیا کے اندر امن اور عدل کے قیام کے سلسلے میں پچھلے زمانوں میں ہوتی رہی ہیں، آیندہ ان کی تلافی کی جائے۔ لیکن یہ بات تمام دنیا کے انسانوں کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے اور خصوصاً دنیا کی طاقتور قوموں کو اسے ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ کوئی امن عدل کے بغیر قائم نہیں ہوسکتا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ دنیا میں ظلم ہوتا رہے اور حق داروں کے حق غصب ہوتے

رہیں اور پھر بھی امن قائم ہو سکے ایسی حالت میں جو تھوڑا بہت امن بہ ظاہر قائم رہتا ہے، وہ محض ظالم کی قوت اور مظلوم کی کمزوری کے باعث رہتا ہے اور یہ انسانی فطرت ہے کہ مظلوم کو جب بھی سر اٹھانے کا موقع ملے گا۔ وہ لازماً اپنے حق کے لیے لڑ کر رہے گا۔ اور یہ بھی سنت اللہ میں سے ہے کہ ظالموں کے درمیان کبھی اتحاد و اتفاق نہ ہو سکے گا اور وہ باہم ایک دوسرے سے متصادم ہوتے رہیں گے۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔"

چناں چہ اس وقت نظامِ سرمایہ داری کے سب سے بڑے نمایندے اگر کینیڈی اور میکملن ہیں اور اشتراکیت کی نمایندگی سب سے زیادہ اگر خروشیف اور ملوزے تنگ کرتے ہیں تو اسلامی نظامِ حیات کے ایک بہت بڑے نمایندے مولانا مودودی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے نظریات ریاستوں کی صورت میں قائم ہیں، جن کی پشت پر بڑی بڑی ریاستوں کی قوت، سرمایہ اور فوجیں ہیں، جن کی پشت پر بڑے بڑے مصنّفین کے ذہن، سائنس دانوں کی ایجادات، اخبارات اور رسائل کے لامحدود ذرائع نشر و اشاعت ہیں تو دوسری طرف اسلامی نظریہ ابھی ریاستی شکل میں تبدیل نہیں ہو سکا اور اپنے عروج کے لیے ابھی عالمِ طفولیت میں ہے۔ ابھی وہ صرف ایک صحت مند نظریہ ہے، ایک ٹھوس دلیل ہے، ایک بیدار جذبہ ہے اور ایک لاجواب فکر ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ابھی دلوں، دماغوں، کتابوں، اخباروں اور جلسوں میں ہے۔ دلوں اور دماغوں سے نکل کر جس روز اس کی جڑ زمین کے اندر کسی گوشے میں پیوست ہوگی اور کسی ریاست کی صورت میں اس کی پہلی کونپل زمین کے سینے کو چیر کر فضائے کائنات میں نمودار ہوگی، اس روز اس کی حقانیت اور اس کا قابلِ عمل کردار بے دلیل سب کی سمجھ میں آ جائے گا۔ اس روز اندھوں کو بھی محسوس ہوگا کہ سورج نکل آیا ہے اور بہروں کو بھی احساس ہوگا کہ کسی چیز کی خنکی قلب کو ٹھنڈک پہنچا رہی ہے۔ جب یہ ہوگا تو جو شخص بھی اس نظریے کی نمائندگی کرے گا، وہ دنیا کے تین نظریاتی بڑوں میں ایک بڑا ہوگا۔ وہ چاہے خدا کے عاجز بندوں میں سے ایک عاجز بندہ ہو۔ لیکن اس کی آواز میں بڑا زور، اس کی دلیل میں بڑا وزن، اس کے اشارے میں بڑی گہرائی محسوس کی جائے گی اور دنیا کے بین الاقوامی مسائل اس کی رائے کے بغیر طے نہ ہوں گے۔

لیکن جب تک وہ دور آتا ہے اور میدان میں وہ ہی نظریے سیاست کی زوردار قوت کے ساتھ اس تیسرے نظریے جہاں بانی کی نمایندگی مولانا مودودی نہایت احسن طریقے سے انجام دے رہے ہیں اور اسی نمایندگی کرنے نے ان کو بین الاقوامی شخصیت بنادیا ہے۔

دستوری مہم کی بازگشت مسلم ممالک میں

مولانا مودودی نے ایک انتخابی مہم کے موقعے پر سفر کے دوران ہاتھ میں اپنی جماعت کا منشور لیے ہوئے کہا تھا:

> ''یہ منشور ہم نے اس نکتۂ نظر سے مرتب کیا ہے کہ اگر کسی بھی غیر اسلامی نظامِ مملکت کو اسلامی شکل دینی پڑے تو یہ منشور کام کرنے والوں کی ہر گوشے میں رہ نمائی کر سکے، مجھے امید ہے کہ دوسرے مسلم ممالک بھی اس سے استفادہ کریں گے۔ چلیے اور کچھ نہیں تو ذہنی غذا تو ہم ان کو یہاں سے پہنچاتے ہی رہیں گے۔''

اس نکتۂ نظر سے جب میں نے اس منشور کا جائزہ لیا تو حقیقتاً اس جدید تقاضوں والے سائنٹی فک دور میں ایک ریاست کو اسلامی دفاعی ریاست بنانے کے لیے اس مختصر ۳۲ صفحے کے پمفلٹ میں مکمل رہ نمائی موجود تھی۔ آج بھی جسے اس کی ضرورت ہو، وہ ریاست کے مختلف شعبوں کی اصلاح کے لیے کمیشن مقرر کرنے کی بجائے مختلف اصلاحات کے لیے اس مختصر پمفلٹ میں دی ہوئی اصلاحات کا نقشہ اٹھا کر دیکھ لے تو اسے پتا چل جائے گا کہ اسلام ماڈرن تقاضوں کو جدید دور میں کس طرح پورا کرتا ہے اور سائنس مذہب کی رہ نمائی میں انسان کو ہلاک کرنے کی بجائے اس کی خدمت کا فریضہ کیوں کر انجام دیتی ہے۔

چناں چہ پاکستان میں جب مولانا مودودیؒ نے یہاں کے اربابِ اقتدار کو اسلامی دستور کی طرف متوجہ کیا تو انھوں نے محض اتنی سی بات پر مہم نہیں چلائی کہ ہمیں اسلامی دستور چاہیے بلکہ یہ بھی کہا کہ اسلامی دستور کیا ہے، اسلامی دستور کی تدوین کن کن ذرائع سے ہوتی ہے، اس کے مقاصد کیا کیا ہیں اور اس کے خدوخال کیا ہیں۔ انھوں نے عوامی جلسوں سے لے کر وکلا کی ایسوسی ایشنوں تک کو خطاب کرکے سمجھا دیا کہ اسلامی دستور کیا ہوتا ہے۔ یہ ایک قابلِ عمل نظریۂ زندگی

ہے اور اسے اپنے ملک میں نافذ کرنا ہی اس کی بہتری کا عین ضامن ہے۔ یہ مہم یہاں تقریباً اٹھارہ سال سے چلتی رہی ہے۔ دستور بنتا بگڑتا اور پھر بنتا رہا ہے۔ اربابِ اقتدار تاخیر پر تاخیر کر کے جمہوریت کو ناکام ثابت کر کے آمریت کا راستہ ہموار کرتے رہے ہیں۔ لیکن مولانا مودودی اس سارے عرصے میں اپنا مثبت کام برابر کرتے رہے، انھوں نے اس پر تقاریر کیں، کتابیں لکھیں اور کنونشن بلائے۔ کئی علما کی کانفرنسوں کے ذریعے اسلامی دستور کے بنیادی اصول مرتب کیے اور تمام دنیا کو دکھا دیا کہ جو وہ چاہتے ہیں وہ کیا ہے۔

اس دس سالہ مہم کے اثرات باہر کے ممالک تک پہنچے۔ اس لیے کہ یہ ایک طویل کش مکش تھی اور ابتلا و آزمایش کے مختلف سنسنی خیز مراحل نے دنیا کو بار بار ہمارے ملک کی طرف متوجہ کیا۔ لیکن اس کا سب سے بڑا اثر جو ابتدائی طور پر بیشتر اسلامی ممالک نے قبول کیا، وہ اسلامی دستور، اس کی طلب، اس کا فہم اور اس کی مانگ ہے، جو مسلم ممالک کے عوام اور خواص دونوں میں اس پاکستانی اسلامی دستوری مہم کے نتیجے میں پیدا ہوگئی۔ حد یہ ہے کہ جب مارچ ۱۹۵۶ میں ملک کا دستور بہت کچھ اسلامی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مکمل ہوا تو اور تو اور انڈونیشیا کی انجمن خواتین تک نے باقاعدہ اجلاس بلا کر شکرانے کی دعا مانگی اور اسے حکومتِ پاکستان کا ایک مبارک قدم قرار دیا۔

مصر

پاکستان میں اسلامی دستور کی مہم کے نتیجے میں مصر کے اندر بھی اس کا چرچا شروع ہو گیا۔ چناں چہ وہاں نومبر ۱۹۵۳ میں مولانا مودودی کی دستوری تقاریر اور مضامین کا مجموعہ ''نحو الدستور الاسلامی'' کے نام سے شائع ہوا، جس کے دیباچہ میں لکھا گیا:

> ''آج کل ملک میں اسلامی حکومت کی ماہیت، مزاج اور ڈھانچے کے بارے میں جگہ جگہ بحثیں چھڑی ہوئی ہیں۔ اس لیے ہم بھی اس میں حصہ لیتے ہوئے اسلامی دستور کے موضوع پر یہ کتاب شائع کر کے ایک اہم ضرورت کو پورا کرنا چاہتے ہیں''۔

جولائی ۱۹۵۲ سے فروری ۱۹۵۴ تک تو وہاں پاکستان میں اٹھی ہوئی دستوری مہم کے زیر اثر اسلامی دستور کا بہت چرچا رہا۔ قاہرہ سے ''اسلام کا سیاسی نظریہ'' اور مولانا کا ''دستوری خاکہ'' دونوں کتب

شائع ہوئیں، جو وہاں بڑی تعداد میں پھیلائی گئیں اور اسلام پسند حلقوں نے ان کا بڑی مسرت سے استقبال کیا۔

مولانا مودودی کے اٹھائے ہوئے چار نکاتی مطالبے اور دیگر اسلام پسند عناصر کے اسلامی حکومت کے مطالبے کے نتیجے میں جب پاکستان میں قرارداد مقاصد پاس ہوئی، جس میں اللہ کی حاکمیت کو اقتدار کا منبع تسلیم کیا گیا تھا، تو اس پر وہاں پاکستانی دستور یہ کو بڑی داد و تحسین پیش کی گئی۔ چناں چہ ڈاکٹر عبداللہ عربی نے اپنے ایک مضمون میں اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھا:

> ''باشندگان پاکستان اپنے ذہن اور وطن کو استعمار کے پنجے سے آزاد کرانے کے لیے جنگ آزادی لڑتے رہے ہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دست گیری کی اور انھیں ایک ایسی ریاست میں جمع کر دیا جہاں اقتدار کا منبع صرف خدائے وحدہٗ لاشریک کی ذات ہے۔ پس اگر اہل پاکستان اللہ کے اس احسان اور کرم پر شکر ادا کریں گے تو وہ انھیں مزید نعمتوں سے سرفراز کرے گا اور انھیں وہ خطے بھی عطا کرے گا، جنھیں ان کی سرپرستی سے محروم کر دیا گیا ہے۔

چناں چہ دسمبر ۱۹۵۲ میں جب پاکستان میں مولانا مودودی نے اسلامی دستور کا خاکہ پیش کیا اور حکومت کو بار بار متوجہ کیا کہ اس کے مطابق دستور بنائے تو انھی دنوں مصر میں جنرل نجیب نے ایک دستوری کمیشن قائم کر کے اس میں اخوان المسلمون کے چار آدمی لیے۔ اس کمیشن پر مصر کی نگاہیں مرتکز تھیں اور ان پر ہر چہار طرف سے دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ دستور خالص اسلامی بنیادوں پر مرتب کیا جائے۔ لیکن جب پاکستان میں اسلامی دستور کے علم برداروں کو ختم نبوت کی تحریک کی آڑ لے کر سخت سزائیں دی جانے لگیں، تا کہ اسلامی دستور کا راستہ روکا جا سکے تو مصر کے جرائد نے اس پر سخت افسوس اور حیرت کا اظہار کیا اور لکھا:

> ''پاکستان کے ساتھ ہماری دوستیاں صرف اسلامی عقیدے کی بنیادوں پر ہیں تمام دنیا کے مسلمان پاکستان کے ساتھ بڑی آرزوئیں وابستہ کیے ہوئے ہیں پاکستان میں اسلامی نظام کے علم برداروں کو گرفتار کر کے موت اور عمر قید کی سزائیں دی جا رہی ہیں۔'' (المسلمون)

اس زمانے کے مصری رسائل کا مطالعہ کیا جائے اور وہاں کے دستوری رجحانات کو دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ پاکستان کی دستوری مہم نے ان کے خیالات پر بڑا نمایاں اثر ڈالا ہے۔

شام

شام اسلامی دستور کے معاملے میں مصر سے ہمیشہ آگے رہا ہے۔ پاکستان کی دستوری تحریک سے شام کے اسلام پسند عنصر کے فکری اور نظریاتی لگاؤ کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ پاکستان میں مارچ ۱۹۵۳ سے مئی ۱۹۵۵ تک اسلامی تحریک اور اسلامی دستور کا مطالبہ کرنے والوں پر، جو ناروا مظالم ڈھائے گئے، شام کا اسلام پسند عنصر اس پر، جس حد تک برافروختہ ہوا، وہ خود پاکستان کے اسلام پسند عناصر کی برافروختگی سے کم نہیں تھا۔ مولانا مودودی کے تینوں بیانات، جو تحقیقاتی عدالت میں دیے گئے تھے، شام میں شائع ہوئے۔ قادیانی مسئلے کا پہلا ایڈیشن شام کے ہی ایک رسالے (التمدن الاسلامی) میں مکمل شائع ہوا اور یہ دونوں چیزیں وہاں بڑی رغبت سے پڑھی گئیں۔ شام یونیورسٹی کے ایک پروفیسر احمد الزین نے 'دو دستوری خاکے' اور مولانا مودودی کے دستوری مضامین کے عربی مجموعے سے ایک دستوری خاکے مرتب کرکے یونیورسٹی کو پیش کیا اور پھر مولانا مودودی کی اجازت سے ۱۹۵۷ میں اسے کتابی صورت میں پیش کیا۔ مولانا مودودی کے خیالات پر علمی حلقوں میں وہاں مسلسل بحثیں ہوتی رہیں اور انھیں اسلامی علم و ادب کا بہترین مفکر قرار دیا گیا۔

انڈونیشیا

انڈونیشیا میں اسلامی دستور سے کس قدر والہانہ شغف پایا جاتا ہے، اس کا اندازہ اس خبر سے کیا جاسکتا ہے، جس کا تذکرہ پہلے کیا گیا ہے کہ پاکستان میں اسلامی دستور کی تکمیل پر وہاں کی انجمن خواتین نے دعائے شکرانہ مانگی۔ انڈونیشیا کی دستوری جدوجہد بھی پاکستان کے حالات سے مماثلت رکھتی ہے۔ وہاں کے اسلام پسند طبقے نے بھی اسلامی دستور کے نفاذ کے لیے پاکستان کی اسلامی دستور کی جدوجہد سے پورا استفادہ کیا ہے۔ ماشومی پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر ناصر جب اپنے رفقا کے ہمراہ عالمِ اسلامی کے دورے پر نکلے تاکہ مختلف ممالک کے حالات کا مطالعہ کرکے اور اہلِ علم

سے مل کر اسلامی دستور کی تدوین میں مدد حاصل کریں تو اس زمانے میں پاکستان کی تحریکِ اسلامی کا دستوری لٹریچر عربی زبان میں وہاں پہنچنا شروع ہو گیا تھا۔ مارچ ۵۲ء میں جب علما کی مؤتمر منعقد ہوئی تو اس وقت ماشومی پارٹی کے ذمے دار افراد پاکستان کی اسلامی تحریک، مطالبہ نظامِ اسلامی اور اسلامی دستور کی مہم سے کافی حد تک روشناس ہوئے اور اس ضرورت کا احساس کیا کہ چوں کہ تمام اسلامی ممالک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کی شدید رغبت پائی جاتی ہے، اس لیے کسی ایسے ادارے کی سخت ضرورت ہے، جس کے تعاون سے اس رغبت کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکے۔

سوڈان

سوڈان کے آزاد ہوتے ہی وہاں اسلامی دستور کی مہم اٹھ کھڑی ہوئی، جو پاکستان میں اسلامی دستور کی مہم سے پوری پوری مماثلت رکھتی تھی۔ ۵۶ کے وسط میں سوڈان کے، جو حضرات حج پر تشریف لائے، انھوں نے اپنے پاکستانی اسلام پسند مہمانوں سے دستورِ اسلامی کے موضوع پر گفت وشنید کی اور اپنے ملک کی آئینی مہم کو سر کرنے کے لیے پاکستانی بھائیوں کے تجربات سے استفادہ کیا۔ بلکہ مولانا ظفر احمد انصاری، جو پاکستان کے اسلام پسند عناصر اور مولانا مودودی کے نکتۂ نظر سے متاثر حضرات میں ایک نمایاں شخصیت ہیں۔ انھیں سوڈان میں آنے کی دعوت دی گئی۔ چناں چہ انھوں نے سوڈان میں خرطوم یونیورسٹی میں خطاب کیا اور دستوری مسائل پر وہاں کی اسلام پسند جماعتوں اور نمائندہ شخصیتوں سے گفتگو کی اور آئینی اور دستوری مسائل پر انھیں مفید مشورے دیے۔ اس کے علاوہ پاکستان کے ۳۳ علماء کے مرتب کردہ اسلامی دستوری خاکے کے نقشے پر بھی وہاں دستوری خاکہ مرتب کر کے اس کی اشاعت کی گئی اور وہاں اسلامی دستور کی مہم بالکل اسی نقشے پر چلائی گئی، جیسی پاکستان میں چلتی رہی تھی۔

مراکش

یہاں مولانا مودودی کا لٹریچر پاکستان سے عربی میں ترجمہ ہو کر پہنچ رہا ہے، لیکن وہاں فرانسیسی اثرات کی جڑیں اب تک بہت مضبوط ہیں۔ وہاں کی تحریکِ اسلامی کے لیڈر پروفیسر مکی الناصر نے مولانا کی کتاب ''اسلامی ریاست'' (Law and constitution Islamic) کا ایک نسخہ

سلطان مراکش کو پیش کیا تھا انھوں نے اسے پڑھ کر کہا کہ ''میں ان شاء اللہ اپنے ملک کی گاڑی اسی کے مطابق چلاؤں گا۔'' لیکن افسوس ہے کہ وہاں بھی فرنگیت زدہ عناصر کے پنجے بہت گہرے گڑے ہوئے ہیں اور جب تک اسلامی نظامِ فکر کو علمی میدان میں پوری طرح برتر نہ ثابت کر دیا جائے۔ کام کا راستہ پیدا نہیں ہوتا۔

نائیجیریا

یہاں کے مسلمانوں تک بھی اسلامی دستور اور اسلامی نظام کی صدائے بازگشت پہنچ چکی ہے۔ لیکن پاکستان کے حالات نے ان پر برا اثر ڈالا ہے۔ وہاں کے ایک وفد کے ارکان نے ایک ملاقات میں ایک پاکستانی مبلغ سے کہا:

''ہم ملکی دستور کو پاکستان کے دستور کی روشنی میں مرتب کرنا چاہتے تھے، لیکن وہاں کے حالات نے اس معاملے میں ہمیں بدگمانیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔''

یہ ہیں وہ دستوری اثرات، جو پاکستان میں مولانا مودودی کی چلائی ہوئی اسلامی دستور کی مہم نے مختلف مسلمان ملکوں میں پیدا کیے ہیں اور جن کے نتیجے میں وہاں اسلامی دستور کا مطالبہ اور اس کی تڑپ قوت اور حرکت کے ساتھ اُٹھ چکی ہے۔ اس کے علاوہ کئی دیگر ممالک میں جہاں مولانا مودودی کی تصانیف کے ذریعے ان کی فکر کی شعاعیں آہستہ آہستہ نفوذ کر رہی ہیں وہاں اسلامی دستور کی طلب اور مانگ پیدا ہو رہی ہے۔

سزائے موت پر عالمگیر احتجاج

راہِ حق میں کام کرنے والوں پر بلا جرم مظالم کا سلسلہ ہمیشہ سے چلا آتا ہے۔ جہاں اس راہ پر چلنے کی سعادت بھی لوگوں کو حاصل ہوتی رہی ہے، وہیں اس راہ میں مزاحم ہونے اور ظلم وستم کرنے کی بدبختی بھی تاریخ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ افراد کے حصے میں آتی رہی ہے۔

مولانا مودودیؒ نے پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے خالص جمہوری طریقوں سے ایک طرف عوام میں اس کا شعور پیدا کیا اور دوسری طرف اربابِ اقتدار کو اس طرف توجہ دلائی لیکن مسلمان ہونے کے سبب اربابِ اقتدار نہ اس سے انکار کر سکتے تھے اور نہ اپنی دلچسپیوں اور

مفاد کو چھوڑنے کی ہمت و جرأت رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے یہ راستہ اختیار کیا کہ مولانا مودودی کے نظریات کو دلیل سے غلط ثابت کرنے کے بجائے ان کی ہستی کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جائے لیکن زمانے نے دیکھا کہ یہ سازشیں کرنے والے خود حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے۔ اسی روح فرسا موقعے پر جب اربابِ اقتدار نے ختم نبوت کی آڑ لے کر مولانا کو موت کی سزا سنائی اور پھر عوام کے مسلسل اور شدید احتجاج پر اسے ۱۴ سال کی مدت میں بدل دیا، تو مختلف بیرونی ممالک کی طرف سے بھی اس سزا پر احتجاج کیا گیا۔ اسی احتجاج کے سلسلے میں چند ایک اقتباسات، جو مجھے حاصل ہو سکے ہیں، یہاں درج کر رہا ہوں۔

انگلستان کے مسلمانوں نے متفقہ قرارداد کے ذریعے اپنے جذبات سے پاکستان کے حکمرانوں کو مندرجہ ذیل الفاظ میں آگاہ کیا۔

> ''پاکستان کی ترقی و استحکام کے لیے جو لوگ سب سے زیادہ کام کر سکتے ہیں۔ ان میں علما مفکرین کی خدمات کی از حد ضرورت ہے، جن میں تفقہ فی الدین کے ساتھ ساتھ یہ بھی صلاحیت ہو کہ وہ اسلامی اصول و احکام کو موجودہ زمانے کے احوال و ضروریات پر منطبق کر سکیں۔ اسی قسم کے ذی علم اور اصحابِ بصیرت میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا شمار ہوتا ہے۔''

انڈونیشیا کے مسلمانوں نے تار بھیجا:

> ''مودودی صاحب دنیائے اسلام کی امانت ہیں، مولانا کی اگر پاکستان کو ضرورت نہیں تو دنیائے اسلام کو مولانا کی ضرورت ہے۔ ہم انڈونیشیا کے مسلمان ان کے ساتھ ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے خیالات کی آج مسلم دنیا کو اشد ضرورت ہے۔''

قاہرہ کے عربی اخبار ''منبر الشرق'' نے لکھا:

> ''مصر کی ساری دینی جماعتیں مولانا مودودی کو ایک مخلص عالم اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جدوجہد کرنے والوں میں صفِ اوّل کا جلیل القدر مجاہد صادق سمجھتی ہیں۔''

روزنامہ 'السجل' نے بغداد سے لکھا:

''علامہ ابوالاعلیٰ مودودیؒ وہ حق آگاہ ہیں، جس کا جرم اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ کے سوا کوئی نہیں۔''

رسالہ ''الدعوت'' قاہرہ نے لکھا:

''مولانا مودودی کی سزائے موت، محض ایک فرد بشر کی موت کا فیصلہ نہیں ہے بلکہ یہ تو اسلام کی تلواروں میں سے ایک تلوار کو توڑ دینا، اسلام کی آوازوں میں سے ایک آواز کو خاموش کر دینا ہے اور اسلام کے وقار واعزاز کو مٹا دینا ہے۔ آہ وہ حرکت، جس پر دشمنانِ اسلام مسرت کے شادیانے بجائیں گے۔''

شیخ محمد بشیر الابراہیمی ایڈیٹر اخبار ''البصائر'' نے ''من ھو المودودی'' کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا، جس کے چند اقتباسات یہ ہیں:

''مولانا مودودی ایسی شخصیت کے مالک ہیں کہ میں نے کم ہی ایسے باکمال دیکھے ہیں۔ بلکہ وہ اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے فرد واحد ہیں، جس کی نظیر میں اس دور کے علما میں نہیں پاتا۔ حق کے معاملے میں نہایت سخت، مداہنت سے کوسوں دور اور راہِ حق میں ابتلا ومحن کے وقت صبر و ثبات کے پیکرِ مجسم، حکام وقت کے تقرب سے متنفر۔ خوشامد و تملّق تو بہت دور کی بات ہے، شریعت کے مزاج شناس، قرآن وحدیث پر کامل عبور، موجودہ تہذیب کے نشیب وفراز سے اچھی طرح واقف علاّمہ مودودی اپنے پہلو میں ایسا دل رکھتے ہیں، جو مسلمانوں کی موجودہ پستی وزبوں حالی کے درد سے تڑپتا رہتا ہے۔

ہم اس واقعے کے اظہار پر مجبور ہیں کہ مودودی ہی وہ واحد شخصیت ہیں، جو پاکستان میں مطلوبہ اسلامی دستور کے وضع وترتیب پر قدرت رکھتی ہے، مودودی کی شخصیت کسی ایک ملک اور کسی ایک خطۂ زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ دنیا کے سارے مسلمانوں کو فیض رسانی کے لیے عالمِ اسلام کی امانت ہیں۔''

ہندستان میں اخبار ''سیاست جدید'' کانپور کے ایڈیٹر نے لکھا:

''مولانا ابوالاعلیٰ مودودی! آپ کو ہمارا سلام۔ آپ نے دین اسلام کی تبلیغ کے لیے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔''

ماہ نامہ ''تجلی'' دیوبند کے ایڈیٹر مولانا عامر عثمانی نے لکھا:

''مولانا مودودی ہی وہ شخص ہے، جس نے تمام دنیائے اسلام کو ایک عظیم الشان اسلامی لٹریچر دیا کہ اگر کوئی قدر دان ہو تو اس کے صلے میں ہفت اقلیم بھی کم ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ان کے لٹریچر کا ایک ایک صفحہ موتیوں میں تولنے کے قابل ہے؟''

روز نامہ ''نئی دنیا'' دہلی نے لکھا:

''مولانا مودودی، جن کا پاکستان ہی نہیں، پاکستان کے باہر بھی ایک خاص حلقہ کے دلوں میں احترام ہے۔''

ہفت روزہ ''روشنی'' بنگلور نے لکھا:

''مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا وجود مسلمانوں کے لیے ایک متاعِ گراں مایہ ہے۔ اپنے قلم وزبان سے ملت اسلامیہ کی، جو خدمت انھوں نے انجام دی ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔''

ماہ نامہ ''الکلام'' بمبئی نے لکھا:

''مولانا مودودی، جنھوں نے اپنے قلم اور زبان کی ساری قوت تبلیغِ اسلام کے لیے لگا رکھی ہے۔''

مولانا مودودی کی دعوت، مشن اور کام پر ریسرچ

مولانا مودودی نے گزشتہ ربع صدی میں، جو کام سرانجام دیا ہے وہ حیرت ناک ہے۔ ایک طرف انھوں نے تفہیم اسلام کے لیے ایک ایسا عظیم الشان لٹریچر تیار کیا ہے، جو حق کے متلاشی کی قدم قدم پر رہنمائی کرتا ہے اور دوسری طرف حق کی سربلندی اور اسلامی نظریۂ حیات کی بالفعل ترویج و نفاذ کے لیے عالم اسلام میں ایک زبردست تحریک برپا کر دی ہے۔ چناں چہ یورپ کے مبصرین، جو مشرق میں اُٹھنے والی ہر فکر پر چونکتے اور چوکنے ہو کر اس کا جائزہ لینے لگ جاتے ہیں

تاکہ وہ آئندہ قوت پکڑ کر ان کے لیے کسی پہلو سے خطرناک ثابت نہ ہو اور کچھ زندہ قوموں کی خصوصیات رکھنے کے سبب ذوقِ تحقیق و تجسس بھی رکھتے ہیں۔ مولانا مودودی کی پھیلتی ہوئی فکری تحریک سے وہ بھی مجبور ہوئے ہیں کہ اس اٹھتی ہوئی نئی نظریاتی قوت کا جائزہ لیں اور اس کے خد و خال سے پوری طرح آگاہ ہو جائیں تاکہ اس کے ساتھ معاملہ کرنے اور کوئی طرزِ عمل متعین کرنے کے لیے انھیں علم و عقل کی روشنی میں صحیح معلومات فراہم ہوں۔

ہم سب کے لیے بلاشبہ یہ بات موجب فخر ہے کہ ان کے ایک ہم وطن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے افکار و نظریات پر میکیگل یونیورسٹی کینیڈا میں علمی تحقیق کا کام ہو رہا ہے۔ اس کام میں ڈاکٹر پروفیسر چارلس جے ایڈمز مصروف ہیں۔ انھیں راک فیلر فاؤنڈیشن کی طرف سے ۶ ہزار ڈالر کی گرانٹ دی گئی ہے۔ یہ کام یونیورسٹی کے دائرۂ تعلیمات اسلامیہ کے تحت سرانجام پا رہا ہے۔ اس ادارے نے ہند و پاک میں اسلام کے جدید رجحانات پر ریسرچ کرنے کے لیے نصاب کے طور پر، جو کتب تجویز کی ہیں ان میں مولانا مودودی کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ اس ادارے کے تحت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے سیاسی نظریات اور جماعت اسلامی کی تنظیم اور اس کے پروگرام پر تحقیق ہو رہی ہے۔ انھوں نے پاکستان میں رہ کر دو سال گزارے۔ مولانا مودودی اور ان کے رفقا سے ملاقاتیں کیں، اردو سیکھی اور اپنی ریسرچ کے لیے مواد جمع کرتے رہے۔

انھیں اس تحقیقی کام میں سیاسی مباحث سے تعرض نہیں کرنا ہے۔ بلکہ ان کا دائرۂ تحقیق یہ ہے کہ مولانا مودودی نے ہمارے دور کی سیاسی فکر میں کیا حصہ شامل کیا ہے۔ ان کے پاس مولانا مودودی کی تمام تصانیف، ترجمان القرآن کے تمام فائل اور ان کے علاوہ کثیر لٹریچر کا ایک ڈھیر موجود ہے۔

بیرونی اسلامی ممالک کے دورے

موتمر عالم اسلامی کے دمشق میں منعقد ہونے والے دوسرے اجلاس میں شرکت کے لیے مولانا مودودی جون ۵۶ میں مشرقِ وسطیٰ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ پہلے اجلاس کے موقعے پر مولانا سزائے موت اور عمر قید والی جیل میں تھے۔ اس موتمر کے اجلاسوں میں عالمِ اسلام کے نمائندوں نے مولانا کی اسلامی خدمات کا کھل کر اعتراف کیا۔ مولانا نے ان مختلف اجلاسوں میں

سے ایک اجلاس کی صدارت بھی کی اور مولانا کو موتمر کی طرف سے تبلیغ و دعوت اسلامی کی کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔

دمشق میں موتمر کے اجلاس میں شرکت اور صدارت کے بعد مولانا نے مشرقِ وسطیٰ کے بعض دیگر ممالک کا دورہ بھی کیا اور فریضۂ حج بھی ادا کیا۔ جہاں مسلم ممالک سے آئے ہوئے مختلف اصحاب علم ونظر سے رابطہ قائم ہوا۔

دمشق روانہ ہوئے تو تھوڑی دیر بحرین رکنے کے بعد بیروت پہنچے۔ یہاں لبنان کی اسلامی تحریک ''عباد الرحمٰن'' کے رہ نماؤں، کارکنوں اور شہر کے معززین نے ہوائی اڈے پر مولانا کا پرجوش استقبال کیا۔ ''عباد الرحمٰن'' کے اسکاؤٹوں نے باقاعدہ مولانا مودودی کو سلامی دی۔ ان سے معلوم ہوا کہ ''جماعت عباد الرحمٰن'' کے حلقوں میں مولانا مودودی کا لٹریچر کثرت سے پھیلا ہوا ہے اور ہر شخص مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے پوری طرح واقف ہے۔

شام کی سرحد پر پہنچے تو وہاں مولانا اور ان کے ساتھیوں کے سامان کا کوئی معائنہ نہیں کیا گیا۔ پولیس چوکی کے انچارج نے بتایا کہ اسے حکومت کی طرف سے ہدایت آئی ہے کہ وہ شامی حکومت اور شامی قوم کی طرف سے مولانا مودودی کا خیر مقدم کرے۔ دمشق شہر سے دس بارہ میل باہر تک شہر کے عمائدین مولانا مودودی کے استقبال کے لیے کاروں کا ایک قافلہ لیے ہوئے پہلے سے موجود تھے، جن کے ہمراہ مولانا دمشق میں داخل ہوئے۔ شام کو مندوبین کے اعزاز میں دعوت کا انتظام کیا گیا، جس میں شہریوں کے علاوہ وزیر عدلیہ، پارلیمنٹ کے صدر اور وزیر داخلہ نے بھی شرکت کی۔

دمشق سے واپسی پر شامی حکومت نے نہایت عزت واحترام کا سلوک کیا۔ وزیر مواصلات اسٹیشن پر الوداع کہنے کے لیے تشریف لائے اور شام کی سرحد تک گاڑی کے سفر کا انتظام حکومت کی طرف سے کیا گیا۔

شرق اردن میں شاہ حسین نے ایک دعوت دی اور ایک جلسۂ عام میں بھی مولانا کو تقریر کرنی پڑی، جس میں اسلامی نظامِ زندگی، جماعت اسلامی اس کے لٹریچر اور عربی تراجم کے متعلق بہت سے سوالات کا جواب دیا اور پاکستان کی خارجی پالیسی اور معاہدہ بغداد کے خلاف عربوں کے اعتراضات کے جوابات دیے اور انھیں مطمئن کیا۔

حلب سے ایک خاص وفد مولانا مودودی کو لے جانے کے لیے آیا۔ چناں چہ مولانا مودودی مراکش کے رہ نما مکی الناصری اور الجزائر کے رہ نما جناب محمد الغیری کے ہمراہ حلب روانہ ہوئے تو راستے کے مختلف مقامات پر عربوں نے شہر سے دس دس پندرہ پندرہ میل آگے کاروں کے قافلے لالا کر اپنے مخصوص انداز میں مولانا کا استقبال کیا۔

حمص اور حماۃ میں اخوان نوجوانوں نے قدیم عرب رواج کے مطابق عربی نظمیں پڑھ پڑھ کر اور تالیاں بجا بجا کر مولانا کا استقبال کیا اور اس طرح اخوان نوجوانوں نے اپنی محبت و الفت کا انتہائی گہرا اظہار کیا۔

شامی فوج کے بہت سے نوجوان مولانا مودودی سے ملے اور ان سے معلوم ہوا کہ ان میں سے بہت سے مولانا مودودی کی کتابیں پڑھ چکے ہیں۔ ان سے اچھی طرح واقف ہیں اور حکومت کی طرف سے بھی مولانا کا لٹریچر فوجیوں میں جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ مولانا مودودی کو افسوس تھا کہ ان کے اپنے ملک میں حکومت ان کے لٹریچر کو فوجیوں کے لیے شجر ممنوعہ قرار دیتی ہے اور کسی فوجی نوجوان کے پاس ان کی کسی کتاب کا نکل آنا اسے مجرم قرار دلوانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

سعودی عرب میں بھی بہت سے لوگ مولانا کی عربی تصانیف کا مطالعہ کیے ہوئے ان سے آ کر ملے اور قیام مکہ کے دوران برابر آ کر ملتے اور تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔

سیام کے بہت سے متدین اور بعض دینی انجمنوں کے لیڈروں نے بھی مولانا سے ملاقاتیں کیں اور مولانا کی تصانیف کا سیامی زبان میں ترجمہ کرنے کی اجازت حاصل کی۔

روسی ترکستانی مہاجروں کی ایک بڑی تعداد آ کر ملتی رہی اور اس نے مولانا کو اپنے حالِ زار سے آگاہ کیا اور بتایا کہ روس نے ترکستان میں کیا کیا مظالم توڑے اور مسلمانوں کو کس کس طرح تباہ و برباد کیا۔ ان میں ایک عالم نے مولانا کی چند کتابوں کا ترکستانی زبان میں ترجمہ بھی کیا تھا۔

ترکی کے بھی بہت سے حضرات آئے جو بڑی تلاش اور جستجو کے بعد آ کر ملے تھے۔ انھوں نے یہ خبر کہیں سے سنی تھی کہ مولانا مودودی صاحب امسال حج کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ وہ مولانا کو مکہ میں تلاش کرتے رہے۔ بالآخر مدینہ شریف میں آ کر ملاقات ہوئی۔ وہ بھی مولانا کی کتب کے ترجمے ترکی میں کرنا چاہتے تھے، جس کی مولانا نے اجازت دے دی۔

اکتوبر ۱۹۵۹ میں مولانا مشرقِ وسطیٰ کے دورے پر دوبارہ تشریف لے گئے۔ یہ دورہ خالص علمی، تحقیقی اور تاریخی مقاماتِ ارض القرآن کے مشاہدات سے متعلق تھا۔ مولانا مودودی اپنی مشہور تفسیر تفہیم القرآن کے لیے ارض القرآن کے مختلف مقامات کا خود مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ اس دورے میں بھی مولانا کے ساتھ ہر جگہ انتہائی برادرانہ سلوک کیا گیا۔ مختلف عرب حکومتوں نے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں خصوصاً سعودی عرب اور شرق اردن کے حکام اور فرماں رواؤں نے تو مہمان نوازی کا ناقابلِ فراموش مظاہرہ کیا۔ اس دورے میں بھی مولانا کو جہاں موقع ملا عرب قوم پرستی کے غلط تصور کی اصلاح کی کوشش کی۔ اکثر مقامات پر تو مولانا نے عرب بھائیوں سے صاف صاف کہا:

> ''ہمارا اور تمھارا رشتہ اسلام کی بدولت ہے۔ اسلام کو تم لے کر اٹھو تو دنیا کے ۴۰، ۵۰ کروڑ مسلمان تمھارے ساتھ ہیں لیکن کفر و جاہلیت کو اختیار کرو گے تو دنیا کے مسلمان تو درکنار، عرب کے مسلمانوں کا بھی بڑا حصہ تم کو الوداع کہے گا اور تم کسی طرح سے بھی کوئی تائید نہ پا سکو گے۔''

مولانا نے بتایا:

> ''میرا خیال ہے کہ عربی ممالک میں قومیت پرستی اور الحاد اور فسق و فجور یہ تینوں ایک ہی منبع سے آ رہی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ رہی ہیں، جو لوگ قومیتِ عرب کے علمبردار ہیں وہی الحاد اور فسق و فجور کے علمبردار ہیں۔''

تین سال بعد اس سفر میں اندازہ ہوا کہ مولانا مودودی کی دعوت، اشاعت تصانیف اور تعارف عرب مما لک میں ۵۶ء کے مقابلے میں کئی گنا بڑھ چکا ہے۔ عربی کتب کی اشاعت میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ مولانا کے ساتھ حکام اور حکمرانوں کا طرزِ عمل نہایت ہی مہماندارانہ اور مشفقانہ رہا۔ جابجا تبلیغی اجتماعات منعقد ہوتے رہے، جہاں مولانا نے اپنی دعوت اور مشن کا تعارف کرایا اور سوالات کے جواب دیے، کالجوں میں خطاب کیا۔ ذہین طبقہ پہلے سے متعارف ہو چکا ہے اور محسوس ہوا کہ مولانا کی تصانیف بڑی سرعت سے دین دار طبقہ میں پھیل رہی ہیں۔ عرب قومیت کا اندھا جذبہ بھی ان اثرات کے مقابلے میں پہلے سے کم محسوس ہوا۔ یہ دورہ دعوتی اور تعارفی لحاظ سے نہایت کامیاب رہا۔

پھر جلد ہی دسمبر ۶۰ء میں مولانا کو تیسری بار سعودی عرب جانا پڑا۔ اس بار مولانا شاہ

سعود کی دعوت پر تشریف لے گئے تھے۔ شاہ کے پیش نظر مدینہ میں ایک اسلامی یونیورسٹی کا قیام تھا، جس کا ابتدائی خاکہ تیار کرنے کے لیے اس نے چند اہل علم حضرات کی مجلس منعقد کی اور مولانا مودودی کو شاہی مہمان کی حیثیت سے پاکستان سے مدعو کیا۔

مولانا اپنا خاکہ یہاں سے مرتب کر کے ہمراہ لے گئے تھے، جسے وہاں ممبران میں تقسیم کر دیا گیا، اسی کو بنیاد بنا کر نقشۂ کار بنایا گیا۔ شاہ سعود نے مولانا سے مدینہ شریف جا کر یونیورسٹی کی عمارت اور جگہ دیکھنے اور مناسب مشورہ دینے کی بھی خواہش ظاہر کی۔ چناں چہ مولانا مدینہ شریف بھی گئے۔

اس دورے میں کثرت سے ملاقاتیں ہوئیں، تعلقات قائم ہوئے۔ ریاض یونیورسٹی کے پروفیسروں اور طلبا سے مختلف مسائل پر گفتگوئیں ہوئیں، مختلف تقریبات اور اجتماعات میں بھی شرکت کی اور تقاریر کیں۔ مولانا کو اس یونیورسٹی سے مسلمانوں کی دینی معیاری تعلیم کے بارے میں بڑی توقعات ہیں۔

یہیں پر افریقہ میں تبلیغ اسلام کا پروگرام بنایا گیا اور کام کے لیے بہت کچھ امید افزا حالات اور ذرائع سامنے آئے۔ ایک اخبار نے تو مولانا کو افریقہ میں تبلیغِ اسلام کے اہم فریضہ کی طرف متوجہ بھی کیا:

> ”بلاشبہ مولانا اس کام کے لیے ذہناً تیار بھی ہیں اور کام کا ایک مستقل نقشہ بھی سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن جو ذرائع انھیں اس کام کے لیے مطلوب ہیں ان کی فراہمی کا سامان تو حکومت کی طرف سے الگ رہا، کیا معمولی پاسپورٹ اور زرِ مبادلہ کی سہولتیں بھی مولانا کے لیے فراہم ہو سکتی ہیں؟ یہ بات اپنی جگہ خود محل نظر ہے۔ بہر حال اللہ کا شکر ہے کہ مولانا بہت جلد افریقہ تبلیغ کے سلسلے میں مسلمانان کینیا اور نیروبی کی دعوت پر تشریف لے جا رہے ہیں اور انجمن حیات اسلام نیروبی ایک جامع تبلیغی پروگرام بنائے ہوئے مولانا کی تشریف آوری کی منتظر ہے۔ مولانا اس تبلیغی دورے کے لیے ہر وقت پابرکاب ہیں۔ بشرطے کہ حکومت کو اس تبلیغ پر کوئی اعتراض نہ ہو۔

غیر مسلم ممالک میں اثرات

ہندستان

پاکستان سے باہر جن غیر ممالک میں مولانا مودودی کی دعوت اور مشن کے اثرات پہنچ چکے ہیں، ان میں نمایاں ترین ملک ہندستان ہے، جہاں تقسیم سے قبل مولانا مودودی پورے ملک میں اپنا کام خود کر رہے تھے اور تقسیم کے بعد مولانا کے ہم خیال لوگ ان کے مشن اور دعوت کے مطابق منظّم طور پر اسلامی دعوت اور تبلیغ اسلام کا کام کر رہے ہیں۔ اس وقت جو لوگ وہاں کام کر رہے ہیں وہ جماعت اسلامی ہند کی ایک تنظیم کی شکل میں منظّم ہیں، جس کا پروگرام چار بنیادی نکات پر مشتمل ہے۔ (یہ معلومات روزنامہ ''دعوت'' دہلی کے اجتماع نمبر سے حاصل کی گئی ہیں)

- فرقہ وارانہ طبقاتی کشمکش کا استیصال
- مسلمانوں کے معاشرے کی اسلامی اصولوں کے مطابق اصلاح اور ان میں علم دین کی وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت۔
- ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ کو دعوت سے متاثر کرنے اور ان کی صلاحیتوں کو نشو و نما دے کر تحقیقی اور تعمیری کاموں میں لگانے کی کوشش۔ خصوصاً دہریت، فرقہ واریت، سوشلزم اور کمیونزم کے سیلاب کے سامنے علمی اور استدلالی بند باندھنے کی کوشش۔
- ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں میں تقریری و تحریری صلاحیت کی نشو و نما۔ تاکہ ان مختلف زبانوں میں دعوت اسلامی کو پیش کیا جا سکے۔

انھوں نے خوف زدہ اور ہراساں مسلمانوں کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت میں کبھی

کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس وقت وہاں کی اسلامی تنظیم مسلمانوں کے اندر نہایت مقبول اور دیگر تنظیموں کے مقابلہ میں بڑا وزن رکھتی ہے۔

لنکا

ہندستان کے بعد لنکا میں بھی مولانا مودودی کی فکر سے وابستہ لوگ ایک جماعت کی صورت میں منظّم ہیں۔ جن کی بیشتر تعداد اساتذہ اور طلبا پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ عام مسلمان شہریوں میں بھی اس کا اثر بڑھ رہا ہے۔ یہ لوگ وہاں مسلم برادر ہڈ مومنٹ (Muslim Brother hood mavement) کے نام سے کام کر رہے ہیں، ان کے اپنے جرائد بھی نکلتے ہیں۔ باقاعدہ ہفتہ وار اجتماعات بھی منعقد ہوتے ہیں۔ ان میں وہ

____ اصلاحِ اخلاق
____ اصلاحِ معاشرہ
____ اور ____
____ توسیع دعوتِ اسلامی

کا پروگرام بناتے ہیں۔ انھوں نے مولانا مودودی کی کچھ تصانیف کا ترجمہ بھی مقامی زبان میں کیا ہے۔ تاجر طبقے میں بھی ان کے اثرات بڑھ رہے ہیں۔

امریکہ

امریکا اور یورپ میں بھی مولانا مودودی کی فکر کو پھیلایا جا رہا ہے، مختلف ناموں سے تنظیمیں کام کر رہی ہیں، ان کے ہفتہ واری، ماہانہ، سہ ماہی، شش ماہی اور سالانہ اجتماعات اور جلسے منعقد ہوتے ہیں، مولانا کی کتابوں کو منگوا کر وسیع پیمانے پر پھیلایا جا رہا ہے۔ خود وہاں کی زبانوں میں بھی مولانا کی کتابوں کے ترجمے ہوئے ہیں اور یہ کام بڑی تیزی سے جاری ہے۔

ان کے علاوہ ماریشس میں مولانا مودودیؒ کے ایک رفیق کار بہت دنوں سے منتقل ہو کر چلے گئے اور وہاں تعلیمی اداروں اور مسلم عوام میں کام شروع کر دیا۔ ایک اخبار کی ادارت، ایک اسکول کی ہیڈ ماسٹری، ایک مسجد کی خطابت اور درسِ قرآن وحدیث کے ذریعے وہ مولانا کے مشن کو

ماریشس میں پھیلاتے رہے ہیں، جس کے نتائج بہت تسلی بخش ثابت ہوئے۔اب تو وہاں بڑا حلقہ وجود میں آچکا ہے۔

سیول کوریا کے نوجوانوں میں مولانا کی تصانیف پڑھی جارہی ہیں۔ برما، لاؤس، ویسٹ انڈیز، برٹش گی آنا، جنوبی امریکہ، پرٹیوریا، جنوبی افریقہ، کانو، نائیجیریا، مراکش میں بھی مولانا کی دعوت ان کی اردو، عربی اور انگریزی تصانیف کے ذریعے پہنچ رہی ہے۔

جنوبی افریقہ سے بھی مولانا کو تبلیغی دورے کے لیے بار بار دعوت آچکی ہے اور مولانا اس کے لیے تیار ہیں۔

پرٹیوریا کی اسلامک سوسائٹی نے بھی مولانا کی تصانیف کا انگریزی ترجمہ کرنے کی اجازت حاصل کر لی ہے۔

ماریشس کی حکومت نے بھی اپنے مدارس میں مولانا کی دعوت سے متعلق بعض کتب اپنے ہاں داخل نصاب کر لی ہیں۔

لاہور میں کلوکیم کے موقعے پر بھی جہاں مولانا نے ''اسلام میں اجتہاد کا مقام'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔دور نزدیک کے مسلم وغیر مسلم اہلِ علم سے مولانا کا براہِ راست تعارف ہوا، جس کے بڑے اچھے اثرات مترتب ہوئے۔

اس کے علاوہ مسلم عرب ممالک میں بھی مولانا کی تصانیف بڑی کثرت سے پھیل رہی ہیں۔ مولانا کے ایک دورے کے موقعے پر کویت کے مسلمانوں نے اسی مقصد کے لیے پچاس ہزار روپے کا فنڈ جمع کیا، جسے توسیع وتعارف دعوت نشر واشاعت دینی کے لیے وقف کر دیا گیا۔مصر، عراق، شام، لبنان، سعودی عرب، شمالی افریقہ، ترکی، انڈونیشیا، ملایا میں بھی اردو، عربی، انگریزی کتب کثرت سے پہنچ رہی ہیں اور ان کے ترجمے مقامی اور یورپی زبانوں میں ہو رہے ہیں۔

مختلف زبانوں میں تصانیف کے تراجم

اب تک اندازاً ۱۷ مختلف زبانوں میں مولانا مودودی کی دینی، علمی اور تحقیقی کتب کے تراجم ہو چکے ہیں۔ان کا ایک مختصر خاکہ یہاں دیا جارہا ہے۔مندرجہ ذیل اعداد و شمار مولانا کے ۱۹۵۷ کے ریکارڈ سے حاصل کیے جاسکے ہیں۔انگریزی ۳۴ مطبوعات کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

عربی ۳۵ مطبوعات، بنگالی ۳۲ مطبوعات، سندھی ۲۴ مطبوعات، پنجابی ۱۵ مطبوعات، پشتو ۶ مطبوعات، ہندی ۱۵ مطبوعات، گجراتی ۸ مطبوعات، ملیالم ۱۱ مطبوعات، تامل ۶۱ مطبوعات، تلگو ۳ مطبوعات، مراٹھی ۹ مطبوعات، کنڑی ۳ مطبوعات، ترکی ۲ مطبوعات اور انڈونیشیائی ۳ مطبوعات کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا مودودی کی دعوت اور مشن ایک جہانی اور عالمگیر مشن ہے۔ ہر نظریۂ حیات کے لیے کسی نہ کسی تجربہ گاہ کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ وہ عملی نقشے دنیا کو بتا سکے کہ وہ اپنے اندر فلاحِ عالم کے لیے کیا کچھ عملی خوبیاں رکھتا ہے۔ مولانا مودودی کے مشن اور دعوت کو اب تک کوئی تجربہ گاہ تو میسر نہیں آئی لیکن جس انداز سے وہ دنیا کے مختلف مسلم اور غیر مسلم ممالک کے اندر نفوذ کر رہی ہے۔ اس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی نظامِ حیات کے حق میں عقلی فضا اور رائے عامہ ضرور ایسی پیدا ہو جائے گی کہ اگر اس نظریہ کو کوئی تجربہ گاہ میسر آ گئی تو دنیا اس کی طرف پر امید نگاہوں سے دیکھے گی اور وہ ظالمانہ نظریہ ہائے حیات کی کشمکش میں اسلام کی وہ تجربہ گاہ دنیا کے لیے امیدوں کا مرکز اور روشنی کا مینار ہوگی۔

مولانا مودودی اور اربابِ اقتدار

ایک خطرناک آدمی

اربابِ اقتدار کی نظر میں مولانا مودودیؒ ایک خطرناک آدمی ہیں۔ خطرناک بھی ایسے کہ لوگوں کی فہرست میں سر فہرست درج ہیں۔ ان کا علم و فضل مسلّم، ان کا تقویٰ اور خدا ترسی تسلیم، ان کا استدلال لاجواب، ان کی حب الوطنی لاریب، ان کا فہم دین شک وشبہ سے بالا، ان کا مقصدِ زندگی، اسلامی نظامِ حیات کا قیام، لیکن وہ پھر بھی ایک خطرناک آدمی ہیں۔ اربابِ اقتدار کا نقطہ نظر یہی ہے۔ ان کی خطرناکی کے اسباب کیا ہیں؟ یہ بات گزشتہ ۱۲، ۱۳ سال کے عرصے میں مولانا پر مقدموں، جیلوں اور سزاؤں کے پے در پے حملوں کے باوجود نہ اربابِ اقتدار کی طرف سے واضح کی گئی ہے اور نہ واضح ہوئی ہے۔ بس ایک گونگی لڑائی ہے، جو ان کے خلاف لڑی جارہی ہے۔ یہ صورتِ حال ملک کے اجتماعی مفاد سے گہری دلچسپی رکھنے والے اہلِ دل حضرات کے لیے بڑی پریشانی اور فکرمندی کا باعث ہے۔ لوگ دعائیں کرتے ہیں کہ کاش اربابِ اقتدار مولانا کے علم و فضل اور علومِ جدید وقدیم پر گہری نظر سے استفادہ کرسکیں۔ کاش مولانا کی بہترین علمی، تنظیمی، دینی، فکری اور قائدانہ صلاحیتیں ملک وملت کی تعمیر میں بہتر طور پر کام آسکیں اور وہ ملک جو بڑی پاکیزہ تمناؤں، بڑے اونچے اسلامی دعوؤں اور بڑی خونریز قربانیوں کے بعد وجود میں آیا ہے، وہ دینِ اسلام کی اس دورِ جدید میں ایسی لیبارٹری بن سکے جہاں دور دور سے لوگ آکر اسلام کی برکات دیکھیں اور چشم سر سے انسانی مساوات اور اخوت، عدل و رواداری کے نمونے دیکھ کر اسلام کی حقانیت کے قائل ہوں۔ لیکن یہ تمنائیں برسوں سے دم سادھے لوگوں کے سینوں میں

دفن پڑی ہیں۔ اور اربابِ اقتدار سخت ناراض ہیں کہ مولانا مودودیؒ ایسی باتیں بھی کیوں زبان پر لاتے اور قلم سے تحریر کرتے ہیں جو انھیں ناگوار ہوتی ہیں اور جن کا تعلق اس ملک میں دین کے احیا سے ہوتا ہے۔

دو مدارسِ فکر

ہمارے ملک میں اس وقت دو طبقے کھلم کھلا علمی، فکری، معاشرتی اور سیاسی میدان میں متصادم ہیں۔ ایک مغرب سے مرعوب اور متاثر ہے اور دوسرا اسلام کو اپنی اصلی شکل میں لانا چاہتا ہے۔ مغرب پسند طبقہ بھی اکثر و بیشتر اسلام کا ہی نام لیتا رہتا ہے، لیکن اس میں زمانے کی ضروریات کے مطابق ترمیم وتجدید اور کمی واضافہ کا مطالبہ کرتا رہتا ہے اور بہ ظاہر اس طبقے کے عمل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ان ترمیمات کی ضرورت ان کے اندر مغربی تہذیب کے تقاضے پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی زندگیاں اور کارگزاریاں کچھ ایسی گواہیاں گزشتہ برسوں سے عوام کے سامنے پیش کر رہی ہیں، لیکن بہرحال نام وہ بھی اسلام ہی کا لیتے ہیں۔ پھر ان میں تصادم کیوں ہے! کیا ایسا تو نہیں ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک طبقہ اسلام کے بارے میں مخلص نہ ہو۔ دونوں کی منزل الگ الگ ہو اور دونوں میں سے کوئی ایک فریق اسلام کا نعرہ محض سیاسی مقاصد اور پالیسی کے طور پر لگا رہا ہو اور اس نے اسلام کو بہ طور نظامِ حیات کے ترک کر دیا ہو۔ ہماری گزشتہ ۱۲، ۱۳ سالہ تاریخ کا طویل عرصہ مغرب پسند طبقے کے بارے میں مسلسل یہی گواہی دیتا چلا آ رہا ہے۔ مولانا مودودیؒ کا بھی یہی خیال ہے۔ انھوں نے ستمبر ۱۹۵۰ کے ترجمان القرآن میں اس کی نشان دہی کی ہے:

> ”دراصل اس ملک میں دو مستقل مدارسِ فکر پائے جاتے ہیں، جن میں سے ہر ایک کے پیچھے ایک لمبی تاریخ ہے، ہر ایک کو بہت سے اخلاقی، ذہنی اور تمدنی اسباب نے پرورش کیا ہے۔ ہر ایک کی جڑیں ہماری سوسائٹی میں دور دور تک پھیلی اور گہری جمی ہوئی ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ دوسرے کو پھونک مار کر اڑا دے۔ ایک مدرسۂ فکر وہ ہے جو مغرب کے سیاسی، علمی، اخلاقی اور معاشی غلبہ سے ہمارے اندر پیدا ہوا

ہے، اس میں مختلف رجحانات کے لوگ موجود ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو عقیدہ و عمل دونوں میں اسلام سے منحرف ہو چکے ہیں اور اس بات کو نہیں چھپاتے کہ انھیں اسلام کی پیروی منظور نہیں ہے۔ کچھ وہ ہیں جن کا انحراف قریب قریب اسی درجے کا ہے۔ مگر سراسر منافقت اور مکاری کے ساتھ وہ اسلام کے ترجمان اور علمبردار بن رہے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو اسلام کو بالکل تو چھوڑ دینا نہیں چاہتے مگر پورے اور اصل اسلام کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ اپنے مذاق اور رجحان کے مطابق ایک نیا اسلام بنانا چاہتے ہیں، جس میں اسلام کی صرف وہ چیزیں باقی رہ سکتی ہیں، جو ان کو پسند ہوں۔ ان مختلف رجحانات کے لوگوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ ان کی نگاہ میں شعوری یا غیر شعوری طور پر معیارِ حق وہ افکار و اقدار و اطوار ہیں، جو مغربی تعلیم و تہذیب کے زیر اثر انھوں نے اختیار کیے ہیں اور خدا اور رسولؐ کی ہدایت ان کے لیے حجت نہیں ہے کہ جو کچھ اس سے ثابت ہو وہ اس کے آگے سر جھکا دیں۔ اس مدرسۂ فکر کے لوگ اگرچہ تھوڑے ہیں اور ہمارے عوام کے دل و دماغ ان کے ساتھ نہیں ہیں، لیکن زمام کار اس وقت انھی کے ہاتھ میں ہے۔ کیوں کہ انگریزی اقتدار کے دور میں آگے بڑھنے کے جتنے مواقع بھی ملے، زیادہ تر انھی کو ملے اور چلتے وقت انگریز نے اپنی میراث بھی اپنے اسی خلف الصدق گروہ کو سونپی۔

دوسرا مدرسۂ فکر وہ ہے جو اسلام کی اندرونی قوتِ حیات کے نتیجے میں ہمارے اندر پایا جاتا ہے۔ اس میں بھی اگرچہ مختلف رجحانات کے لوگ موجود ہیں، جن کے درمیان جزئیات و فروع اور مذاق طبیعت کے لحاظ سے بہت کچھ اختلافات ہیں مگر قدرِ مشترک ان سب کے درمیان یہ ہے کہ وہ اسلام ہی کو اپنے لیے نظامِ زندگی کی حیثیت سے پسند کرتے ہیں اور تمام معاملات زندگی میں اسی ہدایت کو حجت مانتے ہیں جو خدا اور رسولؐ سے ثابت ہو۔ یہ مدرسۂ فکر انگریزی اقتدار کے پورے دور میں مغلوب و

مقہور رہا ہے۔ نشو ونما کے ذرائع سے محروم رہا۔ ہر شعبۂ زندگی میں زمام کار سے بے دخل رہا اور اب بھی کم و بیش اس کا یہی حال ہے۔ لیکن اسلام کے وہ تمام اخلاقی اور روحانی، ذہنی و فکری اور تہذیبی و تمدنی اثرات جن کی بدولت پچھلی تیرہ صدیوں میں ہر قسم کے مخالف حالات میں اسلام زندہ رہا اس مدرسے کی پشت پر موجود ہیں۔ خود اس ملک کے اندر گزشتہ تین صدیوں سے تجدید و احیائے اسلام کی جو تحریکیں پے در پے اٹھتی رہی ہیں۔ وہ سب اپنی طاقت و اثرات کے ساتھ اس مدرسۂ فکر کی بنیاد مضبوط کر رہی ہیں۔ قوم کے متوسط اور اہلِ دماغ طبقے کی اکثریت اس کے ساتھ ہے۔ قوم کے عوام اپنی جہالت و بے شعوری کے باوجود اس کے نصب العین سے متفق اور اس کے رجحانات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور اس پورے مدرسۂ فکر میں یہ جذبہ مشترک ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی کی گاڑی اس رُخ پر نہ جائے جدھر اسلام سے انحراف اور اسلام میں تحریک کرنے والے لوگ اسے لے جانا چاہتے ہیں بلکہ اس کی سمتِ سفر اسلام کی طرف موڑ دی جائے۔"

ان دو نمایاں طبقوں میں سے مولانا مودودی دوسرے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تعلق ہی نہیں رکھتے بلکہ اس کے رہنما اور علمبردار ہیں۔ دوسری طرف اربابِ اقتدار پہلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور تعلق ہی نہیں رکھتے بلکہ اس کے داعی اور علمبردار بنے چلے آ رہے ہیں۔ تصادم کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ یہ تصادم عمل کے میدان میں دونوں طبقوں کے ضمیر کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ قوت پا کر ظلم و زیادتی کرنا ہر بزدل، کم ظرف، اقتدار پرست، خدا ناشناس، انسان کا کام ہوتا ہے، وہ کسی شخص کو چاہے وہ حق پر ہی کیوں نہ ہو اپنے مقابل سر بلند دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ جبر و استبداد کی طویل ترین انسانی تاریخ میں ایسے انسانوں کی بے شمار خون آلود مثالیں جا بجا پائی جاتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہر قسم کے جبر و ستم پر اُف نہ کرنا، مردانگی سے سارے مظالم سہہ جانا اور اپنے نصب العین اور موقف کے لیے سر تک کٹا دینا حق پرست انسانوں کا ہمیشہ شیوہ رہا ہے اور تاریخ کا دامن ایسی پرنور مثالوں سے بھی خالی نہیں ہے۔

دباؤ کے تین طریقے

عام سیاسی مخالفین کے ساتھ معاملہ کرنے میں اربابِ اقتدار عموماً تین طریقے اختیار کیا کرتے ہیں، جو جمہوری اقدار کو ذبح کرنے والے اور اخلاقی اصولوں کی پامالی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اگرچہ کسی مسلم معاشرے میں ان طریقوں کا استعمال سخت غیر مناسب اور غیر مستحسن ہوتا ہے۔ لیکن وہ اربابِ اقتدار جنھیں ان دونوں قسم کی روایات کا احترام نہ ہو عموماً ان کے استعمال سے گریز نہیں کرتے۔

☆ جبر و تشدد، ظلم و زیادتی اور سیاسی دباؤ (Political caerewn) سے فریق مخالف کو پست ہمت کرنا۔ قید و بند، سیفٹی قوانین اور جان و مال اور آبرو پر حملے۔

☆ دھوکہ اور فریب سے بدنام کرنا۔ الزام تراشیاں اور سی آئی ڈی کے ذریعے کسی نہ کسی چکر میں لا کر درپے آزار ہونا۔

☆ لالچ اور طمع کے ہتھیار استعمال کرنا۔ ضمیروں کی خرید و فروخت اور عہدہ و منصب کے لالچ سے حریف کو رام کرنا۔

مولانا مودودیؒ پر گزشتہ ۱۲، ۱۳ سال میں یہ تینوں طریقے استعمال کیے گئے ہیں اور یہ مولانا مودودیؒ کا کردار ہے کہ وہ ان تینوں آزمایشوں میں کامیاب ہو کر نکلے ہیں۔

ایک تاریخی کردار

مولانا مودودی کے ساتھ کوئی معاملہ کرنے سے پہلے ارباب اقتدار کو جان لینا چاہیے کہ مولانا کس نوعیت کے انسان ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ ملوکیت میں اسلام کو مظلوم و مقہور دیکھ کر تاریخ کے مختلف ادوار میں یہ کردار بار بار ابھرتا رہا ہے اور ابھر کر ہر قسم کے ظلم و جور اور مصائب و مشکلات کے علی الرغم بڑے بڑے جابر سلاطین کے سامنے حق گوئی، حق پرستی اور حق پناہی کا فرض انجام دیتا رہا ہے اس کردار کا انداز ہر دور میں یکساں رہا ہے۔ نہ وہ کبھی خدا کے سوا کسی سے ڈرا ہے، نہ کتاب وسنت کے سوا اس نے کسی دوسرے کی اتھارٹی کو تسلیم کیا ہے، نہ دنیوی فوائد کا کبھی لالچ کیا ہے، نہ دھمکی سے مرعوب ہوا ہے، نہ قوت کے سامنے جھکا ہے نہ چال بازوں کے مکر وفریب کے جال میں پھنسا ہے اور نہ اپنا فرض حق پرستی بجالانے میں کبھی کوتاہی کی ہے۔ خلافتِ اسلامی

اپنے سارے لوازم کے ساتھ موجود تھی لیکن ملوکیت کی داغ بیل ڈالنے کے لیے عوامی نمائندگی کی بجائے وراثت کا اصول اسلام کے نظام سیاسی میں یزید کے ساتھ داخل ہوا تو یہ کردار حضرت حسینؓ کی شکل میں اٹھ کھڑا ہوا اور اس دستوری انحراف پر اس نے تن، من، دھن کی بازی لگا دی اور ہر قسم کے ظلم و تشدد سے بے نیاز ہو کر جان پر کھیل گیا۔

امام مالکؒ کی شکل میں اٹھا تو وقت کے جابر سلطان منصور عباسی کے جاہ وجلال سے بے نیاز ہو کر معاملہ طلاق جبری کے عدم صحت کا فتویٰ دے دیا۔ عین اس وقت جب مشکیں اس زور سے کسی گئی تھیں کہ ہاتھ بازو سے اکھڑ گئے اور کوڑوں کی ضربیں جسم پر پڑ رہی تھیں۔ امام دارالہجرۃ کی زبان حق پرست بہ آواز بلند کہہ رہی تھی ''جو مجھے جانتا ہے سو جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں اور اس مسئلے کا اعلان کرتا ہوں، جس کے اعلان سے مجھے جبراً روکا جا رہا ہے کہ جبری طلاق درست نہیں ہے۔'' انھیں خون آلود کپڑوں میں نماز عشق ادا کی اور کون نہیں جانتا کہ ان باتوں سے اس کی عظمت کا سکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے قلوب اور تاریخ اسلام کے صفحات پر ثبت ہو گیا۔

سلطانِ جابر کے سامنے کلمۂ حق بیان کرنے کو عملی طور پر جہاد اکبر تو سب جانتے ہیں لیکن اس کی لذت سے وہی آشنا ہوتا ہے، جو یہ حق گوئی کرتا اور اس کی سزا چکھتا ہے۔ یہ جو فرمایا کہ ظلم و مصائب کے بڑے سخت دن آنے والے ہیں، اس وقت حق کی راہ میں صبر کرنا ایسا سخت ہو گا، جیسے انگاروں کو مٹھی میں تھام لینا۔

تو یہ بات سب اہلِ علم جانتے ہیں لیکن ان انگاروں کو مٹھی میں تھامنے کے لیے ہر کوئی آگے نہیں بڑھتا۔ لیکن جو کوئی بھی آگے بڑھتا ہے، وہ اپنے مالک کے ساتھ نقد جان کا سودا کر کے حق الیقین کے ساتھ آگے آتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ اگر وقت کے اربابِ اقتدار وہی معاملہ روا رکھیں جو عام مجرموں کے ساتھ رکھا جاتا ہے، تو اس سے بڑی ان کی بدقسمتی اور بدبختی کیا ہو سکتی ہے۔

مامون اور معتصم جیسی شان و شوکت کے بادشاہوں نے جب ایک مردِ خدا سے حق کے خلاف مطالبہ کیا تو اس نے ان کے جبر وستم کے باوجود سر جھکانے سے صاف انکار کر دیا۔ امام احمد بن حنبلؒ کو چار چار بوجھل بیڑیاں ڈالی گئیں اور عین رمضان المبارک کے عشرے میں دھوپ میں بٹھا کر کوڑے مارے گئے لیکن انھوں نے ہر ضرب پر یہی جواب دیا کہ

''اللہ کی کتاب میں سے کچھ دکھلا دو یا اس کے رسولؐ کا کوئی قول پیش کرو تو میں اقرار کر لیتا ہوں، اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتا، جو تم پیش کرتے ہو، میں نہیں جانتا کہ یہ کیا بلا ہے۔ اس کائنات ہستی میں میرے سر کو جھکانے والی دو ہی چیزیں ہیں اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت اس کے سوا نہ میرے لیے کوئی دلیل ہے نہ علم۔''

کسی نے پوچھا کہ ''جب تلوار کے نیچے کھڑے کر دیے گئے تب تو مانو گے''۔ جواب دیا کہ ''نہیں''۔ لیکن ان کے رعب وجلال کا یہ عالم تھا کہ شاہی کوتوال کہتا تھا:

''میں نے کسی انسان کو بادشاہوں کے آگے احمد بن حنبلؒ سے بڑھ کر بارعب نہ پایا۔ ہم عمالِ حکومت تو ان کی نظروں میں مکھیوں سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے۔''

منصور عباسی جیسے باجبروت بادشاہ کو امام ابوحنیفہؒ نے شاہی عہدۂ قضا سے انکار کرتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا:

''اگر کوئی مقدمہ آپ پر دائر ہو اور آپ مجھ سے یہ چاہیں کہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کروں اور دھمکی دیں کہ ایسا نہ کرو گے تو تمھیں دریا میں غرق کر دوں گا تو یاد رکھیے میں دریا میں ڈوب جانے کو پسند کروں گا، لیکن خلاف انصاف فیصلہ کروں یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ قاضی تو اس شخص کو ہونا چاہیے، جو آپ کے خلاف بھی فیصلہ کرنے کی قوت رکھتا ہو۔ آپ کے خلاف بھی اور آپ کے بال بچوں کے خلاف بھی۔ آپ کے سپہ سالاروں اور فوجی افسروں کے خلاف بھی۔''

''ابن ہبیرہ جیسے ظالم اور قاہر انسان سے جب امامؒ کا معاملہ پیش آیا تو امامؒ نے اس کے حکم کے خلاف قضا کی خدمت قبول کرنے سے بھی صاف انکار کر دیا۔ ابن ہبیرہ نے خوفناک سزا دینے کی قسم کھائی تو امام نے نہایت اطمینان سے کیا:

''دنیا میں اس کے مار لینے کو آخرت کے آہنی گرزوں کی مار سے میں آسان خیال کرتا ہوں۔ خدا کی قسم میں اسے ہرگز قبول نہیں کروں گا۔ چاہے ابن ہبیرہ

مجھے قتل ہی کیوں نہ کر دے۔اور جب امامِ برحق پر کوڑے برس رہے تھے اور خون بہہ بہہ کر ان کی ایڑیوں تک آرہا تھا۔تو نہایت بے نیازی سے ان کی زبان پر تھا،بس صرف ایک ہی مدت تک اس کا اقتدار ہے۔"

پھر کہا:

"یاد کر اس وقت کو جب اللہ تعالیٰ کے سامنے تو بھی کھڑا کیا جائے گا اور آج تیرے سامنے میں جتنا ذلیل کیا جا رہا ہوں اس سے کہیں زیادہ ذلت کے ساتھ تو خدا کے دربار میں پیش کیا جائے گا۔اس وقت بجز سچی بات کے تیرا کوئی جواب نہ سنا جائے گا۔"

قاضی ابو یوسف نے شاہی عہدۂ قضا پر مامور ہونے کے باوجود بادشاہ سے صاف صاف کہہ دیا تھا:

"آپ پر ایک بڑی ذمے داری عائد کی گئی ہے،جس کا ثواب تمام ثوابوں میں بڑا ہے،لیکن اس کی سزا بھی تمام سزاؤں میں بدتر اور سخت ہے۔آپ کے سپرد اُمت کے معاملات کیے گئے ہیں اور آپ ذمے دار ٹھہرائے گئے ہیں کہ خدا کی بے شمار مخلوق کے حقوق کی بنیادوں کو مستحکم کریں۔خدا آپ پر ذمے داری عائد کر کے آزمایش کر رہا ہے۔میں یہ کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ خدا کے ڈر پر جس تعمیر کی بنیاد نہ رکھی جائے گی،اس کے متعلق ڈرتے رہنا چاہیے کہ کس وقت قدرت اس کو اوندھے منہ گرا دیتی ہے۔"

امام حسن بصریؒ کو جب اربابِ اقتدار سے واسطہ پیش آیا تو انھوں نے بھی ابن ہبیرہ جیسے جابر حاکم سے صاف صاف کہہ دیا:

"ابن ہبیرہ!یزید کے بارے میں خدا کا خوف کر اور خدا کے معاملے میں اس کا خوف نہ کیا کر۔خدا تجھ کو یزید سے بچا سکتا ہے لیکن یزید تجھ کو خدا سے نہیں بچا سکتا۔وہ زمانہ قریب ہے کہ خدا تیرے پاس ایسا فرشتہ بھیجے گا جو تجھ کو تختِ حکومت سے اُتار کر اور قصر کی وسعت سے نکال کر قبر کی تنگی میں ڈال دے گا۔اس وقت تیرے اعمال کے سوا کوئی اور شے تجھ کو نجات نہ دلا

سکے گی۔ خدا نے بادشاہ اور حکومت کو اپنے بندوں کی امداد و اعانت کے لیے بنایا ہے۔ اس لیے تم خدا کے بندوں پر سوار نہ ہو جاؤ۔ خدا کی معصیت میں کسی مخلوق کی اعانت نہ کرنی چاہیے۔''

سعید بن مسیّبؒ نے بھی ظالم حاکم سے کوڑوں کی مار کے مقابل میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ:

''کتاب اللہ کا حکم سنانے سے مجھے کوئی چیز روک نہیں سکتی، جو تیرے جی میں آئے کر گزر۔ عنقریب تجھ پر برا وقت آنے والا ہے۔ تمھارا حال یہ ہے کہ انسانوں کو بھوکا رکھتے ہو اور کتوّں کا پیٹ بھرتے ہو۔''

تاتاریوں نے جب دمشق پر حملہ کیا تو وقت کے مردِ حق آگاہ ابنِ تیمیہؒ نے بادشاہِ تاتار جس کی خوں ریزی سے سارا عالم کانپ رہا تھا کو صاف صاف کہہ دیا:

''تمھارا دعویٰ ہے کہ تم مسلمان ہو اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمھارے ساتھ قاضی، امام، شیخ اور موذنین بھی رہا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود تم نے ہم مسلمانوں پر حملہ کیا۔ حالاں کہ تمھارے باپ اور دادا کافر ہونے کے باوجود ایسے اعمال سے محترز تھے۔ انھوں نے جو کچھ عہد کیا اسے پورا کیا اور تم نے جو عہد کیا تھا وہ توڑ دیا اور جو کچھ کہا تھا اسے پورا نہیں کیا اور بندگانِ خدا پر ظلم کیا۔''

بادشاہ نے دعا کے لیے درخواست کی تو حسب ذیل الفاظ میں دعا کی:

''خدایا! اگر آپ کے نزدیک قازان کا اِس جنگ سے مقصد تیرے کلمہ کی بلندی اور جہاد فی سبیل اللہ ہے، تو اس کی مدد فرما اور اگر سلطنت دنیا اور حرص و ہوس ہے تو اس سے تو سمجھ لے۔''

پھر ایک وقت آیا جب شیخ الاسلام کو اربابِ اقتدار نے جیل بھیج دیا۔ لیکن وہ اس ظلم کے باوجود اپنے مسلکِ حق پرستی پر قائم رہے اس بات کا انھوں نے اپنے ایک رِسالے میں تذکرہ کیا ہے:

''ایک دن میرے پاس داروغہ جیل آیا اور اس نے کہا نائب السلطنت نے سلام بھجوایا ہے اور فرماتے ہیں کہ آخر کب تک جیل میں رہنا ہے کیا نکلنے کا ارادہ نہیں۔ کیا اب بھی آپ اسی

بات پر قائم ہیں؟ میں نے کہلا بھیجا کہ مجھے تو معلوم نہیں کہ میں کس جرم میں قید کیا گیا ہوں۔ پھر داروغہ کے ساتھ دوسرا آدمی آیا انھوں نے ایک محضر نامہ نکالا، جس میں خلافِ واقعہ اور غلط باتیں لکھی تھیں۔ اصرار کیا کہ میں اس مطالبے کو منظور کرلوں۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ اس معاملے میں مجھے فیصلے کا حق نہیں یہ معاملہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور تمام عالم کے مسلمانوں کا ہے۔ مجھے اللہ کے آئین میں تغیر و تبدّل کا اختیار نہیں۔ میں تمھارے اور کسی دوسرے کی وجہ سے دین اسلام سے ہٹ نہیں سکتا اور نہ کذب و بہتان کا اقرار کرسکتا ہوں۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ اصرار کرتے ہیں تو پھر میں نے بھی سختی سے بات کی اور کہا کہ یہ فضول باتیں چھوڑو۔ جاؤ اور اپنا کام کرو۔ میں نے تم سے اس کی درخواست نہیں کی تھی کہ تم مجھے جیل سے نکالو۔ دروازہ کھولو میں جاتا ہوں۔ گفتگو بند ہے۔ میں نے قاصد سے یہ بھی کہہ دیا کہ اس معاملہ کا نقصان مجھ پر عائد نہیں ہوتا۔ مجھے کس بات کا اندیشہ ہوسکتا ہے اگر میں اس مقدمہ میں قتل کر دیا گیا تو میں بڑے درجہ میں شہادت پاؤں گا اور یہ میرے حق میں بڑی سعادت ہوگی۔ قیامت تک وہ لعنت کے مستحق ہوں گے۔ اس لیے کہ ساری اُمتِ محمدی کو معلوم ہے کہ میں اسی حق پر مارا جارہا ہوں جس کے ساتھ اللہ نے اپنے رسولؐ کو مبعوث فرمایا اور اگر میں محبوس کر دیا گیا تو خدا کی قسم میرا محبوس ہونا اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم ترین نعمت ہوگی اور مجھے کسی ایسی چیز کا خوف نہیں جو لوگ مجھ سے یقین لیں گے۔"

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا یہ مقدمہ پاکستان کے اندر مولانا مودودیؒ کے حالات سے بہت مشابہ نظر آتا ہے۔

امام غزالیؒ نے تو سلاطین وقت کے بارے میں صاف صاف کہہ دیا:

"ہمارے زمانے میں سلاطین کے تمام یا اکثر اموال حرام ہیں۔ ان سلاطین کو نہ اپنی صورت دکھانی چاہیے، نہ ان کی دیکھنی چاہیے انسان کے لیے لازم ہے کہ ان کے علم سے بغض رکھے، ان کی تعریف نہ کرے۔ ان کے حالات سے کوئی واسطہ نہ رکھے اور ان کے ہاں رسائی رکھنے والوں سے بھی دور رہے۔"

انھوں نے دوران گفتگو میں بادشاہِ وقت سے رو در رُو کہہ دیا تھا:

تیرے گھوڑوں کی گردن ساز زرّین سے نہ ٹوٹی تو کیا مسلمانوں کی گردن تو فاقہ کشی کی مصیبت سے ٹوٹ گئی۔"

اور ایک دوسرے حاکمِ وقت کو کہا:

"ظلم حد سے گزر چکا ہے چوں کہ مجھے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھنا پڑتا تھا، اس لیے تقریباً ایک سال سے میں نے طوس کا قیام ترک کر دیا ہے تا کہ بے رحم و بے حیا ظالموں کی حرکات دیکھنے سے خلاصی پاؤں۔"

زمانۂ قریب میں شاہ ولی اللہ نے اسی حق گوئی و حق پرستی کا حق ادا کیا۔ مسلمان بادشاہوں کے بارے میں خود ان کی موجودگی میں صاف صاف لکھ دیا:

"ان لوگوں کی حکومت مجوسیوں کی حکومت کے مانند رہی ہے، بس فرق صرف یہ ہے کہ یہ نماز پڑھتے ہیں اور کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرتے رہے ہیں۔ ہم اس تغیر کے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں معلوم نہیں آگے چل کر اللہ تعالیٰ کیا دِکھانا چاہتا ہے۔"

اور آگے چل کر لوگوں نے جو دیکھا، وہ یہ دیکھا کہ آئندہ آنے والے مسلمان حاکم ان دو ضروریات دین سے بھی بے نیاز ہو گئے اور خود مسلمانوں پر ہی ظلم و ستم میں پہلے سے زیادہ جری اور بیباک ہو گئے۔ چناں چہ شاہ صاحب نے اس وقت کے امرائے سلطنت کو مخاطب کر کے کہا:

"میں امرا سے کہتا ہوں کہ تمھیں خدا کا خوف نہیں آتا۔ تم فانی لذتوں کی طلب میں مستغرق ہو گئے اور رعیت کو چھوڑ دیا کہ ایک دوسرے کو کھا جائے۔ علانیہ شرابیں پی جا رہی ہیں اور تم نہیں روکتے۔ زنا کاری، شراب خوری اور قمار بازی کے اڈے برسرِ عام بن گئے ہیں اور تم ان کا انسداد نہیں کرتے۔ اس عظیم الشان ملک میں مدت ہائے دراز سے کوئی حد شرعی نہیں لگائی گئی، جس کو تم ضعیف پاتے ہو اُسے کھا جاتے ہو اور جسے قوی پاتے ہو اسے چھوڑ دیتے ہو۔ کھانوں کی لذت اور عورتوں کے زنانہ انداز۔ کپڑوں اور مکانوں کی لطافت، بس یہ چیزیں ہیں، جن میں تم ڈوب گئے ہو۔ کبھی خدا کا خیال تمھیں نہیں آتا۔"

اب انھیں اقتباس کے ساتھ ساتھ مولانا مودودی کے احوال پر بھی نظر ڈالیے۔ وہ پاکستان میں نظامِ اسلامی کا مطالبہ اٹھاتے ہیں اور ملک گیر مہم کر کے رائے عامہ ہموار کر دیتے

ہیں، جمہوری طریق سے وہ تمام دستوری تقاضے پورے کر دیتے ہیں اور ایک جمہوری ریاست میں یہ کافی ہوتا ہے کہ فلاں چیز کو جو ریاست کے بنیادی تصورات کے بھی خلاف نہیں ہے، جمہوریت چاہتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اربابِ اقتدار ایسی مہم اور ایسے کسی مطالبے کو ناپسند کرتے ہیں۔ اس لیے مولانا مودودیؒ کو سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے جیل بھجوا دیتے ہیں اور پھر مسلسل تین بار مدت قید میں اضافہ پر اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ بالآخر ایک قانونی سقم کی بنا پر ہی اربابِ اقتدار کی مرضی کے عین خلاف وہ جیل سے باہر آ جاتے ہیں۔ اس وقت مولانا اپنے بارے میں ان کو بتاتے ہیں کہ انھیں ان کے ساتھ کس طرح معاملہ کرنا چاہیے:

''میں نے اپنی عمر کا تقریباً دو تہائی حصہ مطالعہ، تحقیق اور غور و فکر میں صرف کیا ہے۔ اس تیس سال کی مدت میں پڑھ کر، سُن کر، سوچ کر اور سمجھ کر اور مشاہدہ اور تجربہ کر کے میرے ذہن کا ایک سانچہ بن چکا ہے، میری زندگی کا ایک نصب العین قرار پا چکا ہے۔ میری فکر کا ایک خاص انداز اور سوچنے کا ایک خاص طرز قائم ہو چکا ہے۔ میں کچھ رائیں رکھتا ہوں جن کی پشت پر برسوں کے مطالعے سے فراہم کیے ہوئے دلائل ہیں۔ میں نے کچھ چیزوں کو حق پایا ہے اور ان پر پورے قلبی و دماغی اطمینان کے ساتھ ایمان لایا ہوں اور کچھ چیزوں کو میں باطل پاتا ہوں اور ان کو قلب و دماغ کے متفقہ فیصلہ کے ساتھ رد کر چکا ہوں۔ میرے ذہن اور ضمیر کے یہ فیصلے میری ذات کی حد تک بھی محدود نہیں ہیں بلکہ میں برسوں سے ان کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ ہزاروں آدمیوں کو میں نے اس نصبُ العین کی طرف کھینچا ہے، جسے میں نے اپنی زندگی کا نصبُ العین بنایا تھا۔ ہزاروں کو اس حق کا قائل کیا ہے، جس حق کا میں خود قائل ہوا تھا۔ ہزاروں کا رشتہ اس باطل سے کٹوایا ہے، جس سے میں نے خود اپنا رشتہ کاٹا تھا اور ہزاروں بندگانِ خدا کی زندگیوں کو احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی اس جدوجہد میں مبتلا کر دیا ہے، جس میں خود مبتلا ہوں، اب اگر کسی نے یہ سمجھا تھا کہ میرے ذہن اور خیالات اور مقصدِ زندگی ہر چیز کو محض طاقت کی دھونس اور جیل کی دلیل سے بدلا جا سکے

گا، تو میں اس کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کا صحیح مقام ایوانِ حکومت نہیں بلکہ شفاخانہ امراض دماغی ہے اور اگر اس نے یہ توقع قائم کی تھی کہ اس دباؤ میں آ کر میں اپنا ضمیر اس کے ہاتھ میں رہن رکھ دوں گا اور آیندہ سے راشن کیے ہوئے خیالات ظاہر کرنے لگوں گا تو میں اس کو مطلع کرتا ہوں کہ اس نے میری سیرت کو اپنی سیرت پر قیاس کرنے میں غلطی کی ہے۔ میرا دل صداقت کے لیے تو ہر وقت کھلا ہوا ہے اور میری ہر رائے کو علمی اور عقلی دلائل سے بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن میرا ایمان و ضمیر کوئی قابل رہن و بیع چیز نہیں ہے، اس کی کوشش پہلے بھی جس نے کی ہے، ناکام ہوا ہے اور آئندہ بھی جو کرے گا ان شاءاللہ منہ کی کھائے گا۔'' (ترجمان القرآن شعبان ۱۳۶۹)

مولانا نے یہ باتیں اربابِ جفاپیشہ کی اطلاع کے لیے صاف صاف کہہ دی تھیں۔ تا کہ مولانا کا موقف ان پر ظاہر ہو جائے۔ لیکن انھوں نے جو اس سے سبق لیا وہ یہ ہے کہ اندھے بھینسے کی طرح اسی رُخ پر زور لگاتے چلے گئے اور مولانا کو آزاد پاکستان میں آ کر زندگی کا ایک بڑا حصہ جیل میں گزارنا پڑا۔

اسی طرح دین کے مفاد کے لیے مولانا کسی بڑی سے بڑی مصلحت اور بدتر سے بدتر خطرے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ وہ انھیں ہر شے سے زیادہ عزیز ہے اور اس پر ان کی پوری زندگی گواہ ہے۔

''میرے نزدیک خدا کا دین اور اس کی امت مسلمہ کا مفاد دنیا کی ہر شے اور تعلق سے قیمتی ہے۔ اور جب میں دیکھتا ہوں کہ کوئی شخص دانستہ یا نادانستہ اس کو نقصان پہنچا رہا ہے تو میں اس کی مزاحمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں، خواہ وہ میرا اقریب ترین عزیز دوست ہو، استاد ہو۔ میری قوم کا کوئی بڑے سے بڑا آدمی ہو۔ اس معاملے میں کسی تعلق یا کسی نیازمندی کی پروا کرنے سے میں بالکل معذور ہوں۔ جس کسی کو میرے اس طرزِ عمل سے تکلیف ہو وہ اگر اپنا حق پر ہونا دلیل سے ثابت کر دے گا تو میں نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کروں گا، بلکہ نہایت ادب سے معافی بھی چاہوں گا۔ خواہ وہ

دنیوی لحاظ سے حقیر ترین آدمی ہو اور اگر وہ مجرد شکایت کرے گا تو میں عرض
کروں گا کہ حق کے معاملے میں بڑے اور چھوٹے، اپنے اور پرائے کی تمیز
سے مجھے معاف رکھا جائے۔''

جسم مختلف روح ایک

مولانا مودودیؒ کے الفاظ پر غور کیجیے اور پھر تاریخ کے مختلف ادوار میں اصلاحِ اُمت کے لیے اٹھنے والے حضرات کے کہے ہوئے الفاظ پر نظر ڈالئے تو آپ دیکھیں گے کہ اربابِ اقتدار کے مقابلے میں ان سب حضرات کے الفاظ چاہے مختلف ہیں، لیکن ذہن ایک ہے۔ بیان مختلف ہیں لیکن لہجہ ایک ہے، جسم مختلف ہیں لیکن روح ایک ہے۔ دورِ تاریخ مختلف ہیں لیکن تصور ایک ہے، اپنے اپنے وقت میں جن اربابِ اقتدار سے انھیں واسطہ پڑا، ان حضرات میں سے کسی ایک نے بھی سرکاری درباری لہجہ یا انداز اختیار نہیں کیا۔ خوشامد کا پہلو اختیار نہیں کیا۔ درباری سرکاری تو وہ بنتا ہے، جس کے دِل میں روگ ہوتا ہے۔ بہ قول امام احمد بن حنبلؒ: سلاطین سے تو وہ ڈرتے ہیں، جن کے دل میں بیماری ہوتی ہے۔'' جس کا دل تندرست ہوتا ہے وہ اگر حق پر قائم ہے تو نہ کسی سے خوف کھاتا ہے اور نہ لالچ میں گھرتا ہے۔ وہ تو حق کی بے لاگ تیغ برّاں ہوتا ہے اور بدقسمت ہے وہ جس کے خلاف یہ تلوار چل جائے۔ اس لیے کہ اس تلوار کی دھار تو زمانے کے ساتھ ساتھ کاٹ کرتی چلی جاتی ہے۔ کیا حضرت ابراہیمؑ کی یہ تلوار آج تک نمرود کی نخوت کی گردن پر نہیں چل رہی ہے۔ کیا فرعونِ موسیٰ آج تک زمانے کے دریا میں روز بروز گہرے سے گہرے پانیوں میں غرق نہیں ہوتا جا رہا ہے۔ کیا یزید کی گردن پر آج تک امت کی تلوار حضرت حسینؓ کے انتظام میں نہیں لہرا رہی ہے وہ کون سا ظالم ہے، جس نے ظلم کیا ہو اور صدیوں تک زمانے کے ہر دور کے ساتھ ہر ہر نئی نسل نے اسے روایات تصورات اور تاریخ کے چوراہے پر کھڑا کر کے بار بار اور مسلسل سنگسار نہ کیا ہو۔ بدقسمت ہے وہ شخص جو اپنے آپ کو حق کے مقابلے میں لا کھڑا کرے اور پھر نسل انسانی کے درمیان ہمیشہ کے لیے نفرت و ذلت کا ہدف اور مثال بن جائے۔

ایک ہی مٹی

مولانا مودودی بھی اسی مٹی سے بنائے گئے ہیں، جس مٹی سے داعیانِ حق بنائے جایا کرتے ہیں۔ جو مٹی حق کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتی۔ جو جاہ و منصب کے لیے کھڑے نہیں

ہوتے بلکہ فریضۂ بندگی اور حق بندگی ادا کرنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور جنھیں اس دنیا کے مظاہر عیش و عشرت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ کسی سلطان کی جبہ سائی کریں اور کسی جابر کی آستاں بوسی کریں، جو بے غرض ہے بے لوث ہے، بے لاگ ہے اس کے جسم پر طعن و تشنیع و تشدد اثر نہیں کرتے اس لیے کہ وہ تو فرض کا پتلا ہے، جس کے اخلاقی جسم پر لوہے کی تلوار اثر نہیں کرتی بلکہ وہ تو لہرا کر اس میں سے اس طرح گزر جاتی ہے، جیسے ہوا میں سے گزرتی ہے۔ تلواریں تو غرض مند جسموں کو کاٹتی اور بیمار دلوں کو مجروح کرتی ہیں۔

دین مستغنی ہے

مولانا مودودی کا اِستغنا و وقار دعوت اور غیرتِ دینی کا اِستغنا ہے۔ وہ بے لاگ اور بے لوث قلب و نظر کا استغنا ہے۔ یہ وہ استغنا ہے، جو ہر داعی حق میں اربابِ اقتدار کے مقابلے میں ہوتا ہے۔ ان کا معاملہ تو یہ ہے کہ اگر ان کا معالج جیل میں ان کی دیرینہ بیماری کا علاج کرنا چاہتا ہے تو وہ اسے لکھتے ہیں ''بالمشافہ معائنہ کر کے علاج کے بارے میں رائے قائم کرنا مفید ہوسکتا ہے لیکن معلوم ہوا کہ قواعد میں اس کی گنجائش نہیں ہے اب صرف یہ صورت رہ جاتی ہے کہ میں بہ طور خاص حکومت سے یہ رعایت مانگوں کہ وہ مجھے اپنے معالج سے مشورہ لینے کی اجازت دے لیکن ظالم سے رعایت کا مطالبہ کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ میں جان دے سکتا ہوں۔ مگر رعایت کی درخواست نہیں کرسکتا۔'' جیل کے اندر ظالم کے ظلم سے بے نیازی کا یہ عالم ہے:

> ''بلا مبالغہ آج شائد روئے زمین پر مجھ سے زیادہ مطمئن کوئی آدمی نہیں ہے۔ بال بچوں اور متعلقین کی مجھے فکر نہیں کیوں کہ انھیں خدا کے حوالے کر آیا ہوں۔ قوم کی مجھے فکر نہیں کیوں کہ اس معاملے میں خدا کی طرف سے جتنی ذمے داری مجھ پر تھی وہ سب موجودہ حکمراں گروہ نے اپنے ذمے لے لی ہے۔ جماعت اور دعوتِ اسلامی کی مجھے فکر نہیں کیوں کہ گرفتار ہوتے ہی عنداللہ بری الذمہ ہو چکا ہوں اور ساتھ ہی اس بات کا بھی سو فیصدی یقین رکھتا ہوں کہ اس کام کو میرے قید ہونے اور رہنے سے قطعاً کوئی نقصان نہ پہنچے گا بلکہ اس کے برعکس فائدہ ہی پہنچے گا۔''

جس راستے پر وہ چل رہے ہیں، اس کی منازل کی طرف سے ان کی آ گاہی کا یہ عالم ہے کہ وہ قدم قدم کی آزمایشوں کو خوب جانتے ہیں اور اس کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ جیل سے والدہ کے نام لکھتے ہیں:

''جس راستے پر میں برسوں سے چل رہا تھا۔ اس میں یہ منزل تو بہر حال آنی ہی تھی۔ حیرت اس کے آنے پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ اتنی دیر سے کیوں آئی۔ درحقیقت میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ شیطان اور اس کی برادری نے مجھے اتنے دنوں برداشت کیسے کیا۔ بہر حال اب کہ وہ ادھر متوجہ ہو گئے ہیں۔ یہ امید نہ رکھیے کہ یہ کشمکش جلدی ختم ہو جائے گی۔ اب اس کا خاتمہ دو ہی طرح ہو سکتا ہے یا میں ختم ہو جاؤں یا وہ اصلاح ہو کر رہے، جس کے لیے میں پچھلے پندرہ برس سے کام کر تا رہا ہوں۔ ان دونوں صورتوں کے درمیان کوئی تیسری صورت ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا میری ماں اور بھائی اور بیوی اور بچوں اور مجھ سے تعلق رکھنے والے سب لوگوں کو اپنا دل کڑا کر لینا چاہیے اور ہر بدتر سے بدتر نتیجے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

حیدر آباد کے قیام کے دوران ایک نواب صاحب نے جو محکمہ امور مذہبی کی طرف سے ترجمان القرآن کے کئی سو پرچے محکمے کے لیے خرید تے تھے۔ خریداری روک دی اور وہ اس بات کے متمنی تھے کہ مولانا ان سے جا کر کہیں کہ وہ پھر خریداری کی منظوری دے دیں۔ مولانا کو معلوم ہوا تو بولے:

''میں قیامت تک اس کام کے لیے ان کے پاس نہ جاؤں گا۔ یہ میرا نہیں دین کا کام ہے، جو ان کا بھی ہے۔''

چناں چہ مالی نقصان برداشت کیا اور نہیں گئے۔

۱۹۵۳ میں سزائے موت سنانے کے بعد مولانا کو ۳۶ گھنٹے تک قید تنہائی میں رکھا گیا۔ پھر سی کلاس میں اخلاقی قیدیوں کے ساتھ رکھا اور پریشان کرنے کے لیے بیماری کی حالت میں بھی جگہ جگہ منتقل کرتے رہے۔ اربابِ اقتدار چاہتے تھے کہ مولانا رحم کی اپیل کریں۔ احوال پوچھنے پر بتایا:

''بڑے اطمینان سے پھانسی کی کوٹھری میں تین راتیں گزاریں اور کل انھیں باہر نکالنا ہی پڑا۔ مجھ سے یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں رحم کی اپیل ان سے

کروں تو میری جوتی کی نوک بھی تیار نہیں ہے۔ (روایت بالمعنی) اسی قید میں مولانا کو جو تفہیم القرآن جیسی عظیم الشان تفسیر لکھ رہے ہیں، مشقت بھی دی گئی۔ وزیر جیل، جیل کے دورے پر آئے تو مولانا نے یہاں کے سارے افسوس ناک حالات کا اِن سے تذکرہ کیا اور کہا:

''کیا آپ لوگ اس اصول پر چل رہے ہیں کہ جو پارٹی برسرِ اقتدار آ جائے وہ دوسری پارٹیوں کے ساتھ بدترین توہین آمیز اور انتقامی سلوک کرے، اگر ایسا ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس کے نتائج آپ کے حق میں اچھے نہیں ہو سکتے۔''

اس کشمکش کا کوئی حل - ایک گول میز کانفرنس

یہ کشمکش جو مولانا مودودی اور اربابِ اقتدار کے درمیان برسوں سے چلی آ رہی ہے یہاں تک کہ ہر گروہ جو اوپر آتا ہے اپنے پیش روؤں سے ہزار اختلافات کے باوجود مولانا مودودی کے بارے میں وہ اپنے پیش روؤں کے ہی نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی اس بات کی ضرورت نہیں محسوس کرتا کہ اب ان آزمائے ہوئے ظلم وتشدد کے حربوں کو چھوڑ کر کوئی دانش مندانہ تدبیر عمل میں لائے، جس سے ملت کی تعمیر کا مثبت کام ہو سکے اور وہ اسلام پسند قوت جو مولانا مودودی کی رہ نمائی میں ملک کے اندر سرگرم عمل ہے اور جس کی جڑیں ملت کے ضمیر میں گہری پیوست ہیں، اس سے کوئی مفید کام لیا جا سکے۔ کرسی پر ہر نیا آنے والا اقتدار کی اسی اندھی لاٹھی سے مسائل کو حل کرنے کی احمقانہ کوشش کرتا اور نتیجتاً حالات کو اور زیادہ بگاڑتا ہے۔ کیا کوئی دانش مند آدمی کبھی برسر اقتدار نہ آئے گا، جو حالات کو عقل سے سمجھے اور انگریز کی چھوڑی ہوئی بیوروکریسی کے چشم و ابرو کے اشاروں کو چھوڑ کر خود اپنے ضمیر اور عقل سے کام لے اور مسائل کے حل کا کوئی معقول (Reasonable) راستہ نکالے۔ اور مولانا مودودی کے بارے میں اربابِ اقتدار کی تنگ نظری اور تنگ ظرفی کی جو روایت چلی آ رہی ہے، اس سے ہٹ کر عقل وتدبیر سے کام لے۔ مولانا مودودیؒ ایک ذہین پڑھے لکھے صاحب نصب العین آدمی ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ملکی مسائل کو کسی گول میز کانفرنس میں بیٹھ کر طے کیا جا سکے، جس سے درمیان کے حجاب اٹھ سکیں اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا کوئی موقع فراہم ہو سکے۔ مولانا مودودیؒ جس کردار کے آدمی ہیں وہ کبھی دعوت

دین جیسے باوقار کام کے لیے ''بہ حضور فیض گنجور'' کی فدویانہ درخواست لے کر ارباب اقتدار کی خدمت اقدس میں حاضر نہ ہوں گے، لیکن اگر سوچا جائے تو ارباب اقتدار کے لیے یہ ایک سعادت ہوسکتی ہے کہ وہ مولانا مودودی سے ان کا پیغام، مشن، دعوت اور نصب العین جاننے، سمجھنے اور اسے ملک وملت کے لیے مفید پا کر اپنانے کی کوشش کریں۔ ملک وملت کے بلند ترین مسائل کے حل میں جہاں کچھ مخلص انسانوں میں بنیادی اختلافات ہوں وہاں علمی اور نظریاتی مسائل جیل اور دھونس کی دلیل سے حل نہیں کیے جاسکتے، ان کا قابل عمل حل باہمی افہام وتفہیم، سمجھنے سمجھانے اور بحث وتمحیص سے ہی سامنے آسکتا ہے۔ اور اگر نیت خالص اور دل پاکیزہ ہوں تو یہ بات کچھ مشکل بھی نہیں ہے، جو طبقہ بات بات پر سائنٹی فک دور کے جدید تقاضے، عملی تجربات اور عقل ودانش کی بانگ لگاتا ہو، اس کے لیے تو یہ بڑی ہی غیر عقلی اور نامعقول (Irrational) بات ہے کہ وہ ہر وقت ہر مسئلے میں جبر وتشدد کی قوت کو ہی حرکت میں لاتا رہے اور سمجھے کہ ہر بیماری کا علاج مار پیٹ ہے۔

دوسرا حل رائے عامہ کا کھلا میدان

اس کا دوسرا حل خود مولانا مودودی نے پیش کردیا ہے:

''جو لوگ ہم سے اختلاف رکھتے ہیں خواہ وہ برسر اقتدار ہوں یا نہ ہوں۔ ان کے لیے سیدھا اور صاف طریقہ کار یہ ہے کہ وہ دلائل سے ہمارا مقابلہ کریں اور جس طرح رائے عام سے ہم اپیل کرتے ہیں وہ بھی کریں۔ ہم اس کے لیے تیار ہیں اور انھیں بھی اس کے لیے تیار ہونا چاہیے کہ باشندگان ملک کی اکثریت اس کھلے مقابلے میں جس مدرسہ فکر کو پسند کرے وہ زمام کار پر قابض ہو اور دوسرے مدارسِ فکر عوام کی پسندیدگی حاصل کرانے کے لیے کوشش کرتے رہیں۔ اس سیدھے طریقے کو چھوڑ کر، جو لوگ دوسروں کا راستہ روکنے کے لیے جبر وظلم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں اور حکومت کے وسائل و ذرائع اور اختیارات اس غرض کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ رائے عامہ پر ان کو دائمی قبضہ حاصل ہے۔ اور دوسرے کو اسے ہموار کرنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ وہ نادان اور عاقبت

نا اندیش ہیں۔ ان کا یہ طریق نہ صرف حکمت و مصلحت کے خلاف ہے، بلکہ دیانت وامانت کے بھی خلاف ہے۔''

اربابِ اقتدار پھر وہی حرکتیں کرنے لگتے ہیں، جوان سے پہلے کے لوگ کرتے رہے ہیں۔ اربابِ اقتدار کے اس ذہن کے بارے میں مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے:

''اصحابِ اقتدار اپنی مرضی کے خلاف کسی تحریک کو بڑھتے دیکھ کر اس کے خلاف جبر کے ہتھیار استعمال کرنے پر اُتر آتے ہیں لیکن دراصل یہ ایک طرح کا جوا ہے جو یہ لوگ کھیلتے ہیں۔ جبر لازماً ایک ہی نتیجہ پیدا نہیں کیا کرتا کہ آپ اطمینان سے آنکھیں بند کر کے اسے استعمال کر بیٹھیں اور خود بخود آپ کا مطلوب نتیجہ برآمد ہو جائے۔ اس کے تو تین ممکن نتیجے برآمد ہونے کے یکساں امکانات ہیں۔ ایک ممکن نتیجہ یہ ہے کہ تحریک کے کارفرما اور کارکن دب جائیں یا بک جائیں۔ حکومت کے قمار باز اسی نتیجہ کی امید پر یہ بازی کھیلتے ہیں۔ دوسرا ممکن نتیجہ یہ ہے کہ جابرانہ مزاحمت سے تحریک اور زیادہ زور پکڑ جائے اور آزمائش کی بھٹی اس کے کارکنوں کی قابلیتوں کو اور زیادہ نکھار دے۔ اسی امید پر ایک تحریک ....جبر کا خیر مقدم کرتی ہے اور بسا اوقات اس کو خود دعوت دینے لگتی ہے۔ تیسرا ممکن نتیجہ یہ ہے کہ تحریک غلط راستے پڑ جائے۔ اس کے لیڈر اور کارکن اپنے ذہن کا توازن کھو بیٹھیں یا ذمہ دار لیڈروں کے ہٹ جانے کے بعد تحریک سر پھرے لوگوں کے ہاتھ میں آجائے یا آئینی و جمہوری طرز کی جدوجہد کا راستہ بند پا کر وہ خفیہ تحریکوں کا راستہ اختیار کر لے۔ یہ نتیجہ کسی کے حق میں بھی اچھا نہیں ہوتا نہ حکومت کے لیے نہ ملک کے لیے نہ خود تحریک کے لیے۔ دنیا میں بار بار جبر کے استعمال سے یہ نتیجہ رونما ہو چکا ہے، اس کی بدولت اچھی اچھی مفید تحریکیں بگڑ کر نقصان دہ بن گئی ہیں۔ اس نے ملکوں اور قوموں کی قسمیں بگاڑ دی ہیں۔ اس کا زندہ نمونہ ہمارے سامنے روس موجود ہے، جہاں

زاروں کے جبر نے اصلاح کے جمہوری و آئینی طریقوں کا راستہ روک کر اصلاح طلب لوگوں کو خفیہ تحریکات کے راستے پر ڈال دیا اور اس کی بدولت پوری قوم کا مزاج ایسا بگڑ گیا کہ آج پوری دنیا اس کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔ حکومتیں اس امید پر جبر استعمال کرتی ہیں کہ نتیجہ رونما نہ ہوگا۔ لیکن اس کے رونما نہ ہو سکنے کی ضمانت کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ حکومت کو اس قمار بازی سے باز رہنا چاہیے اور سیدھی طرح کام کرنے والوں کے ساتھ سیدھی طرح ہی معاملہ کرنا چاہیے۔ ملک کی اور خود حکومت کی اپنی بھلائی بھی اس میں ہے کہ یہاں ہر خیال کے لوگوں کے لیے رائے عام سے اپیل کرنے کا موقع کھلا رہے اور صرف رائے عام کی تبدیلی نظامِ حکومت کی تبدیلی کے لیے کافی ہو۔"

اربابِ اقتدار کا ایک بڑا امتحان

یہ ہے مولانا مودودی کی پیش کردہ جمہوری تجویز، جو انھوں نے اربابِ اقتدار کے سامنے رکھ دی ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے بہتر جمہوری، اخلاقی اور عملی طریق کار اور کیا ہو سکتا ہے۔ اب یہ اربابِ اقتدار کا اپنا کام ہے کہ وہ اس ملک کی نظریاتی بنیادوں، عوام کی فلاح و بہبود اور اپنے موقف کے پیشِ نظر مولانا مودودی کے بارے میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا مودودی کی ذات ہمارے ارباب اقتدار کی عقل و دانش، صبر و تحمل، ملکی مفاد کے بارے میں دیانت اور اخلاص کا بہت بڑا امتحان ہے، جسے ہمارے اربابِ اقتدار گزشتہ ۱۳ سال میں اب تک پاس نہیں کر سکے، حالاں کہ اس امتحان کے پاس کرنے پر ہی ملک و ملت کا درخشاں مستقبل معلق ہے۔

اقامتِ دین کی راہِ سلوک کا مسافر

مولانا مودودی کی شخصیت کا جہاں تک تعلق ہے،ہم آج کے انسانوں کی یہ خوش بختی ہے کہ ان کے لیے یہ پڑھنے، معلومات فراہم کرنے اور بیان کرنے کی چیز نہیں بلکہ غور سے سمجھنے، قریب سے دیکھنے اور رائے قائم کر کے مخالفت یا موافقت کرنے کی چیز ہے۔ وہ ایسی شخصیت نہیں ہے، جو دنیا میں خاموشی کے ساتھ آ کر اپنی ذات کے قریبی ماحول میں تگ و تاز کر کے کچھ دنیوی کامیابیاں یا حسرتیں سمیٹ کر کسی مخصوص طبقے میں معروف یا بدنام ہو کر رخصت ہو جانے والی ہے۔ بلکہ جس دورِ تہذیب میں ہم رہ رہے ہیں، جس عصرِ حاضر نے ہمارے چاروں طرف اپنا فکری اور تہذیبی جال پھیلا رکھا ہے۔ اس دورِ تہذیب اور اس عصرِ حاضر کے خلاف مولانا مودودی نے بغاوت کا علم بلند کر رکھا ہے۔ وہ اس کو ڈھانے، توڑ پھوڑ دینے اور مسمار کر کے اس کی تخریب سے ایک نئی تعمیر اٹھانے کا علی الاعلان اظہار کر رہے ہیں۔ اظہار ہی نہیں انھوں نے یہ کام عملاً شروع کر رکھا ہے۔ ایک صبر آزما اعصابی، علمی، عقلی، اخلاقی، مادی اور تہذیبی جنگ ہے جو انھوں نے چھیڑ رکھی ہے۔ بنی نوعِ انسان کی موجودہ نسل میں سے وہ پکار پکار کر اپنے ساتھی جمع کر رہے ہیں، انھیں سمیٹ کر اور منظّم کر کر کے وہ موجودہ چلتے ہوئے نظام پر پیہم یورش کر رہے ہیں۔ یہ ساری کارروائی برابر وہ ہمارے سامنے کیے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی بڑا ہی غافل آدمی ہوگا، جو غیر جانب داری کا پردہ لٹکا کر اس میدانِ جنگ کی طرف سے آنکھیں پھیر لے۔ انھوں نے ساری موجودہ نسل کو عموماً اور مسلم معاشرے کے فرد فرد کو خصوصاً یہ کہہ کر آزمایش میں مبتلا کر دیا ہے کہ میں اقامتِ دین کا کام کر رہا ہوں۔ وہ کام جسے انبیاء اور صلحا کرتے آئے ہیں

اور جسے ہمارے آقا اور سرکارؐ نے انجام دیا ہے۔ اب کون مسلمان ہے، جو ان کی ان باتوں سے غافل رہ سکتا ہے۔ ان کے بارے میں دو میں سے ایک طرز اختیار کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔

اگر یہ شخص غلط کہہ رہا ہے تو پھر اس کا مقابلہ اس کی مزاحمت، اس کی پیش قدمی کو روکنا ایک ایک مسلمان کا فرض ہے۔ اس لیے کہ ایک مسلمان کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ اس کے دین وایمان کے ساتھ کھیلے۔ اور اگر یہ صحیح کہہ رہا ہے تو پھر اس کی امداد، اس کی اعانت اس کی پیروی، اس کی رفاقت، اس کے محاذ جنگ کا سپاہی بننا اس کے کام میں اپنا سب کچھ لگا دینا ایک ایک مسلمان کا فرض ہے۔ اس لیے کہ ایک مسلمان کے لیے یہ کسی صورت جائز نہیں ہے کہ دین کے خادم زخم کھا کھا کر گریں اور اس کی حمیت میں سرِمو حرکت پیدا نہ ہو۔

اس لیے آج ایک مسلمان ہر معاملے میں غیر جانب دار رہ سکتا ہے، لیکن مولانا مودودی کے معاملے میں اگر اسے ذرا بھی حالاتِ زمانہ سے آگاہی اور اپنے گردوپیش کی خبر ہے تو وہ غیر جانب دار نہیں رہ سکتا یا اسے ان کا دوست ہونا چاہیے، جاں نثار دوست، یا اسے ان کا دشمن ہونا چاہیے لیکن یہ طرزِ عمل اس وقت تک دل ودماغ کے اطمینان اور قلب کی گہرائی سے اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک کہ ان کی شخصیت اور ذات کا قریبی اور گہرا مطالعہ نہ کرلیا جائے۔ وہ کیا کہتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اس پر خود کس حد تک عمل کرتے ہیں۔ اس میں کس حد تک خلوص اور خداترسی اور مقصد کے عشق کی جھلک ہوتی ہے، اس کام میں ان کی استقامت کا کیا حال ہے، انھوں نے اس کام میں کیا کچھ لگایا ہے کیا کچھ بچایا ہے۔ مادی طور پر کیا کچھ صرف کیا ہے اور کیا کچھ پایا ہے، اس کٹھن کام میں ان کے عزم وہمت کا کیا حال ہے، مصائب میں ان کی عزیمت کس درجہ کی ہوتی ہے، ان کی زندگی کا اندر اور باہر کیسا ہے۔ وہ قریب اور دور سے کیسے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ سب چیزیں ہیں جو ایک صاحب ہوش آدمی کو دیکھنی چاہئیں اگر وہ ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا چاہتا ہے۔

پہاڑ کے مانند

مولانا مودودی کی شخصیت ایک پہاڑ کے مانند ہے۔ پہاڑ کو آنکھیں کھول کر دور سے دیکھیے تو وہ بھی خوش نما اور خوش منظر ہوتا ہے اور بے ریا حوادث زمانہ کے اندر اپنے عزم کی بنیاد پر

ساری دنیا کے سامنے بے لاگ و لپیٹ کھڑا ہوتا ہے، اور اگر اس کے قریب جایئے تو پھر جوں جوں اس کی قربت بڑھے گی، اس کی بلندی اور عظمت اور اونچائی اور خوش نمائی اور خوش منظری بڑھتی جائے گی۔ مولانا مودودی کی یہ بہت بڑی عظمت ہے کہ ان کی قربت دوری سے کہیں زیادہ خوش منظر ہے۔

مولانا مودودی کی زندگی میں کہیں پردے لٹکے ہوئے نہیں ہیں۔ کہیں پر بھی ان کی شخصیت نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی۔ انھیں ہر حال میں دیکھیے اور ہر رنگ میں یکساں پایئے۔ بناوٹ، تصنع، تکلف، خودنمائی، یہ ایسی چیزیں ہیں، جن کا ان کی شخصیت کے گرد کوسوں دور تک پتا نہیں ملتا۔ نہ وہ اپنی ذات کو کسی پر ٹھونستے ہیں، نہ مرعوب کرتے ہیں۔ نہ علمی تفوق کا کوئی خفیف سا بھی مظاہرہ کرتے ہیں۔ نہ مجلس میں اپنے آپ کو نمایاں کرتے ہیں۔ وہ ہر شخص کے جواُن سے ملے ہمدرد، غم گسار، مخلص اور راست گو ساتھی ہیں۔ ان کی چال ڈھال، بول چال، نشست و برخاست اور لب و لہجہ سے ایک مستحکم باعمل اور راست فکر کردار کا اظہار ہوتا ہے اور آدمی تھوڑی سی بات چیت میں ہی سمجھ لیتا ہے کہ یہ شخص باتوں میں بہلانے والا اور اپنے گرد کوئی بناوٹی رکھ رکھاؤ رکھنے والا آدمی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے افکار عمل میں ڈھلنے کے لیے وجود میں آتے ہیں اور وہ پوری سادگی اور اخلاص لیکن گہرے فہم وتدبر سے اپنے کاموں کا نقشہ بنانے والا ہے۔ اس کے کردار میں کوئی سنسنی خیزی نہیں ہے۔ البتہ معاشرے کے بگاڑ کی اس انتہا میں اپنی زندگی کو اسلامی اخلاق و حدود میں بے تکلفی سے کس کر رکھنے کا ایک سادہ عمل انسان کو تحیر میں ضرور مبتلا کر دیتا ہے، جس نظامِ فکر و اخلاق کو وہ دعوت اور تحریک کے طور پر لے کر اُٹھتے ہیں، اس کے عملی نظام ہونے پر ان کی روزمرہ کی زندگی خود ایک جیتی جاگتی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی مثالیں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں کہ اسلامی نظامِ حیات پر بعض اعتراضات وشبہات کا جواب اگر مجھ جیسے ایک عام آدمی نے دیا ہے تو بسا اوقات سائل کے دل کو تسکین اور شرح صدر حاصل نہیں ہوتی، اور انھیں الفاظ میں مولانا مودودی نے جواب دے دیا ہے تو سائل دل سے پورے طور پر مطمئن ہو گیا ہے۔ یہ اطمینان جو ایک شخص کی زبان کے الفاظ سے ایک سائل کے دل میں ٹھنڈک بن کر اتر جاتا ہے۔ دراصل اپنے اندر علمی اور لسانی فرق سے کہیں زیادہ قلب و نظر کی پاکیزگی اور فکر و عمل کی یکسانی سے پیدا ہوتا ہے۔

حق ہر شے سے بالا

جس راہِ سلوک کو طے کر کے انھوں نے اپنے مالک کے ساتھ ایک مخصوص تعلق پیدا کیا ہے، اس تعلق نے ان کے اندر احقاق حق اور ابطال باطل کی ہزیمت کا جو ہر پیدا کیا ہے، وہ چیزیں ہیں، جن کا مطالعہ ان کے کام کو سمجھنے کے لیے مفید ہے۔ ان کا عملی کردار جو حق کے لیے سب کچھ سَہہ جانے کا داعیہ اپنے اندر رکھتا ہے اور ان کی وہ راہِ سلوک اور اس کے کچھ خدوخال جس پر وہ چل کر اپنے مالک حقیقی سے اپنا تعلق استوار کرنا چاہتے ہیں۔ دعوتِ حق کے لیے ان کے داعیانہ کردار کی چند جھلکیاں ان کی بعض مختصر تحریروں سے نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں۔

''میرے برادرانِ دینی خواہ میری بات سنیں یا نہ سنیں مگر میں تو یہی کہتا رہوں گا کہ تمھارے لیے اب اس کے سوا کسی چیز میں خیریت نہیں ہے کہ سچے مسلمان بنو اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے تمھارا جو فرض ہے اسے ادا کرو۔''

دوسری جگہ لکھا ہے:

''میرے جرأت آمیز الفاظ سے آپ کو شاید یہ گمان گزرا ہوگا کہ میں اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتا ہوں اور کسی بڑے مرتبے کی توقع رکھتا ہوں۔ حالاں کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں صرف اپنے گناہوں کی تلافی کے لیے کر رہا ہوں اور اپنی حقیقت خوب جانتا ہوں۔ بڑے مراتب تو درکنار صرف سزا سے بچ جاؤں تو یہ بھی میری امیدوں سے بہت زیادہ ہے۔''

اپنی اولاد کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے:

''میں اپنی اولاد کو عیش کے لیے نہیں پالنا چاہتا۔ بلکہ خیر کی خدمت اور شر سے جنگ کے لیے پالنا چاہتا ہوں۔''

اپنے انقلابی مشن کا علم اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں اپنی کمزوریوں سے خوب واقف ہوں اور انھیں کمزوریوں کا احساس ہے جو مجھے ہر وقت مجبور کرتا ہے کہ میں خداوندِ عالم سے علم صحیح اور عقلِ سلیم کے لیے دعا کروں۔ محض فرض کی پکار نے مجھے مجبور کر کے اس کام پر آمادہ

کیا ہے، جس کے دشوار گزار مرحلوں کو دیکھ کر ایک طرف اور اپنی کمزوریوں کو دیکھ کر دوسری طرف میری روح لرز اٹھتی ہے۔ بہ ہر حال خدا کے بھروسے پر میں نے اس میدان میں قدم رکھ دیا ہے اور ان تمام حکمتوں کو پیش نظر رکھ کر جن کی طرف پہلے اشارہ کر چکا ہوں اپنے انقلابی مشن کی تبلیغ شروع کر دی ہے۔''

یہ کام وہ کس بے لاگ انداز میں کر رہے ہیں، اس کا ہلکا سا نقشہ اس اقتباس میں نظر آئے گا:

''میرے نزدیک خدا کا دین اور اس کی امت مسلمہ کا مفاد دنیا کی ہر شے اور ہر تعلق سے زیادہ قیمتی ہے اور جب میں دیکھتا ہوں کہ کوئی شخص دانستہ یا نادانستہ اس کو نقصان پہنچا رہا ہے تو میں اس کی مزاحمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں خواہ وہ میرا قریب ترین عزیز ہو، دوست ہو، استاد ہو یا میری قوم کا کوئی بڑے سے بڑا آدمی ہو اِس معاملے میں کسی تعلق یا کسی نیاز مندی کی پروا کرنے سے میں بالکل معذور ہوں، جس کسی کو میرے اس طرزِ عمل سے تکلیف ہو وہ اگر اپنا حق پر ہونا دلیل سے ثابت کر دے گا تو میں نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کروں گا بلکہ نہایت ادب سے معافی بھی چاہوں گا۔ خواہ وہ دنیوی اعتبار سے حقیر ترین آدمی ہو اور اگر وہ مجرد شکایت کرے گا تو میں صاف عرض کروں گا کہ حق کے معاملے میں بڑے اور چھوٹے اپنے اور پرائے کی تمیز سے مجھے معاف رکھا جائے۔''

پھر جس راہ میں انھوں نے قدم رکھا ہے اس میں جیل کے شب و روز اور پھانسی کے تختے بھی آ جاتے ہیں۔ لیکن ان کی عزیمت بیماری میں معالج سے مشورے کی رعایت بھی ظالم سے طلب کرنا پسند نہیں کرتی۔

''آپ کا بالمشافہ معائنہ کر کے علاج کے بارے میں رائے قائم کرنا مفید ہو سکتا ہے لیکن معلوم ہوا کہ قواعد میں اس کی گنجائش نہیں۔ اب صرف یہ صورت رہ جاتی ہے کہ میں بہ طور خاص حکومت سے یہ رعایت مانگوں کہ وہ مجھے اپنے معالج سے مشورہ لینے کی اجازت دے لیکن ظالم سے رعایت کا

مطالعہ کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔ میں جان دے سکتا ہوں۔ مگر رعایت کی درخواست نہیں کرسکتا۔ لہٰذا جو کچھ علاج آپ غائبانہ کر سکتے ہیں بس اسی پر اکتفا فرمائیں۔''

کیا ان الفاظ کے پیچھے وہ کردار نہیں بول رہا ہے جو دنیا میں حق کی گواہی کو زندگی کا واحد نصب العین بنا کر اٹھا ہے اور جس کے لیے اس نے تن، من، دھن کی بازی لگا دی ہے۔ جس کے الفاظ میں حقیقت اور سچائی کا گہرا جذبہ ہے جو خود سننے والے کو یقین دلا دیتا ہے کہ یہ کوئی خاص آواز ہے جو بول رہی ہے اور اس کے پیچھے کوئی خاص اور عظیم کردار ہے جو کام کر رہا ہے۔

سلوکِ قرآنی

یہ کردار ایک خاص راہ پر چل کر اپنے مالک سے تعلق پیدا کر رہا ہے۔ اس راہ کو مولانا مودودی ''سلوکِ قرآنی'' کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک تعلق باللہ کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اس کام پر دل و جان سے لگ جائے، جس پر اس کے مالک نے اسے بندۂ مومن کی حیثیت سے مامور کیا ہے۔ اتباعِ رسولؐ کا راز اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اُمّتی وہی فریضہ انجام دے جو رسول کریمؐ نے انجام دیا اور اسی طرح انجام دے انھی کے نقشِ قدم پر چلے اسی طرح راہِ حق میں اقامتِ دین کی خاطر مصائب برداشت کرے جس طرح رسول کریمؐ نے برداشت کیے۔ پھر فہم قرآن کا اس سے بڑا نکتہ اور نہیں ہے کہ جو انقلابی کام قرآن نے انجام دیا اور اپنے لانے والے کو جس انقلاب کی سربراہی پر مجبور کر دیا طالبِ حق اسی انقلابی کام کو لے کر اٹھ کھڑا ہو۔ وہی جھنڈا بلند کرے۔ اسی علم کو تھامے۔ انھیں بدر و احد کے معرکوں میں جان کھپائے۔ انھیں دشمنانِ دین کے نیزوں کی نوکوں اور تلواروں کی دھاروں پر چل کر اپنے کام کو آگے بڑھائے جب ایک بندۂ مومن یہ کچھ کرنے اور سہنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو تو سلوک کی بہت سی منازل خود بہ خود طے ہونے لگتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سلوک کی فنّی اصطلاحات اور مخصوص افکار و اشغال کا کوئی مرتب اور منضبط سلسلہ نہ ہو۔ لیکن اللہ کی طرف بڑھنے اور اس کے در پر حق بندگی ادا کر دینے کا کام اسی طرح انجام پاتا ہے۔ چناں چہ اللہ کے کلام کا فہم حاصل کرنے کے بارے میں مشورے دیتے ہوئے تفہیم القرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''آدمی قرآن کی رُوح سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا جب تک وہ عملاً کام نہ کرے، جس کے لیے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے۔ یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اٹھوائی اور وقت کے علم بردارانِ کفر وفسق وضلالت سے اس کو لڑوا دیا۔ گھر گھر سے ایک ایک سعید روح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعیِ حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشہ گوشہ سے ایک ایک فتنہ جو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اٹھایا اور حامیانِ حق سے ان کی جنگ کرائی۔ ایک فردِ واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافتِ الٰہیہ کے قیام تک پورے تئیس سال یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہ نمائی کرتی رہی اور حق و باطل کی اس طویل و جانگسل کش مکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اس نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے۔ اسے تو آپ پوری طرح اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اسی طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے، جو نزولِ قرآن کے وقت پیش آئے تھے اور حبش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر و اُحد سے لے کر حنین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا۔ منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے اور سابقین اولین سے لے کر مؤلفۃ القلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے اور برت بھی لیں گے۔ یہ ایک اور ہی قسم کا سلوک ہے جس کو میں ''سلوکِ قرآنی'' کہتا ہوں۔ اس سلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود

سامنے آ کر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اس منزل میں اتری تھیں۔ اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لغت اور نحو اور معانی اور بیان کے کچھ نکات سالک کی نگاہ سے چھپے رہ جائیں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی روح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بخل برت جائے۔''

تعلق باللہ ناپنے کا پیمانہ

'مولانا کی اختیار کردہ اس راہِ سلوک پر چلتے ہوئے مالک حقیقی کے ساتھ جو تعلق پیدا ہوتا ہے، اسے ناپنے، تولنے اور بڑھانے کے لیے جو طریقہ مولانا کے نزدیک کارگر ہے، اسے انھوں نے اپنی ایک تقریر ''ہدایات'' میں خود بیان فرمایا ہے:

''اللہ کے ساتھ ہمارا تعلق بڑھ رہا ہے یا گھٹ رہا ہے یہ معلوم کرنے کے لیے آپ کو خواب کی بشارتوں اور کشف و کرامات کے ظہور اور اندھیری کوٹھری میں انوار کے مشاہدے کا انتظار کرنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ اس تعلق کو ناپنے کا پیمانہ تو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے قلب میں ہی رکھ دیا ہے۔آپ بیداری کی حالت میں اور دن کی روشنی میں ہر وقت اس کو ناپ کر دیکھ سکتے ہیں۔اپنی زندگی کا، اپنی مساعی کا اور اپنے جذبات کا جائزہ لیجیے اپنا حساب آپ لے کر دیکھیے کہ ایمان لا کر اللہ سے بیع کا جو معاہدہ آپ کر چکے ہیں اسے آپ کہاں تک نبھا رہے ہیں۔اللہ کی امانتوں میں آپ کا تصرف ایک امین ہی کا سا تصرف ہے یا کچھ خیانت بھی پائی جاتی ہے۔آپ کے اوقات اور محنتوں اور قابلیتوں اور اموال کا کتنا حصہ خدا کے کام میں جا رہا ہے اور کتنا دوسرے کاموں میں۔ آپ کے اپنے مفاد اور جذبات پر چوٹ پڑے تو آپ کے غصّے اور بے کَلی کا کیا حال ہوتا ہے اور جب خدا کے مقابلے میں بغاوت ہو رہی ہو تو اسے دیکھ کر آپ کے دل کی کڑھن اور آپ کے غضب اور بے چینی کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ یہ اور دوسرے بہت سے سوالات ہیں جو آپ خود اپنے نفس سے کر سکتے ہیں۔اور اس کا جواب

لے کر ہر روز یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اللہ سے آپ کا کوئی تعلق ہے یا نہیں اور ہے تو کتنا ہے اور اس میں کمی ہو رہی ہے یا اضافہ ہو رہا ہے۔ رہیں بشارتیں اور کشوف و کرامات اور انوار و تجلّیات تو آپ ان کے اکتساب کی فکر نہ کریں۔ سچی بات یہ ہے کہ اس مادی دنیا کے دھوکہ دینے والے مظاہر میں توحید کی حقیقت پا لینے سے بڑا کوئی کشف، نہیں ہے۔ شیطان اور اس کی ذرّیات کے دلائے ہوئے ڈراووں اور لالچوں کے مقابلے میں راہِ راست پر قائم رہنے سے بڑی کوئی کرامت نہیں ہے۔ کفر و فسق اور ضلالت کے اندھیروں میں حق کی روشنی دیکھنے اور اس کا اتباع کرنے سے بڑا کوئی مشاہدۂ انوار نہیں ہے اور مومن کو اگر کوئی سب سے بڑی بشارت مل سکتی ہے تو وہ اللہ کو رب مان کر اس پر جم جانے اور ثابت قدمی کے ساتھ اس کی راہ پر چلنے سے ملتی ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡھِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ۝
(السجدہ:۳۰)

تزکیۂ نفس کا طریق کار

پھر اس راہِ سلوک میں ذاتی اصلاح، تزکیۂ نفس اور سعیِ خیر کے لیے، جو طریق انھوں نے تجویز کیا ہے اسے مولانا محترم نے ایک رفیق کے نام اپنے ایک مکتوبِ زنداں میں بیان کیا ہے:

"ان اخلاقی کم زوریوں کے تین علاج ہیں۔ ایک مخلص دوستوں کی دعائے خیر، دوسرے صحبتِ خیر اور تیسرے خود اپنی سعیِ خیر۔ دعائیں بھی آپ کے حق میں کرتا ہوں اور ان شاء اللہ آپ کے دوسرے رفقاء بھی کریں گے۔ صحبت ایسے آدمیوں کی اختیار کیجیے، جو خدا سے ڈرنے والے ہوں اور ان لوگوں سے دور رہیے، جن کے اندر خدا سے بے خوفی کی علامات پائی جاتی ہوں۔ رہی تیسری چیز تو احتسابِ نفس سے زیادہ کارگر کوئی دوسری تدبیر اس مقصد کے لیے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ایسی چیز عطا کی ہے، جو اس کو

برے اور بھلے کا فرق بھی بتاتی ہے برائی پر اسے ٹوکتی اور ملامت بھی کرتی ہے اور بھلائی کی طرف اس کو اکساتی بھی ہے۔ ہمارے قدیم لٹریچر میں اس کو نفسِ لوّامہ کہتے تھے موجودہ زمانے کی اصطلاح میں اس کو ضمیر کہتے ہیں۔ اگر انسان اس کو زندہ رکھے اس کی ملامتوں پر توجہ کرے اور جس جس چیز پر وہ ملامت کرتا جائے اسے چھوڑنے کی اور جس جس چیز کے اختیار کرنے کی وہ ہدایت کرتا جائے اسے اختیار کرنے کی کوشش کرے۔ اور جب وہ کسی برائی پر ٹوکے تو تاویلیں کر کر کے اسے خاموش کرتا رہے اور اس کے تقاضوں کی خلاف ورزی کرتے کرتے اسے بالکل بے جان کر ڈالے تو پھر آدمی کا اخلاقی اور روحانی تنزّل بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسفل السافلین میں پہنچ جاتا ہے۔ یہی بات ہے جو قرآن مجید میں فرمائی گئی ہے: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا۔ پھر ضمیر بھی دو چیزوں کا محتاج ہے۔ ایک یہ کہ اس کو زیادہ سے زیادہ علم کی روشنی بہم پہنچائی جائے تا کہ وہ بھلائی اور برائی دونوں سے خوب واقف ہو۔ اس غرض کے لیے قرآن اور حدیث اور سیرت نبویؐ اور صالحین کی سیرتیں نہایت مفید ہیں۔ دوسرے یہ کہ آدمی اپنے ضمیر کو مقویّات کھلاتا رہے اور اس کی مقویّات ہیں فرض اور نفل نمازیں۔ فرض اور نفلی روزے زکوٰۃ اور صدقات و خیرات اور بندگان خدا کی خدمت اور راہِ خدا میں عملاً دوڑ دھوپ۔ یہ مقویّات اس کو کھلاتے جائیے اور ترقی کے آسمانوں پر چڑھتے جائیے۔"

یہ وہ سیدھا سادھا طریق تزکیہ ہے، جو مولانا مودودی اپنے لیے اور اپنے رفقاء کے لیے مفید سمجھتے ہیں۔

راہِ سلوک کی کچھ مشکلات

لیکن اس راہِ سلوک کی کچھ مشکلات بھی ہیں اور اس کے بعض مقامات پر آدمی ٹھٹک کر کھڑا رہ جاتا اور حیرانی و برگشتگی میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی چیز کو کسی صاحب نے مولانا کے

سامنے پیش کیا۔ انھوں نے پوچھا کہ اقامتِ دین کا کام جتنا کچھ کٹھن اور اپنے تقاضوں کے لحاظ سے عظیم الشان ہے، اس درجے کی قیادت ہم کہاں سے لا سکتے ہیں، جو صاحبِ وحی والہام ہو پھر اس کام کو انجام دینے والے وہ مخلص مجاہدین کی جماعت کہاں سے میسّر آسکتی ہے جیسی کہ صحابہ کرام کی جماعت تھی۔ ان کا سا معیارِ ایمان واخلاص کہاں سے آسکتا ہے اگر ہم قرآن کے سیاسی نظریے پر کوئی گروہ منظّم کر بھی لیں۔ تو بھی اس میں وہ اخلاقی اور روحانی اسپرٹ کہاں سے پیدا ہوگی، جو اسلامی نظامِ حیات کی صحیح نمائندگی کر سکے۔ مولانا مودودی نے اس رفیق کے خلجان اور حیرانی کا علاج تجویز کیا ہے اور ان شبہات وخیالات کو اقامتِ دین کی راہِ سلوک کے دھوکے قرار دیا ہے اور ایک تفصیلی گفتگو کے ذریعہ ان کی نشان دہی اور ان سے بچنے کی تدابیر بیان کر دی ہیں۔ اسی مضمون کا ایک طویل اقتباس درج ذیل ہے۔

اقامتِ دین کی راہِ سلوک کے دھوکے

''آپ کے اس خلجان کی ابتدا غالباً اس مقام سے ہوتی ہے کہ آپ اقامتِ دین کا جب تصور کرتے ہیں تو معاً آپ کے سامنے دَورِ نبوّت اپنی ساری تاب ناکیوں کے ساتھ آجاتا ہے اور اس خیال سے آپ کا دل بیٹھنے لگتا ہے کہ وہ عظیم رہ نما اور وہ بے نظیر کارکن آج کہاں ہیں، جن کے ہاتھوں پر یہ کام اس وقت ہوا تھا۔ آپ اپنے دل کا جائزہ لے کر تحقیق کیجیے کہ جب یہ سوال آپ کے دل میں ابھرتا ہے تو اس کے ساتھ کس قسم کے رجحانات آپ کے نفس کو اپنی طرف کھینچنا شروع کرتے ہیں۔ آپ گہرا جائزہ لیں گے تو نمایاں طور پر دو رجحانات کی کشش آپ کو خود محسوس ہوگی۔

ایک یہ کہ مایوس ہو جاؤ۔ اب نہ وہ رہ نما اور وہ کارکن میسّر آسکتے ہیں اور نہ یہ کام ہو سکے گا۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ پورے دین کی اقامت کا تصوّر ہی چھوڑ دو۔ جو کام نہیں ہو سکتا اس کے پیچھے پڑنے سے کیا حاصل دین کی جزوی خدمات میں سے کوئی ایک خدمت اپنے ہاتھ میں لے لو اور جیسی کچھ بری بھلی بن آئے کرتے رہو۔ میں اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات کی

بنا پر کہتا ہوں کہ یہ اوّلین رجحان ہے جو اس مقام پر آدمی کے سامنے آتا ہے اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ پہلا دھوکہ ہے، جو شیطان ایک نیک نفس مسلمان کو دیتا ہے تا کہ وہ اقامتِ دین کے نصب العین سے کسی طرح باز آجائے۔ اس لیے آگے کی کوئی بات سوچنے سے پہلے آپ کو چاہیے کہ اس فریب کو اول قدم ہی پر پہچان لیں۔ اور اگر آپ نیک نیت ہیں تو پورے شعور اور عزم کے ساتھ اپنے ذہن میں سے پہلے اس کا اچھی طرح قلع قمع کر دیں۔

دوسرا رجحان، جو اس کے سامنے آتا ہے یہ ہے کہ یہ کام ہے تو بے شک ضروری اور فرض مگر اس کے لیے رہ نماؤں اور کارکنوں میں وہی دینی روحانی و اخلاقی اوصاف درکار ہیں، جن کی بہ دولت عہدِ نبویؐ میں یہ کام ہوا تھا۔ لٰہذا پہلے ایسے بن جاؤ اور اس طرز کے آدمی بنالو پھر اس کام میں لگو۔ یہ دوسرا دھوکا ہے، جو پہلے دھوکے سے بچ نکلنے والے کو شیطان رجیم دیا کرتا ہے وہ جب دیکھتا ہے کہ یہ شخص اس نصب العین پر جم گیا ہے اور اس سے ہٹنے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا۔ تو پھر وہ اس فکر کی بہ جائے تدبیر کی ایک غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس سے کہتا ہے کہ بے شک دریا پار تو، جس منزل کی طرف جانا چاہتا ہے وہ ہے تو منزلِ مقصود ہی مگر بے وقوف تیرنا سیکھے بغیر دریا میں اترے گا۔ پہلے دریا سے باہر خشکی پر تیرنے کی مشق اچھی طرح کرلے پھر دریا میں قدم رکھ۔ اس طرح وہ ناصح مشفق آدمی کو واقعی بے وقوف بنا دیتا ہے اور جو لوگ اس کے داؤں سے مات کھا جاتے ہیں وہ سب نہ صرف خود خشکی پر تیراکی کی مشق شروع کر دیتے ہیں بلکہ جن لوگوں کو اپنے ساتھ لے چلنا چاہتے ہیں ان کو بھی خشکی کا تیراک بنانے میں خوب مہارت فن دکھاتے ہیں مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان ماہرین فن کو اکثر تو عمر بھر دریا میں اترنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی اور اگر کبھی اتر جاتے

ہیں تو زمین پاؤں تلے سے نکلتے ہی یا غرق ہو جاتے ہیں یا دریا کے بہاؤ پر بہہ نکلتے ہیں کیوں کہ دریا سے باہر خشکی پر تیراکی میں جو کمال پیدا کیا جاتا ہے وہ دریا کی روانی سے پہلا سابقہ پڑتے ہی کالعدم ہو جاتا ہے۔ ان دونوں رجحانات کی غلطی کو اگر آدمی آغاز میں ہی محسوس کر لے تو وہ اس طریق تزکیہ وتربیت کو آپ سے آپ ترجیح دے گا جسے ہم نے ترجیح دی ہے لیکن اس راہ پر چند قدم چلتے ہی یکے بعد دیگرے کچھ دوراہے ایسے آتے ہیں جن میں سے ہر ایک پر پہنچ کر آدمی کا دل چاہتا ہے کہ دائیں یا بائیں مڑ جائے اور اگر نہ مڑے تب بھی آگے چلتے ہوئے بار بار اس کے دل میں کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ وہ ان میں سے کسی موڑ پر کیوں نہ مڑ گیا۔ بلکہ بسا اوقات یہاں تک جی چاہنے لگتا ہے کہ پلٹے اور انھیں میں سے کسی موڑ کی طرف مڑ جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ذرا اپنے ذہن میں اپنا سفر آغاز سے شروع کریں اور ان میں سے ہر ایک موڑ کی کشش محسوس کر کے ذرا اس کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ادھر کیا ہے اور کیا چیز اس کی طرف مائل کرتی ہے۔ ایک موڑ آتا ہے جب آدمی کے دِل میں بار بار یہ خیال چٹکیاں لیتا ہے کہ اس کام کے لیے بہ ہر حال تزکیۂ نفس ضروری ہے اور تزکیۂ نفس کے وہ طریقے جو مکے اور مدینے میں اختیار کیے گئے تھے۔ کچھ واضح اور منضبط نہیں ہیں اور بعد کے ادوار میں جن بزرگوں نے ان طریقوں کو منضبط کیا وہ صوفیائے کرام ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ سب بزرگانِ دین ہی ہیں لہٰذا اس کام کے لیے جو تزکیہ مطلوب ہے اس کو حاصل کرنے کے لیے تصوف کے معروف طریقوں میں سے کسی کو اختیار کرنا ناگزیر ہے۔ نئے طرز کے لوگوں میں تو شاید کم ہوں۔ مگر مذہبی خانوادوں میں جن لوگوں نے آنکھیں کھولی ہیں ان سب کو اس موڑ کی کشش کم و بیش متاثر کرتی ہے۔ میں ان سب لوگوں سے جو اس کشش کو محسوس کرتے ہیں عرض کرتا ہوں کہ بہ راہِ کرم اس مقام پر ٹھہر کر

خوب اچھی طرح غور و تحقیق کریں اور ذرا بے لاگ طریقے سے کریں کیا واقعی کہیں صوفیانہ لٹریچر میں اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے کہ اقامتِ دین اپنی وسیع و جامع تصوّر کے ساتھ ان بزرگوں کے پیش نظر تھی جن سے صوفیانہ طریقے ماثور ہیں۔ کیا کہیں اس بات کا پتہ نشان ملتا ہے کہ اسی راستہ کے لیے کارکن تیار کرنے کی غرض سے انھوں نے ان طریقوں کو اختیار کیا تھا؟ کیا ان طریقوں سے تیار کیے ہوئے آدمیوں نے کبھی یہ کام کیا ہے؟ اور کیا ہے تو کیا یہ طریقے اس کام میں مفید ثابت ہوئے ہیں؟

اگر کوئی شخص تحقیق میں بے جا عقیدتوں اور موروثی تعصّبات کو دخل نہ دے گا اور ٹھنڈے دِل سے بے لاگ تحقیق کرے گا۔ تو اسے اس معاملے میں پورا اطمینان ہو جائے گا کہ اقامتِ دین کے لیے ہمیں اسی طریق تزکیہ پر اعتماد کرنا ہوگا جو قرآن اور سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ملتا ہے وہ اگر منضبط نہیں ہے تو اب اسے منضبط کرنا چاہیے۔

اس موڑ کو جو شخص پورے اطمینان کے ساتھ چھوڑ کر آگے بڑھتا ہے اسے ذرا آگے چل کر ایک اور مقام پر حیرانی پیش آتی ہے۔ سیرت نگاروں نے عہد صحابہ کی شخصیتوں کے جو مرقعے کھینچے ہیں وہ اس کی نگاہ میں گھومنے لگتے ہیں اور یہ دیکھ کر اس کا دل بیٹھنے لگتا ہے کہ ان کتابی مرقعوں سے ملتی جلتی شخصیتیں تو کہیں نظر نہیں آتیں۔ پھر یہ بھلا کام کیسے ہوگا۔ اس مقام پر آدمی ہر طرف نظر دوڑاتا ہے کہ کہاں کوئی راستہ ملتا ہے۔ جدھر جا کر اپنی مطلوب شخصیتیں پا سکوں اور بسا اوقات شیطان یہاں بھی اس کو مشورہ دیتا ہے کہ بس اس جگہ سے پیچھے مڑ جاؤ یا مایوس ہو کر یہیں بیٹھ جاؤ۔ اس مرحلے پر بھی ٹھہر کر آدمی کو اچھی طرح غور کرنا چاہیے اور ٹھنڈے دل سے تحقیق کر کے ایک رائے قائم کرنی چاہیے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یہ عرض کرتا ہوں کہ یہاں جو کچھ بھی حیرانی و پریشانی آدمی کو لاحق ہوتی ہے دو حقیقتوں سے

غفلت کی بنا پر ہوتی ہے۔ وہ دو حقیقتیں، اگر اس کی سمجھ میں آ جائیں تو قلب مطمئن ہو جاتا ہے اور آگے کا راستہ صاف نظر آنے لگتا ہے۔
پہلی حقیقت یہ ہے کہ جن شخصیتوں کے نمونے وہ تلاش کر رہا ہے وہ شخصیتیں نہ ایک دن میں بنی تھیں اور نہ آپ ہی آپ بن گئیں تھیں۔ وہ بنانے سے ہی بنی تھیں سالہا سال میں بنی تھیں اور اگر بے لاگ تحقیق سے کام لیں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ گوشہ ہائے عزلت میں نہیں بنی تھیں بلکہ قرآن وسنت کی ہدایت کے مطابق اقامتِ دین کی جدو جہد میں لگ جانے اور جاہلیت کے خلاف کش مکش کرنے سے ہی بہ تدریج بن سنور کر وہ اس مرتبے پر پہنچتی تھیں جسے آپ سیرت کی کتابوں میں دیکھ دیکھ کر عش عش کر رہے ہیں۔ اب کوئی وجہ نہیں کہ شخصیت سازی کے اس طریقے کی پیروی کرنے سے وہی نتائج حاصل نہ ہوں۔ اس درجے کی نتائج نہ سہی اس طرز اور اس نوعیت کے نتائج تو یقیناً حاصل ہونے ہی چاہئیں۔ بہ شرطے کہ صبر سے کام لے کر اس طریقے کی پیروی کی جائے اور حکمت وتفقہ کے ساتھ اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر کی جائے۔
دوسری حقیقت جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ پریشانی لاحق ہوتی ہے یہ ہے کہ کتابی شخصیتیں واقعی شخصیتوں سے اچھی خاصی مختلف ہوتی ہیں۔ ایک گزرے ہوئے زمانے کے جو نقشے صفحۂ قرطاس پر کھینچے جاتے ہیں گوشت پوست کی دنیا میں بعینہٖ وہ نقشے کبھی پیدا نہیں کیے جاسکتے۔ لہٰذا جس شخص کو خیالی دنیا میں رہنا ہو بلکہ واقعی دنیا میں کچھ کرنا ہو اسے اس خیال خام میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ گوشت پوست کے انسان کبھی بشری کم زوریوں سے بالکل منزّہ اور تمام مثالی کمالات کا مرقع بن سکیں گے۔ آپ حدِ کمال کو نگاہوں سے اوجھل تو نہ ہونے دیں اور اس تک خود پہنچنے کو دوسروں کو پہنچانے کی کوششیں بھی جاری رکھیں مگر جب کہ آپ کو عملاً خدا کی راہ میں کام کرنا اور

ہزار ہا آدمیوں سے کام لینا ہو تو قرآن وسنت کے مطابق دین کے تقاضوں اور مطالبات کی ایک حدِاوسط آپ کو نگاہ میں رکھنی پڑے گی۔ جس پر آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا قائم ہو جانا راہِ خدا میں کام کرنے کے لیے کافی ہو۔ اور جس سے نیچے گر جانا قابل برداشت نہ ہو۔ اور حدِ اوسط خود ساختہ نہ ہونی چاہیے۔ اس کا مآخذ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت ہی ہونی چاہیے لیکن بہ ہر حال اس حد کو سمجھنا اور نگاہ میں رکھنا ضروری ہے اس کے بغیر کوئی عملی کام آدمی نہیں کر سکتا۔ صدرِ اوّل میں جن لوگوں سے خدا کا کام لیا گیا تھا وہ سب ہی یکساں نہ تھے اور نہ ان میں سے کوئی بشری کم زوریوں سے مبرّا تھا۔ آج بھی جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کام ہوگا۔ وہ ہر طرح کی کم زوریوں سے پاک نہ ہوں گے۔ یہ خوبی نظامِ جماعت میں ہونی چاہیے کہ وہ مجموعی طور پر ایک صالح اور حکیمانہ نظام ہو۔ اور اس کے اندر یہ استعداد بھی موجود ہو کہ افراد اس میں شامل ہو کر دین حق کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دیں اور ان کی کم زوریاں بروئے کار آنے کے کم سے کم مواقع پائیں۔

ان سب الجھنوں سے بچ نکلنے کے بعد پھر بھی آدمی کے دل میں یہ خلجان باقی رہ جاتا ہے کہ اپنے جن رفقاء کے ساتھ وہ اقامتِ دین کا کام کر رہا ہے وہ معیارِ مطلوب سے بہت کم ہیں اور ان کے اندر بہت سے پہلوؤں میں ابھی بہت سی خامیاں پائی جاتی ہیں۔ اس خلجان سے میں نے کسی رفیق کو بھی خالی نہیں پایا ہے اور میں خود بھی اس سے خالی نہیں ہوں لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر یہ خلجان ہمیں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی خامیاں دُور کرنے پر اکساتا ہے اور ان صحیح ذرائع و وسائل کی تلاش اور اس کے استعمال پر آمادہ کرتا ہے جن سے یہ خامیاں دُور ہوں تو مبارک ہے یہ خلجان اس سے مٹنا نہیں اور بڑھنا چاہیے۔ کیوں کہ ہماری ساری اخلاقی و روحانی ترقی کا انحصار اسی خلجان کی پیدا کی ہوئی خلش پر ہے، جس روز یہ مٹا اور ہم اپنی جگہ مطمئن ہو گئے

کہ جو کچھ ہمیں بننا تھا وہ ہم بن چکے ہیں اسی روز ہماری ترقی بند ہو جائے گی اور ہمارا تنزّل شروع ہو جائے گا۔ لیکن اگر یہ خلجان ہمیں مایوسی اور فرار پر آمادہ کرتا ہو۔ تو یہ خلجان نہیں وسوسۂ شیطان ہے جب بھی اس کی کھٹک محسوس ہو تو لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ پڑھیے اور اپنے کام میں لگ جائیے۔ اگر آپ واقعی خدا کا کام کرنے اٹھے ہیں تو خوب سمجھ لیجیے کہ ایسے وساوس سے دل کو پاک کیے بغیر آپ کچھ نہ کر سکیں گے۔ اس وقت شیطان کے لیے اس سے زیادہ مرغوب کوئی کام نہیں ہے کہ آپ کے سامنے تحریکِ اسلامی کی ہر خوبی کو بے قدر اور بے وزن کر کے پیش کرے اور اس کی یا اس کے افراد کی ہر کم زوری کو بڑھا چڑھا کر دکھائے تا کہ آپ کسی صورت دل چھوڑ بیٹھیں۔

(ترجمان القرآن نومبر ۱۹۵۱ء)

سیدھی اور مستقیم راہ

یہ وہ اقامتِ دین کی سیدھی اور مستقیم راہ سلوک ہے، جس پر مولانا مودودی برسوں سے خود چل رہے ہیں اور بے شمار بندگانِ خدا ان سے استفادہ کر کے اس راہ پر چل رہے ہیں۔ ان چلنے والوں کے مختلف مقامات اور ان کی مختلف قلبی اور ذہنی کیفیات ہیں۔ ان سب کے سامنے مولانا نے اس راہ کی مختلف مشکلات کی وضاحت اور مختلف پیچیدہ مقامات اور دھوکا دینے والے مظاہر اور دوراہوں کی نشان دہی کر کے ان کا علاج بھی تجویز کر دیا ہے۔ یہ وہی راہِ سلوک ہے جس پر فنی اصطلاحات کی گرانباری اور منضبط اصول و قواعد کی قید و بندش کے بغیر ہی حضوؐر اور آپ کے رفقا نے چل کر اللہ کا کام سرانجام دیا تھا اور اس کام کو سرانجام دینے کے لیے مولانا بھی ایک طویل عرصے سے سرگرم عمل ہیں۔ اللہ کی راہ میں اٹھ کھڑے ہونا۔ اس کے رسول پاکؐ کے اسوہ کی احترام و اطاعت کا قوی ترین جذبہ لے کر اپنے آپ پر فرائض کی پابندی اور کبائر سے اجتناب کا پہرہ لگا دینا۔ ساری عمر کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقام پر کھڑے ہو کر گزار دینے

کا عہد کر لینا۔ اور اس راہ میں تن، من، دھن سب کچھ کھپا دینے کا عزم کر کے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جانا۔ اللہ کی راہ میں اس کے دیے ہوئے سارے سرمائے کو لٹا کر اس سے آخرت کے اجر کی توقع باندھنا اور کسی قسم کے کبر و ریا کے بغیر بندگانِ خدا کی تعریف و خدمت سے بے نیاز ہو کر دیوانہ وار اس راہ پر گام زن رہنا اور اس راہ میں جان تک دینے کی تمنائیں دل میں پالنا اور پرورش کرنا۔ بس اقامتِ دین کی راہ سلوک کے یہی خدوخال اور نشانات ہیں۔ اور ان خدوخال کی راہ پر چلنے والے راہ رو کے لیے کسی کو یہ اطمینان دلانا تو شاید مشکل ہو کہ وہ فنّی اور اصطلاحی تصوّف کے آداب و مدارج کا بھی پورا اہتمام کر رہا ہے یا نہیں البتہ اس کا قلب یہ گواہی ضرور دے سکتا ہے کہ یہ راہِ سلوک دنیا اور آخرت میں اللہ کی رضا حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

مولانا مودودی
اپنے
مکاتیب کے آئینے میں

آدمی کے مکاتیب اس کے اندر کے انسان کو نہایت عمدگی سے بے نقاب کرتے ہیں اور جس آسانی سے کوئی شخص مکاتیب میں اپنے دل و دماغ کو کھول کر رکھ دیتا ہے اتنی آسانی سے وہ اپنے دیگر مضامین علم و ادب میں نہیں کھلتا اسی لیے کسی شخص کے پرائیویٹ مکاتیب اس کی ذات اور شخصیت کا بہترین آئینہ ہوتے ہیں، جس میں اس کے دل و دماغ، جذبات، خیالات اور ذات کی مختلف جزئیات کو بڑی آسانی سے دیکھا پرکھا اور پڑھا جاسکتا ہے۔

اس لیے میں نے مولانا مودودی کے چند مکاتیب کو یہاں خصوصی طور پر شامل کرلیا ہے۔ مولانا نے مکاتیب تو ہزاروں لکھے ہیں۔ اس لیے کہ انھیں دنیا کے مختلف گوشوں سے اور خصوصاً ملک کے اطراف و جوانب سے بیسیوں خطوط، سوالات، اعتراضات اور استفسارات روزانہ ہی آتے رہتے ہیں جو ہر نوعیت اور علم و ادب کے ہر گوشے سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور مولانا کا خط و کتابت کا کام غالباً دوسرے سب کاموں سے زیادہ وسیع ہے، جو انھیں بے حد مصروف رکھتا ہے۔ ان کے اکثر وہ مکاتیب، جو مختلف علمی، دینی، سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور تنظیمی مسائل سے متعلق ہوتے ہیں۔ اب تک رسائل و مسائل کے نام سے پانچ مجموعوں کی شکل میں مرتب بھی ہو چکے ہیں، جن میں ان کے وسیع علم کا ہر گوشہ نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سائل کو کتنی حکمت اور عمدگی سے اپنے دل نشین استدلال سے مطمئن کرنے کا بہترین سلیقہ اور ملکہ رکھتے ہیں لیکن میں نے ان کے یہاں صرف چند وہ مکاتیب لیے ہیں، جو اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے نہایت اہم بھی ہیں اور نایاب بھی۔

مکتوب نمبر ۱، ۲ اور ۳ ان کے تصور دین پر نہایت اختصار اور جامع انداز میں روشنی

ڈالتے ہیں۔۴ اور ۵ اپنی تاریخی اہمیت کے اعتبار سے نایاب ہیں اور مولانا کی سیاسی بصیرت پر ایسے گواہ ہیں، جنھوں نے گویا زمانہ گزرنے کے بعد اس بصیرت کی روشنی میں بیان کیے ہوئے لفظ لفظ کو سچ کر دکھایا ہے۔ مکتوب نمبر ۶ سے ۱۰ پاکستان جیل میں سے مختلف حضرات کے نام لکھے گئے ہیں لیکن جن کا موضوع حالات کے پیش نظر بیشتر جبر و استبداد ہے۔ خصوصاً جو خط چیف سیکریٹری حکومت پنجاب کے نام قید بلا مقدمہ کے موضوع پر لکھا گیا ہے وہ تو اپنے استدلال اور حق گوئی کے اعتبار سے اعلائے کلمۃ الحق کی بہترین مثال ہے۔ مکتوب ۱۱ جماعت اسلامی کی داخلی تاریخ کا ایک اہم باب ہے، جس کا ذکر روداد ِ جماعت حصہ اول میں بھی آیا ہے لیکن مکتوب الیہ کے تقاضوں کے پیش نظر شائع نہ ہوا تھا۔ اب یہ شائع ہوا ہے تو اپنے اندر دین کے لیے کام کرنے اور اس کے لیے مردانِ کار کی فراہمی، موجودہ اسباب و وسائل کے استعمال اور مختلف مراحل کے بارے میں ایسے ایسے پُر حکمت نفسیاتی نکات بیان کرتا ہے کہ مجرّد اس کا مطالعہ ہی آدمی کے دل و دماغ کو اقامتِ دین کی جدوجہد میں یکسو ہو کر لگا دینے کے لیے کافی ہے۔ مکتوب نمبر ۱۲ مولانا مودودی اور علاّمہ اقبالؒ کے تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے اور اس کے لیے ہم ادارہ چراغ راہ کے توسط سے ادارہ چٹان کے بھی ممنون ہیں۔ مکتوب نمبر ۱۳ فسادات ِ جبل پور میں بھارتی مسلمانوں کا قتل عام پر تبصرہ اور اس پر عربوں کی طرف سے خاموشی پر اظہار رنج و غم ہے۔ یہ خط محترم محمد احمد باشمیل سیکریٹری ہیئت امر بالمعروف مکہ معظّمہ کے نام لکھا گیا تھا، جس کا بہت پر جوش جواب موصوف نے دیا اور اپنے طور پر عربی پریس میں حادثہ جبل پور پر رنج و افسوس کا اظہار اور عربوں کو غیرت دلانے کی کوشش بھی کی اور ساتھ میں عرب نیشنلزم، جو غیر عرب مسلمانوں کے مسائل میں دلچسپی لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اس کی مذمت بھی کی گئی۔ آخری خط اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں مولانا نے اپنے ایک عزیز رفیق کو مطالعے کے لیے چند مشورے جیل میں سے ارسال کیے ہیں۔ ان مشوروں سے ہر تعلیم یافتہ نوجوان استفادہ کر سکتا ہے۔

(۱)

اچھرہ لاہور

۱۱؍مارچ ۱۹۴۹ء

محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ اگرچہ آپ کے ارشادات جواب طلب نہ تھے لیکن چوں کہ آپ نے لفافہ بھیجنے کی تکلیف گوارا فرمائی ہے اس لیے چند سطور لکھے دیتا ہوں۔

ہر آدمی کے لیے اس کا فرض اسی سرزمین پر عائد ہوتا ہے، جہاں وہ پیدا ہوا ہو اور قیام رکھتا ہو اور دوسری جگہ اس کا جانا اسی صورت میں درست ہوتا ہے جب کہ وہ اپنی پیدائشی سرزمین میں اپنا فرض نہ ادا کر سکتا ہو۔ اس کے علاوہ ہر آدمی کے لیے فطری طور پر میدانِ عمل اس کا اپنا وطن ہے۔ جہاں کی زبان، عادات اور خصائل سب سے وہ پوری طرح واقف ہوتا ہے۔ اب اگر یہ زمین سنگلاخ ہو تو اسے کوشش کر کے دیکھ لینا چاہیے کہ وہاں کوئی بیج جڑ پکڑ سکتا ہے یا نہیں۔ کوشش کے بعد مایوسی ہو جائے تو دوسری مناسب سرزمین تلاش کرنا درست ہے۔

انتخابات کے متعلق آپ نے جو بات تحریر فرمائی ہے آپ اس کے سوا کچھ اور فرما بھی نہیں سکتے تھے! کیوں کہ آپ کے لیے یہ معلوم کرنے کا کہ اسلام کی اصولی تعلیمات کا ہندستان کے موجودہ سیاسی مسائل سے کیا تعلق ہے اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ آپ بڑے بڑے علماء کی طرف دیکھیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ لیکن اسے میری بدقسمتی سمجھتے یا خوش قسمتی کہ میں اپنا دین معلوم کرنے کے لیے چھوٹے یا بڑے علماء کی طرف دیکھنے کا محتاج نہیں ہوں! بلکہ خود خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت سے یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ دین کے اصول کیا ہیں اور یہ بھی تحقیق کر سکتا ہوں کہ اس ملک میں، جو لوگ دین کے علم بردار سمجھے جاتے ہیں وہ کسی خاص مسئلہ میں صحیح مسلک اختیار کر رہے ہیں یا غلط۔ اس لیے میں اپنی جگہ مجبور ہوں کہ جو کچھ قرآن اور سنت سے حق پاؤں اسے حق سمجھوں بھی اور اس کا اظہار بھی کر دوں۔ آپ جو حق کو جاننے کے لیے دوسروں کے محتاج ہیں آپ کے لیے یہ تجربہ کسی نہ کسی طرح درست ہو بھی سکتا ہے کہ جن علماء کو آپ معیارِ حق سمجھتے ہیں ان کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلیں۔ لیکن آپ کے لیے یہ آخر کس طرح درست ہو گیا کہ جو اپنی آنکھوں راستہ دیکھنے کی قوت رکھتا ہے اس سے بھی آپ یہ مطالبہ کریں کہ وہ کسی دستگیر کا محتاج نابینا بن کر چلے یا اپنی بینائی کو آپ کی خاطر جھٹلائے۔

خاک سار
ابوالاعلیٰ

بنام علی سفیان لاہور

(۲)

لاہور

۱۶/اپریل ۱۹۴۰ء

محترمی ومکرمی! السلام علیکم

آپ ان معترض مولوی صاحب سے کہیے کہ عبادت اور اطاعت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ بلکہ عبادت اصل ہے اور اس کی بہت سی فرعیں ہیں، جن میں ذکر، دعا، تسبیح، تحمید اور اطاعت سب شامل ہیں۔ قرآن میں اگر اطاعت کا الگ ذکر کیا گیا ہے اور اسی بنا پر آپ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اطاعت، عبادت سے الگ ایک مستقل چیز ہے تو اسی طرح قرآن میں ذکر و دعا اور تسبیح و تحمید وغیرہ کا بھی الگ الگ ذکر کیا گیا ہے پھر کیا آپ ان چیزوں کو بھی عبادت سے جدا مستقل مفہومات قرار دیں گے؟ قرآن کا تو قاعدہ یہی ہے کہ کہیں وہ ایک چیز کو مجمل بیان کرتا ہے اور کہیں دوسرے مقامات پر اس کی تفصیلات الگ الگ بیان کر دیتا ہے۔

مثلاً صلوٰۃ ہی کو لے لیجیے۔ کہیں اس کو صلوٰۃ کہا گیا ہے، کہیں ذکر، کہیں رکوع، کہیں سجود، کہیں قیام اور کہیں تسبیح۔ کیا آپ اس سے یہ مطلب لیں گے کہ صلوٰۃ الگ ایک چیز ہے اور یہ باقی پانچ چیزیں الگ الگ مستقل عبادتیں ہیں؟ اگر نہیں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ باقی پانچوں چیزیں اسی جامع لفظ صلوٰۃ کی تشریحات ہیں اور اسی طرح آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس کو قرآن معبود قرار دیتا ہے اس کو حاکم، بادشاہ، مطاع، مستعان، مسجود سب کچھ قرار دیتا ہے اور ان میں سے جس حیثیت میں بھی کسی دوسرے کو خدا کا شریک قرار دیا جائے وہ شرک فی العبادت ہوگا۔

سورۂ ناس پڑھیے، پہلے ہی ارشاد ہوتا ہے: قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ o مَلِكِ النَّاسِ یہاں خدا ہی رب ہے وہی بادشاہ ہے وہی اِلٰہ ہے۔ اگر کوئی انسان بادشاہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ رب اور اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی انسان کی بادشاہی تسلیم کرتا ہے تو وہ شرک فی الربوبیت اور شرک فی الالوہیت کرتا ہے۔

سورۂ یوسف میں دیکھیے جو لوگ فرماں روائے مصر کو اپنا بادشاہ مانتے تھے حضرت یوسفؑ ان سے خطاب کر کے جگہ جگہ اس فرماں روا کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

- اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِىْ رَبَّهٗ خَمْرًا o ''تم میں سے ایک اپنے رب کو شراب پلائے گا۔''

● **اُذْکُرْنِیْ فِیْ عِنْدَ رَبِّکَ** ''اپنے رب سے میرا ذکر کرنا۔''

● **اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّکَ۔** ''اپنے رب کے پاس واپس جاؤ۔''

اس کے مقابلہ میں وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر جگہ جگہ رَبِّیْ (میرا رب) کے ساتھ کرتے ہیں یعنی تمھارا رب وہ انسان ہے اور میرا رب اللہ ہے۔ پھر قید خانہ کے ساتھیوں کو جو شاہِ مصر کے مطیع اور اس کے تابع تھے۔ اپنا دین ان الفاظ میں سمجھاتے ہیں:

یَا صَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُo مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ ؕ ذَالِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (یوسف:۳۹،۴۰)

''اے زنداں کے ساتھیو! بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا ایک اکیلا اللہ بہتر ہے، جو سب پر قہر و غلبہ رکھنے والا ہے؟ اس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کرتے ہو وہ تو محض نام ہیں، جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں (یعنی وہ حقیقت میں نہ رب ہیں نہ ملک نہ الٰہ)۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سلطان (Authority) نہیں نازل کی ہے۔ حکم تو صرف اللہ کے لیے ہے اس کا فرمان ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور یہی سیدھا دین ہے۔''

یہاں آپ دیکھ لیجیے کہ رب کا صاف مفہوم حاکم ہے۔ کسی کا حکم ماننا ہی اس کی عبادت کرنا ہے اور یہی مطلب اس کو رب ماننے کا بھی ہے۔ اسلام کی تعلیم کا مدعا یہی ہے کہ تمام متفرق ارباب کو چھوڑ کر اللہ واحد قہار کو رب مانا جائے اور اس کو رب ماننے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے سوا کسی کو حاکم تسلیم نہ کیا جائے اور اس کے حکم کے آگے سر جھکا دینا ہی اس کی عبادت ہے۔ پھر کہا گیا ہے کہ یہی سیدھا اور صحیح دین ہے اور اس کے مقابلہ میں ٹیڑھا اور غلط دین کیا ہے؟ خدا کے سوا کسی دوسرے قانون و آئین کی اطاعت کرنا۔ کیوں کہ آگے چل کر شاہِ مصر کے قانون کو بھی دین کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اسی سورۂ یوسف کے نویں رکوع میں ہے۔

مَا کَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاهُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِکِ۔ (یوسف:۷۶)

''یوسف اپنے بھائی کو بادشاہ کے دین (یعنی اس کے قانون) کی رُو سے نہیں پکڑ سکتے تھے۔''

دیکھ لیجیے! اس بادشاہ کا قانون ''دین الملک'' ہے اور اللہ کا حکم ''دین اللہ'' ہے۔ مولوی صاحب کی خدمت میں میری طرف سے عرض کر دیجیے ''کہ آپ نے لوگوں کے لیے عبادت کے مفہوم کو ''پوجا'' میں محدود کر کے اور اطاعت کو عبادت سے الگ کر کے ہی مسلمانوں کے لیے غیر اللہ کی بندگی کا دروازہ کھولا ہے۔ بہ راہِ کرم اپنی اس غلطی کو سمجھئے اور اس کی تلافی کیجیے کہ ایک دن مالك يوم الدين کے سامنے جانا ہے اور وہاں پوچھا جانے والا ہے کہ لمن الملك اليوم؟ دنیا میں تو تم نے دوسروں کی بادشاہی مان لی، مگر آج بتاؤ کہ کس کی بادشاہی ہے؟

خاک سار
ابوالاعلیٰ

بنام چودھری علی احمد خاں پھلور

(۳)

لاہور
یکم ستمبر ۱۹۴۰ء

محترمی و مکرمی! السلام علیکم

جس بے چینی کا آپ ذکر کرتے ہیں یہ ایمان کی زندگی کی علامت ہے اسے بڑھنے دیجیے۔ اس کو روکنے کی دو صورتیں ممکن ہیں، ایک یہ کہ آپ تاویلیں کر کے اپنے دل کو گم راہ کرنے کی کوشش کریں اور رفتہ رفتہ اسے ان حالات سے موافقت کرنے پر راضی کر لیں جن میں آپ کو گھرا ہوا پا کر وہ بے چین ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ قبل از وقت ان حالات سے نکل جائیں جن کے خلاف دل بغاوت کر رہا ہے۔ یہ دونوں صورتیں مصنوعی ہیں۔ پہلی صورت اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایمان میں، جو زندگی پیدا ہو رہی ہے وہ موت سے بدل جائے گی۔

دوسری صورت اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فوری جذبہ کے تحت عمل کرنے سے فوری تسکین تو ہو جائے گی مگر جب Hard Realities of Life سے سابقہ پڑے گا اور اس وقت دوسری قسم کی سخت تکلیفیں پہنچیں گی تو مسرّت اور اطمینان کے بہ جائے پشیمانی کا جذبہ پیدا ہونے لگے گا۔ کیوں کہ ایمان کے پختگی تک پہنچنے سے پہلے اقدام کیا گیا تھا۔ اس صورت میں بسا اوقات پشیمانی کا اتنا غلبہ ہو جاتا ہے کہ آدمی اپنے ایمان لانے پر بھی پشیمان ہونے لگتا ہے۔ خدا اس حالت

سے بچائے لہٰذا میں آپ کو ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت اختیار کرنے کا مشورہ نہ دوں گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اس بے چینی کو اس کی فطری رفتار کے ساتھ بڑھنے دیں۔ یہاں تک کہ جب وہ بڑھتے بڑھتے اس حد کو پہنچ جائے کہ آگ میں ڈال دیا جانا بھی آپ کو اس زندگی کی بہ نسبت عزیز تر معلوم ہونے لگے، جو غیر اسلامی اصول پر بسر ہوتی ہو تب اپنے ضمیر کے فتوے پر عمل کریں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ہر اس کام کو اپنے لیے خوش گوار پائیں گے۔ ہر اس حالت میں پوری خوشی محسوس کریں گے، جس کے اندر ایمان کی سلامتی ہو۔ بلا لحاظ اس سے کہ جسم و جان کا اس میں کتنا ہی زیاں ہو۔ اس وقت آپ کو کامل سکون و اطمینان حاصل ہوگا۔ جو کچھ بھی آپ کریں گے قلب کے پورے اطمینان کے ساتھ کریں گے اور خواہ کتنی ہی تکلیفیں آپ کو پہنچیں۔ کبھی آپ کے دل میں اس بات پر پشیمانی راہ نہ پاسکے گی کہ ایسا راستہ کیوں اختیار کیا تھا۔ نہ کبھی مصائب سے بھری ہوئی اسلامی زندگی کو آسائش سے بھری ہوئی غیر اسلامی زندگی سے بدلنے کا خیال تک آپ کے دل میں آسکے گا۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ

بنام چودھری علی احمد خاں پھلور

(۴)

لاہور
۱۹۳۸ء

محترمی[1] و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عنایت نامہ ملا۔ الحمد للہ کہ بخیر ہوں۔ فتنہ خاک سار بجز اس کے کہ مسلمانوں کی بد قسمتی کا ایک نشان ہے اور کچھ نہیں۔ جو قوم اپنے دین سے جاہل ہو۔ اور جس کا ذہن بالکل پراگندہ ہو چکا ہو اور جس میں حق اور باطل کی کوئی تمیز باقی نہ رہی ہو حتیٰ کہ جس کا معیار آدمیت بھی حد سے زیادہ پست ہو چکا ہو۔ صرف ایسی ہی قوم میں اس قسم کی تحریکیں فروغ پا سکتی ہیں۔ مشرقی صاحب

---

(۱) ۱۹۳۸ء میں ایک صاحب نے کانپور سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے خاکسار تحریک اور اس میں شمولیت سے متعلق استفسار کیا، جس کے جواب میں مولانا نے یہ مکتوب لکھا، جسے اس وقت کے کئی اسلامی جرائد نے شائع کیا۔ اگرچہ موجودہ حالات میں جب خاکسار تحریک موجود نہیں ہے اس کی اشاعت بہ ظاہر بے وقت معلوم ہوتی ہے لیکن اس خط میں مولانا نے جس اعلیٰ درجے کی بصیرت کے ساتھ اس تحریک کا تجزیہ کیا ہے اور اس تجزیے کے لفظ لفظ کی صداقت پر جس طرح آنے والے حالات نے گواہی دی ہے یہ ہندستان میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کا ایک دردناک حیرت انگیز باب ہے، جس کا مطالعہ کسی صورت بھی فائدہ سے خالی نہیں۔ (جاری کردہ۔ محبوب شاہ ہاشمی۔ سرگودھا)

کی پرائیویٹ زندگی سے بحث نہیں۔ پبلک زندگی میں وہ جھوٹے اور بزدل ثابت ہوئے ہیں۔ سخت غیر مدبّر آدمی ہیں۔ان کی زندگی کا کوئی اصول نہیں۔ کئی لاکھ مسلمانوں کا لیڈر ہونے کے باوجود، جو شخص علی الاعلان جھوٹ بولے، جو خود اپنی تحریر سے انکار کر جائے۔ جو معافی مانگ کر رہائی حاصل کرے اور پھر اپنی عزت برقرار رکھنے کے لیے اپنے عہد کو توڑے، جو یو پی گورنمنٹ کے دباؤ سے بچنے کے لیے ۵۰؍ ہزار مسلمانوں کی خدمات بے تکلّف انگریزی فوج کے لیے پیش کر دے۔ایسے شخص کی قیادت اگر مسلمان تسلیم کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نام نہاد مسلمان اب اخلاقی تنزل کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں اور جس قوم کا معیار اخلاق اتنا پست ہو جائے اس کے حق میں یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ کبھی دنیا میں ایک باعزت قوم کا مرتبہ حاصل کر سکے گی۔ مشرقی صاحب کے طرز تحریر کو دیکھیے تو اتنا پایہ شرافت سے گرا ہوا ہے کہ مسلمان تو درکنار ہر شریف آدمی کی طبیعت اس کو دیکھ کر نفرت کرے گی انھوں نے پبلک کو دھوکہ دینے اور جھوٹ بول بول کر لوگوں کو مسحور کرنے کے جو ڈھونگ اختیار کیے ہیں اور جن طریقوں سے گزشتہ چند برسوں میں اپنی تحریک کو فروغ دیا ہے وہ ایک صداقت پسند آدمی کو ان کی تحریک کی طرف کھینچنے کے بہ جائے اس سے نفرت دلاتے ہیں۔ مگر میں یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا ہوں کہ مسلمانوں کے اندر انھی طریقوں سے مشرقی صاحب کو فروغ حاصل ہے۔ سچ عرض کرتا ہوں کہ اس قسم کے واقعات دیکھ کر مسلمانوں سے میری مایوسی روز بہ روز بڑھتی جارہی ہے۔

میں حیران ہوں کہ جس قوم میں ایسے ذلیل طریقے فروغ پاسکتے ہیں اور جو اتنے پست اخلاق اور گھٹیا درجے کے آدمیوں کے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو جاتی ہے اس کا اخلاقی وقار دنیا میں کیسے باقی رہ سکتا ہے۔ دو چار یا ہزار دو ہزار آدمی ایسے ہوتے تب بھی کوئی بات نہ تھی مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ لاکھوں مسلمان اس کے پیچھے ہیں۔ لاکھوں اس سے ہم دردی رکھتے ہیں، مسلمانوں کے بہ کثرت اخبارات اس کی حمایت کر رہے ہیں اور بعض بڑی ذمے دار مسلمان انجمنیں اس کی تائید پر ہیں۔ یہ صورت حال اس بات کا پتہ دے رہی ہے کہ اخلاقی پستی ایک وبائے عام کی طرح مسلمانوں میں پھیل چکی ہے اور ان کا معیار انسانیت وشرافت بالعموم گرتا جا رہا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ آدمی کا اپنی قوم سے محبت کرنا وہ عصبیت جاہلیہ نہیں ہے، جس کو دین منع کرتا ہے البتہ آدمی کا حق و باطل سے بے نیاز ہو کر ہر حال میں اپنی قوم والے کی حمایت کرنا خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر، یہ عصبیتِ جاہلیہ ہے اور یہی وہ چیز ہے، جس کو دین مٹانا چاہتا

ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں میں یہی عصبیتِ جاہلیہ پیدا ہوتی جارہی ہے۔ مشرقی صاحب نے، جس طریقے سے قضیۂ مدح صحابہ میں مداخلت فرمائی۔ کوئی انصاف پسند، سچا اور معقول آدمی اس کو جائز طریقہ نہیں کہہ سکتا۔ اس زمانے کے ''الاصلاح'' کے مضامین دیکھیے صریح طور پر فریقین کے لیڈروں کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ فریقین کو خطرناک اقدام کا خوف دلایا گیا۔ اور کہا گیا کہ ہم بہ زور اس جھگڑے کو دبائیں گے۔ فرمائیے کون سی حکومت اس طرزِ عمل کو گوارا کر سکتی تھی؟ یو پی کی حکومت ہندوؤں کی حکومت سہی۔ میں کہتا ہوں کہ کیا کوئی اسلامی حکومت بھی اس کو گوارا کر سکتی تھی کہ مسلمانوں کا کوئی گروہ قانون کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر کسی نزاع کے فریقین کو قتل کی دھمکیاں دے اور کسی نزاع کو بہ زور دبانے کا ارادہ کرے پس یو پی گورنمنٹ نے مشرقی صاحب اوران کے اعوان وانصار کے ساتھ، جو کچھ کیا بالکل جائز کیا۔ اب اگر مسلمان ایک خطا کار کا ساتھ صرف اس لیے دیتے ہیں کہ وہ اپنی قوم کا آدمی ہے اور یو پی گورنمنٹ کے مقابلے میں صرف اس لیے اس کی حمایت کرتے ہیں کہ وہ ہندو گورنمنٹ ہے تو یہ صریحاً عصبیتِ جاہلیہ ہے اخلاق کے سوال سے قطع نظر کر کے اپنی قوم والے کا ساتھ دینا غیر مسلموں کا کام ہے مسلمان بھی اگر یہی کام کرنے لگے تو پھر ان میں اور غیر مسلموں میں فرق کیا رہا؟ کس لحاظ سے وہ غیر مسلم قوموں کے مقابلے میں اپنی اخلاقی برتری کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟ اور میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں کو تو دنیا بھر کی قوموں سے الگ ایک گروہ بنایا اس لیے گیا ہے کہ یہ عصبیت جاہلیہ سے پاک ہو کر مجرد حق کی حمایت کرے اور خالصۃً اخلاقی اصولوں کا علم بردار بن کر اُٹھے۔ اگر اس نے اپنی یہ خصوصیت کھو دی اور وہی پوزیشن اختیار کر لی، جو غیر مسلموں کی ہے تو پھر اس نئی جماعت کے وجود کی حاجت ہی کیا باقی رہی کیا اسلام بس اس لیے آیا تھا کہ اپنے نام سے ایک قوم بنا کر دنیا کی باطل پرست قوموں میں ایک اور قوم کا اضافہ کر دے؟

خاک سار تحریک کی مذہبی حیثیت کے متعلق مجھے آپ سے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ خود صاحبِ علم ہیں۔ مشرقی صاحب کی کتابوں کو دیکھ کر خود معلوم کر سکتے ہیں کہ ان حضرات نے اسلام کے اصولوں کو کس طرح مسخ کیا ہے۔ خیالات اور نظریات کے اعتبار سے ان میں اوران دوسرے مادہ پرستوں میں کوئی فرق نہیں ہے، جنھوں نے یورپ سے مادہ پرستی کا سبق حاصل کیا ہے البتہ فرق یہ ہے کہ دوسرے لوگ اس مادہ پرستی کو الگ مذہب جان کر اختیار کرتے ہیں اور اسے ''اسلام'' نہیں قرار دیتے۔ مگر مشرقی صاحب اسے عین اسلام قرار دینے اور قرآن

سے اس کا ثبوت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح مشرقی صاحب ان سب کی بہ نسبت اسلام اور مسلمانوں کے لیے زیادہ خطرناک ہیں۔ جو چیز عین اسلام کی ضد ہے، جسے مٹانے کے لیے اسلام آیا ہے خود اسی کو اسلام قرار دینا اور مسلمانوں کو یقین دلانا کہ اسی کو لے کر محمد رسول اللہؐ تشریف لائے تھے۔ یہ وہ کارنامہ ہے، جو مشرقی صاحب نے اس بیسویں صدی میں انجام دیا ہے افسوس کہ عام مسلمان اور انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان اپنے دین سے اس قدر ناواقف ہو چکے ہیں کہ وہ اس جعل کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ ان کے سامنے جب ایک شخص حرکت عمل، جہاد، تنظیم، اطاعت، امیر، اور غلبہ وتمکن فی الارض کے ظاہر فریب نام لیتا ہے تو اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ بس آ گیا ہمارا نجات دہندہ۔ مگر ان میں یہ سمجھنے کی تمیز نہیں کہ باطل حرکت وعمل اور حق کی حرکت وعمل میں کیا فرق ہے، جہاد فی سبیل اللہ اور جہاد فی سبیل الطاغوت میں کیا جوہری اور روحی امتیاز ہے۔ فرعونی تنظیم اور نمرودی اطاعتِ امیر کیا ہے اور اسلامی تنظیم واطاعت امیر کن حقائق کی بنیاد پر اس سے ممتاز ہوتی ہے خدا سے بغاوت کرنے والوں کا غلبہ وتمکن، جو عاد اور ثمود اور فرعون ونمرود کو حاصل تھا اس خلافتِ الٰہی سے کس بنیاد پر ہوتا ہے جسے محمد رسول اللہؐ نے قائم کیا تھا۔ یہ لوگ ان امور کو نہ تو خود سمجھنے کے اہل ہیں اور نہ طغیان جاہلیت ان کو اس کی اجازت دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص انھیں سمجھائے تو ٹھنڈے دل سے اس کے دلائل پر غور کریں۔ ایسی حالت میں سوا اس کے کیا چارہ ہے کہ آدمی صبر کرے اور ان جاہلوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ حق کی تبلیغ میں مشغول رہے یہی طریقہ میں نے اختیار کیا ہے آپ دیکھتے ہیں کہ میں نے خاک سار تحریک کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ ہر طرف سے مطالبہ ہو رہا ہے کہ اس کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرو۔ مگر میں خاموش بیٹھا ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں خاک ساروں سے ڈرتا ہوں۔ یا ان کے لیڈر کی بدزبانی اور گالیوں سے خوف زدہ ہوں۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس وقت مجھے عام مسلمان اس موڈ میں نظر نہیں آتے کہ وہ کسی معقول بات کو سن کر قبول کریں گے۔ ان پر پریشانی اور گھبراہٹ مسلط ہے اور اس حالت میں وہ ہر رہزن کو رہنما مان کر اس کے پیچھے دوڑ چلنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس وقت اگر کوئی انھیں سمجھائے گا کہ بھائیو! یہ رہزن ہے جس کے پیچھے تم جا رہے ہو تو یہ الٹا اسی کو دشمن سمجھنے لگیں گے لہٰذا ان کا علاج یہی ہے کہ جدھر یہ جا رہے ہیں ادھر جانے دیجیے اور صبر کے ساتھ دیکھتے رہیے۔

جب یہ رہزنوں کے پیچھے چلنے کے تلخ نتائج خوب اچھی طرح دیکھ لیں گے، چوٹیں

کھائیں گے، ذلتیں سہیں گے، تب ان کو ہوش آئے گا اور خدا کی دی ہوئی بینائی سے کام لینے پر آمادہ ہوں گے۔ سرِ دست تو میں صرف اسی کو دین کی خدمت سمجھتا ہوں کہ فتنوں اور فتنہ پردازوں کی طرف سے بالکل بے پرواہ ہوکر دین کے اصول اور اس کی تعلیمات کو زیادہ سے زیادہ معقول طریقے سے سمجھانے اور پھیلانے کی کوشش کی جائے۔ اور جن جن لوگوں میں قبولِ حق کی صلاحیت ہے انھیں دائرۂ اسلام میں لایا جاتا رہے عام اس سے کہ وہ پیدائشی مسلمان ہو یا پیدائشی کافر۔ اس کے بعد اگر اللہ کو منظور ہوگا تو وہ کوئی راہ پیدا کرے گا۔

خاک سار تحریک سے اگر آپ کسی سیاسی فائدے کی توقع رکھتے ہیں تو اسے بھی دل سے نکال دیجیے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ تحریک کسی پہلو سے بھی مسلمانوں کے لیے مفید ثابت نہیں ہوسکتی کسی تحریک کے بانی اور لیڈر کے عقائد و نظریات کسی حال میں نظر انداز نہیں کیے جاسکتے در حقیقت یہی چیز ہر تحریک کی روح رواں ہوتی ہے لہٰذا ہر صاحب فکر آدمی یہ سمجھنے پر مجبور ہے اس لیے کہ خاک سار صاحبان ہر جگہ مشرقی صاحب اور ان کے تذکرہ کی مدافعت کرتے اور ان کے حق میں مناظرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ جس تحریک کی بنیاد ان عقائد و نظریات پر ہو اور جس کے پیرووں میں عام طور پر یہ عقائد و نظریات پھیلے ہوئے ہوں، اس سے وہ لوگ کبھی موافقت نہیں کرسکتے، جو اسلام کا کچھ بھی علم رکھتے ہیں لامحالہ وہ اس کی مخالفت ہی کریں گے۔ اور عام مسلمان، جو ان کے زیرِ اثر ہیں، یا ان پر اعتماد رکھتے ہیں وہ بھی اس تحریک کی مخالفت کریں گے نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ تحریک خود مسلمانوں میں باہم ایک زبردست تفرقہ کی بنیاد ڈال دے گی۔ گھر گھر اور محلّہ محلّہ اور مسجد مسجد خاک ساروں اور ان کی مخالفت کرنے والے مسلمانوں میں جھگڑے برپا ہوں گے۔ یہاں تک کہ ایک نیا فرقہ اور جنگجو فرقہ وجود میں آجائے گا۔ اس خانہ جنگی کے سوا یہ تحریک کوئی اور نتیجہ پیدا کرتی نظر نہیں آتی لہٰذا اس سے کسی خیر کی توقع کرنا سخت غلطی ہے۔

علاوہ بریں مشرقی صاحب کی تحریر، تقریر اور ان کی حرکات سب کی سب اس کا پتہ دیتی ہیں کہ وہ ایک غیر متوازن دماغ کے آدمی ہیں۔ ان کی قیادت میں، جو تحریک چلے گی اس کی مثال بالکل ایسی ہوگی، جیسے کسی موٹر کو کوئی مخمور آدمی چلا رہا ہو۔ نہیں کہہ سکتے کہ شراب کے نشے میں وہ موٹر کو کس درخت سے ٹکرا دے گا۔ یا کس گڑھے میں پھینک دے گا۔ سیاسی تحریکوں کو چلانے کے لیے نرے اشتعال اور جوش اور غضب سے کام نہیں چل سکتا اس کے لیے ٹھنڈے دل و دماغ کی

ضرورت ہے، اس کے لیے سنجیدہ غور وفکر اور متوازن قوتِ فیصلہ کی ضرورت ہے، اور یہ چیز مشرقی صاحب کو نصیب نہیں ہے۔ مذہبی عقائد سے قطع نظر بھی کرلیا جائے تب بھی ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ سیاسی حیثیت ہی سے مسلمانوں کو کسی صحیح راستہ پر چلا کر بہ خیریت منزل کامیابی تک پہنچا دیں گے۔ وہ زیادہ سے زیادہ بس یہی کر سکتے ہیں کہ یونی فارم، قواعد پریڈ نعروں اور جھنڈوں کی نمائش سے سطح بین عوام کو اپنی طرف کھینچیں اور بناوٹی الفاظ جھوٹے پروپیگنڈے اور اشتعال انگیز مضامین کی شراب پلا کر انھیں اس فریب میں مبتلا کردیں کہ وہ ایک طاقت بن گئے ہیں۔ یہ فریب کچھ دن خوب چلے گا اور بالآخر ایک عظیم صدمہ کے ساتھ اس بری طرح ٹوٹے گا کہ مدتوں کے لیے مسلمانوں پر یاس وناامیدی اور بے اعتباری چھا جائے گی اور وہ مدتوں اس قابل نہ ہوسکیں گے کہ کسی تحریک اور کسی رہنما پر اعتبار کرسکیں۔

احقر

ابوالاعلیٰ

(۲۸ رشعبان ۱۳۵۸ھ)

(۶)

لاہور

دسمبر ۱۹۴۷ء

مکرمی ومحترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

حیدرآباد[۱] کے مسلمانوں سے دینی اخوّت کی بنا پر میرا جو تعلق ہے اگرچہ اس کا بھی یہ تقاضا ہے کہ میں اس نازک موقعے پر ان کو ایک خیر خواہانہ مشورہ دوں لیکن اس کے علاوہ حیدرآباد سے اس بنا پر میرا ایک ذاتی تعلق ہے کہ اورنگ آباد میرا پیدائشی وطن ہے اور میری زندگی کا نصف سے زائد

---

(۱) مولانا نے یہ خط سقوطِ حیدرآباد (ستمبر ۱۹۴۸ء) سے کم وبیش ۹ مہینے قبل حیدرآباد کے مسلم رہنماؤں کی خدمت میں لکھا تھا، جس کا مقصد ان دشوار حالات سے وہاں کے مسلمانوں کو عہدہ برآ ہونے میں مدد دینا تھا۔ افسوس کہ اس وقت اسے کوئی اہمیت نہ دی گئی لیکن بعد کے واقعات نے اس مشورے کی افادیت کو پوری طرح ثابت کردیا اور مولانا کی بصیرت پر بھی صداقت کی گواہی پیش کردی۔ جوش بلا ہوش کی سیاست جو مسلمانوں کو مدّت سے برباد کرتی چلی آرہی ہے حیدرآباد کا سانحہ اس کا ایک دردناک نمونہ ہے۔ مولانا مودودی واحد آدمی تھے جنھوں نے پاکستان میں بیٹھ کر حیدرآباد کے مسلمانوں کو سخن کی حد تک بہترین امداد پہنچائی لیکن ایسے پُر آشوب حالات میں کم ہی لوگ کسی ہم دردی کی نصیحت سے استفادہ کیا کرتے ہیں۔ (ا۔گ) (فراہم کردہ مولانا ابومنظور شیخ احمد بنگلور)

حصہ حیدر آباد ہی میں بسر ہوا ہے، اس دوہرے قلبی تعلق کی وجہ سے میں اس تمام تشویش اور فکر مندی میں بعدِ مقام کے باوجود، حیدر آباد کے مسلمانوں کے ساتھ برابر کا شریک ہوں جس میں وہ موجودہ سیاسی صورتِ حال کی وجہ سے اپنے آپ کو مبتلا پا رہے ہیں۔ یہی چیز مجھ کو مجبور کرتی ہے کہ میں بلا طلب اپنا مشورہ ان حضرات کی خدمت میں پیش کروں، جو اس وقت مسلمانانِ حیدر آباد کی رہ نمائی کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میری ان گزارشات پر ٹھنڈے دِل سے غور کریں گے اور سرسری طور پر انھیں نظر انداز نہ کردیں گے تاہم اگر وہ ایسا کریں تو میں اپنی اخلاقی ذمہ داری سے بری الذمہ ہو جاؤں گا اور میرا ضمیر مطمئن رہے گا کہ اپنے بھائیوں کا، جو حق مجھ پر عائد ہوتا تھا اسے ادا کرنے کی میں نے کوشش کر دی۔

ہندستان کے مسلمانوں نے ابھی ابھی اپنا، جو انجام دیکھا ہے اور دیکھ رہے ہیں وہ دراصل خمیازہ ہے ان کوتاہیوں کا، جو پچھلی صدیوں میں ہمارے حکمران، ہمارے امرا، ہمارے مذہبی پیشواؤں کا ایک بڑا گروہ اور باستشناء چند ہمارے عام اہل ملت اپنے اس فرض کی ادائے گی میں برتتے رہے ہیں، جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتا ہے۔ اگر وہ اسلام کی صحیح نمائندگی کرتے۔ اگر وہ اپنے اخلاق اور معاملات اور اپنی سیرتوں میں اسلام کا صحیح نمونہ پیش کرتے اور وہ اپنی سیاست اور حکمرانی میں عدل وانصاف پر قائم رہتے اور اپنی طاقتوں کو اسلام کی سچائی پھیلانے میں صرف کرتے تو آج دہلی اور مغربی یوپی اور مشرقی پنجاب سے مسلمان اس طرح بیک بنی دو گوش نہ نکال دیئے جاتے جیسے اس وقت نکالے گئے ہیں۔ اور یوپی، بہار اور وسطِ ہند میں ان کے سر پر اس طرح تباہی منڈلا نہ رہی ہوتی جیسی آج منڈلا رہی ہے۔ یہ وہ علاقے ہیں جہاں سات آٹھ سو سال تک مسلمانوں کا اقتدار رہا ہے۔ جہاں مسلمانوں کی بڑی بڑی عظیم الشان جاگیریں حیدر آباد کی پائے گاہوں سے کئی گنی زیادہ بڑی جاگیریں قائم رہی ہیں اور جہاں مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے علوم وفنون کے عظیم الشان مرکز موجود رہے ہیں، لیکن عیش دنیا میں انہماک، فوجی طاقت اور سیاسی اقتدار پر انحصار، اسلام کی دعوت پھیلانے سے تغافل اور انفرادی سیرتوں اور اجتماعی طرزِ عمل میں اسلام کے اخلاقی اصولوں سے انحراف کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان علاقوں کی عام آبادی غیر مسلم رہی، مسلمان ان کے درمیان آٹے میں نمک کے برابر رہیں اور دلوں کو مسخر کرنے کی بہ جائے معاشی اور سیاسی دباؤ سے گردنیں اپنے سامنے جھکوانے پر اکتفا

کرتے رہے، پھر جب سیاسی اقتدار، ان سے چھنا اور ایک غیر ملکی قوم ان پر مسلّط ہوئی تب بھی انھوں نے اور ان کے رہ نماؤں نے ان اسباب کو سمجھنے کی کوشش نہ کی، جن کی بنا پر وہ حاکم سے محکوم بن کر رہ گئے تھے۔ بلکہ انھوں نے غیر ملکی حکمرانوں کے بل پر چلنے کی کوشش کی اور اپنے سیاسی مطالبے اور دعوے کو ہم سایہ اکثریت کے مقابلہ میں اس تیسری طاقت سے، جس کے اقتدار کو بہ ہر حال عارضی ہی ہونا تھا، منواتے رہے۔ اس تمام مدت میں زندگی کی، جو مہلت مسلمانوں کو ملی تھی اس میں اپنے اخلاقی اصلاح کرنے اور اپنے بزرگوں کی غلطیوں کی تلافی کرنے کے بہ جائے مسلمان محض معاشی اور سیاسی فائدوں کے لیے غیر مسلم اکثریت کے ساتھ کش مکش کر کے بہ ظاہر یہ سمجھتے رہے کہ وہ اپنے جینے کا سامان کر رہے ہیں۔ لیکن دراصل اپنی قبر کھود رہے تھے اور آخر کار آج ہماری بدقسمت آنکھوں نے دیکھ لیا کہ بہت سے تو اس قبر میں دفن ہو گئے اور بہت سے زندہ در گور ہیں۔

یہ جو ہندستان کے مسلمانوں کو پیش آیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ حیدر آباد کے مسلمان اس سے سبق لیں اور جو تھوڑی سی مہلت ان کو سنبھلنے کے لیے ملی ہے اس سے فائدہ اٹھائیں۔ حیدر آباد کے مسلمانوں کی پوزیشن ہندستان کے مسلمانوں سے بہت زیادہ مختلف نہیں ہے۔ یہاں بھی صدیوں کی حکومت کے باوجود، باشندوں کی عظیم اکثریت غیر مسلم ہے اور مسلمان پندرہ فی صد سے زیادہ نہیں ہیں، یہاں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی اور معاشی کش مکش سے وہی قومی منافرت پیدا ہو چکی ہے، جو ہندستان میں پیدا ہو چکی تھی اور اسی انتہائی تلخی کی حد تک پہنچتی جا رہی ہے، جو دہلی اور پنجاب میں پائی جاتی ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ ہے کہ یہاں مسلمان ریاست قائم ہے اور ریاست کے نظم و نسق پر مسلمان چھائے ہوئے ہیں لیکن یہ فرق، جو اب تک حیدر آباد کے مسلمانوں کے پیچھے رہنے کا موجب بنا ہوا ہے کچھ ایسا زیادہ پائدار اور مستحکم فرق نہیں کہ حیدر آباد کے مسلمان اس کے بھروسے پر زیادہ مدت تک جی سکتے ہیں۔ انڈین یونین کی ہندو اکثریت، جو سابق انگریزی طاقت کی وارث ہوئی ہے، حیدر آباد کے چاروں طرف محیط ہے۔ حیدر آباد اس کے محاصرہ میں اس طرح گھرا ہوا ہے کہ کسی طرف سے وہ مدد نہیں پا سکتا۔ ریاست کی ۸۵ فی صدی آبادی غیر مسلم ہے اور وہ مسلمان ریاست کے اقتدار کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ موجودہ جمہوریت کے دور میں ۱۵ ر فی صدی مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ حکمرانی ان کے ہاتھ

میں رہے یا وہ کم از کم آدھے اقتدار کے شریک ہوں، کسی طرح نہیں چل سکتا۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ غیر مسلموں کے کسی معتد بہ عنصر کو مسلمان اپنے ساتھ ملا کر اکثریت حاصل کر سکیں گے یا کم از کم پچاس فی صدی رائے حاصل کر سکیں گے۔ اس صورتِ حال میں اگر مسلمان اپنے اقتدار کو اور ان تمام امتیازی حقوق اور اختیارات اور فوائد اور منافع کو برقرار رکھنا چاہیں، جو اب تک حاصل رہے ہیں تو اس کے لیے انھیں لڑنا پڑے گا۔ لڑائی محض ریاست کی غیر مسلم اکثریت سے نہیں ہوگی بلکہ آخر کار انڈین یونین کی فوجی طاقت سے ہوگی جس کی پشت پر پورے ہندستان کی ہندو قوم کی متفقہ طاقت بھی ہوگی۔ مجھے امید نہیں کہ اس لڑائی میں ریاست کی طاقت حیدر آبادی مسلمانوں کا ساتھ دے گی۔ رئیس کی فطرت یہ ہوتی ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے اور اپنے خانوادہ کے مفاد کو دیکھتا ہے، اگر وہ محسوس کرے گا کہ مسلمانوں کا ساتھ دینے سے اس کو بھی نواب جونا گڑھ کا سا انجام دیکھنا پڑے گا تو بعید نہیں کہ وہ انڈین یونین کے ساتھ اپنا معاملہ طے کر لے اور اپنی قوم کو اس کی قسمت پر چھوڑ دے۔ حیدر آباد کی فوج، پولیس اور نظم ونسق پر بھی آپ یہ بھروسہ نہیں کر سکتے کہ وہ اس لڑائی میں کچھ بہت زیادہ آپ کے کام آسکیں گے اس لیے کہ ان میں سے کوئی بھی خالص مسلمان عناصر پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ سب میں اچھا خاصا غیر مسلم عنصر موجود ہے، لہٰذا اگر خدا نخواستہ لڑائی پیش آگئی تو شاید حیدر آباد کے مسلمانوں کا انجام اس سے بھی زیادہ دردناک ہوگا، جو مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کا ہوا ہے۔ حیدر آباد کے مسلمانوں پر اگر ایک طرف خود گھر کی اکثریت دوسری طرف گرد ونواح کے علاقوں کے مسلّح جتھے اور تیسری طرف انڈین یونین کی فوجیں ٹوٹ پڑیں اور خود ریاست کے نظم ونسق نے ان کا ساتھ نہ دیا، تو ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی، نہ کہیں سے وہ مدد پا سکیں گے اور نہ وہ کہیں جا سکیں گے۔ اسی بنا پر میرا یہ مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ لوگ اس فرق کو جو سرِ دست آپ کی حالت اور ہندستان کے مسلمانوں کی حالت میں پایا جاتا ہے کوئی بہت بڑا پائدار اور قابل اعتماد فرق نہ سمجھیں اور ان چند مہینوں کی مہلت کو، جو خوش قسمتی سے آپ کو مل گئی ہے ضائع کرنے کے بہ جائے ایسا لائحہ عمل بنانے میں صرف کریں جس سے مسلمانانِ حیدر آباد کی نہ صرف یہ کہ جان ومال وآبرو بچ جائے بلکہ ان کو ایک بہتر اور زیادہ شان دار مستقبل تک پہنچنے کا راستہ مل جائے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اصل چیز، جو مسلمانوں کے لیے ذریعۂ تحفظ ہی نہیں، بلکہ ذریعۂ ترقی اور وسیلۂ سربلندی ہو سکتی ہے، وہ تو یہی

ہے کہ وہ اسلام پر قائم ہوں، اس کے صحیح نمائندے بنیں، اس کی دعوت اپنے قول اور عمل سے دنیا کے سامنے پیش کریں اور بہ حیثیت ایک قوم کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بن کر کھڑے ہوں۔ یہی چیز ان کے لیے زندگی اور عزت کی زندگی کی ضامن ہو سکتی ہے۔ لیکن ان خطوط پر اپنی قوم کو تیار کرنے کے لیے بہ ہر حال کچھ وقت درکار ہے اور یہاں حال یہ ہے کہ طوفان سر پر آچکا ہے اس لیے یہ ناگزیر ہے کہ ہم کوئی ایسی تدبیر سوچیں جس سے یہ طوفان ٹل سکے اور ہمیں اتنا وقت مل جائے کہ ہم مسلمانوں کی عام اخلاقی اصلاح کر سکیں اور دعوتِ اسلامی کے کام کو منظّم طریقے سے آگے چلا سکیں۔ میں اس مسئلے پر بہت غور کرتا رہا ہوں کہ ایسی تدبیر کیا ہو سکتی ہے اور آخر کار جن نتائج پر پہنچا ہوں ان کو ذیل میں نمبر وار بیان کرتا ہوں۔

۱- ہندستان اور حیدر آباد کی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے یہ کسی طرح ممکن نظر نہیں آتا کہ آپ انڈین یونین میں حیدر آباد کے داخلے کو اور حیدر آباد میں ذمہ دار حکومت کے قیام کو روک سکیں گے ـــــ یہ چیز بہ ہر حال ہو کر رہے گی آپ کے روکے نہ رُک سکے گی۔ اور روکنے کی کوشش کا حاصل اس کے سوائے کچھ نہ ہوگا کہ ریاست اور مسلمان دونوں تباہ ہو جائیں یا صرف مسلمان تباہ ہوں اور ریاست مسلمانوں کی بھینٹ چڑھا کر اپنے آپ کو بچا لے۔ اس صورتِ حال میں عقل مندی یہ ہے کہ مزاحمت کرنے کے بہ جائے، آپ انھیں بنیادوں پر مفاہمت کرنے کی کوشش کریں جن سے انڈین یونین کی شراکت اور ذمہ دار حکومت کا قیام نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے لیے کم سے کم مضر ہو سکے بلکہ اس کے برعکس مسلمانوں کو ایسے مواقع حاصل ہو جائیں جن سے مذکورہ بالا مقصد کے لیے اپنی ملّی تعمیر زیادہ اچھی طرح کر سکیں۔

۲- مزاحمت اور کش مکش کرنے کے بہ جائے اگر اس وقت حیدر آبادی مسلمانوں کی قومی تنظیم یعنی انجمن اتحاد المسلمین یہ بات پیش کرے کہ وہ چند شرائط کے ساتھ انڈین یونین کے داخلہ اور مکمل ذمہ دار حکومت کے قیام پر بہ خوشی راضی ہے، تو مجھے امید ہے کہ اس مرحلے پر اسٹیٹ کانگریس اور انڈین یونین دونوں ہماری شرائط پر راضی ہو سکیں گی۔

۳- میرے نزدیک، جو شرائط اس غرض کے لیے مفید ہو سکتی ہیں اور جن پر انڈین یونین اور اسٹیٹ کانگریس کو بہ آسانی راضی کیا جا سکتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(الف) ریاست کے آئندہ دستور میں مسلمانوں کو یہ حق دیا جائے کہ ان کے تہذیبی

اور مذہبی معاملات کے لیے ان کا اپنا الگ ایک Organisation ہو جسے مسلمانوں پر زکوٰۃ عائد کرنے اور اس کو وصول اور خرچ کرنے کے لیے اور مذہبی اوقاف کا انتظام کرنے اور ان کی آمدنی کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں پر صرف کرنے کے لیے، نیز مسلمانوں کا پرسنل لا، ان کے معاملات نکاح وطلاق و وراثت وغیرہ پر جاری کرانے کے لیے ضروری قانون اور عدالتی اختیارات حاصل ہوں (ایسے ہی اختیارات اگر دوسرے غیر مسلم گروہ بھی حاصل کرنا چاہیں تو مسلمانوں کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا)۔

(ب) مسلمانوں کے اس حق کو بھی دستور میں محفوظ کر دیا جائے کہ وہ اپنے خرچ پر ایک مذہبی درس گاہ قائم کرسکیں اور اسی طرح سرکاری تعلیم گاہوں میں مسلمان بچوں کے لیے اپنے خرچ پر لازمی مذہبی تعلیم کا انتظام کرسکیں (یعنی مسلمان بچوں کے لیے سرکاری درس گاہوں میں مذہبی تعلیم (Compulsary) ہوگی اور اس کا خرچ مسلمانوں کا مندرجہ بالا (Organisation) برداشت کرے گا)۔

(ج) ریاست کے لیے، جو اسمبلی یا پارلیمنٹ بنے اس میں طریق انتخاب تو ضرور ہو لیکن لازماً کوئی ایسا طریق انتخاب اختیار کیا جائے جس سے آبادی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا گروہ بھی نمائندگی سے محروم نہ رہ سکے، مثلاً متناسب نمائندگی (Proportional Representation) کا وہ طریقہ جس میں ملک کو یک نشستی حلقہ ہائے انتخاب میں تقسیم نہیں کیا جاتا، بلکہ پورا ملک ایک حلقۂ انتخاب ہوتا ہے اور رائیں منفرد لوگوں کے حق میں نہیں، بلکہ پارٹیوں کے حق میں ڈالی جاتی ہیں۔

(د) دستور کی ترمیم پر ایسی پابندی عائد کی جائے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے وہ حقوق، جو انھیں پہلے دستور میں دیئے گئے ہوں بعد کی کسی ترمیم میں بہ آسانی سلب نہ کیے جاسکیں۔ مثلاً دستور کی ترمیم کے لیے استصواب رائے عام Refrendum ضروری قرار دیا جائے اور کم از کم ۸۰ فی صدی ووٹوں کے بغیر کوئی ترمیم پاس نہ ہو سکے۔

(ھ) اس بات کی ضمانت دی جائے کہ سرکاری محکموں میں اور ان کے کسی شعبے میں ان کے خلاف کوئی امتیازی پابندی عائد نہ کی جائے گی۔

(و) از روئے دستور تبدیل مذہب پر کوئی پابندی عائد نہ ہو سکے گی۔

ان شرائط کے ساتھ مسلمانوں کو یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ریاست میں مکمل ذمہ دارانہ

حکومت قائم ہو اور نظام صرف ایک دستوری فرماں روا کی حیثیت سے رہیں۔ نظام کے لیے دستوری فرماں روا سے بڑھ کر کسی پوزیشن کا مطالبہ کرنے پر مسلمانوں کو اصرار نہ کرنا چاہیے ورنہ وہ سمجھ لیں کہ یہ چیز ایک خاندان کے مفاد پر ایک پوری قوم کے مفاد کو قربان کرنے کے ہم معنی ہوگی، جس کا خمیازہ آگے چل کر مسلمانوں کو بہت برا دیکھنا ہوگا۔

(۴) مذکورہ بالا شرائط کے مطابق مسلمانوں کو اپنا، جو قومی Organisation قائم کرنے کا حق حاصل ہو، اس سے انھیں پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ زکوٰۃ اور اوقاف کی آمدنی اتنی کافی ہوگی کہ اس سے ایک عظیم الشان بیت المال قائم ہو سکے گا۔ مسلمانوں کی تعلیم، اخلاقی اصلاح، معاشی خوش حالی اور صنعتی ترقی کے لیے بہت سے کام کیے جاسکیں گے۔ ان کو سودی قرض سے نجات دلائی جاسکے گی اور ایسے ادارے قائم کیے جاسکیں گے، جو دعوتِ دین کے لیے مسلمان نوجوانوں کو تیار کریں۔ ملکی زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم اور تفاسیر شائع کریں اور اسلامی لٹریچر کی وسیع پیمانے پر اشاعت کریں۔ ان ذرائع سے یہ ممکن ہوگا کہ ہم اپنی سوسائٹی کو زیادہ سے زیادہ صالح بنا کر غیر مسلم عناصر کو اپنے اندر جذب کرسکیں۔

(۵) ان تحفظات کے ساتھ، جو ذمہ دار حکومت قائم ہو اس میں مسلمان اپنا اثر اس طرح بڑھا سکتے ہیں کہ ان کی سیاسی پارٹی یعنی انجمن اتحاد المسلمین کوئی ایسا پروگرام پیش کرے جسے لے کر صرف مسلمانوں ہی کے سامنے نہ جائے بلکہ غیر مسلم ووٹروں کے سامنے بھی جا سکے اور ان کی زیادہ سے زیادہ رائیں حاصل کر سکے۔ مثال کے طور پر اس کے پروگرام میں Depressed Classes کے لیے کوئی ایسی کشش ہونی چاہیے کہ ان کے ووٹ مسلم پارٹی کو حاصل ہوں آج اگر آپ سیاسی جوڑ توڑ کر کے پست اقوام کو ہندوؤں سے توڑنے کی کوشش کریں گے، تو آپ کچھ فائدہ نہ حاصل کرسکیں گے۔ اور یہ چیز ہندوؤں میں آپ کے خلاف اور زیادہ ضد پیدا کر دے گی۔ لیکن کل نئے دستور کے مطابق اگر انتخابات میں آپ ایسا پروگرام لائے، جو پست اقوام کی اکثریت کو آپ کے ساتھ ہم آواز بنا دے، تو آپ اسمبلی میں اکثریت حاصل کرسکیں گے اور رہ نمائی آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔ بہ ہر حال اس نقشے پر کام یابی حاصل کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ مسلمان نئے حالات کے مطابق اپنے اندر سے ایک بہتر اور زیادہ بیدار مغز سیاسی لیڈرشپ پیدا کریں، جو تنگ نظری کی ساتھ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے مفادات کی

حفاظت پر مصر نہ ہو بلکہ بڑے پیمانے پر عدل وانصاف کے قیام سے اور عامۃ الناس کی حقیقی ترقی اور فلاح کے کاموں سے مسلمانوں کے اصلی مفاد کی خدمت کر سکے۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ

بنام: صدر انجمن اتحاد المسلمین حیدر آباد دکن

(۷)

۳/ اکتوبر ۴۹ء

بہ خدمت جناب سکریٹری صاحب حکومت مغربی پنجاب بہ توسط سپرنٹنڈنٹ صاحب نیو سنٹرل جیل ملتان

جنابِ محترم!

۳۰/ ستمبر ۱۹۴۹ء کے اخبارات میں وہ پریس نوٹ میری نگاہ سے گزرا، جو میری اور میرے رفقاء کی میعادِ نظر بندی کی تیسری ششماہی تک توسیع کرنے کے حق میں آپ کی حکومت نے شائع فرمایا ہے۔ اگر یہ توسیع بھی اسی طرح خاموشی کے ساتھ ہوگئی ہوتی تو جس طرح ہماری نظر بندی کی ابتدا اور اس کی پہلی توسیع ہوئی تھی تو ہم اسی طرح صبر اور خاموشی کے ساتھ برداشت کر لیتے، جس طرح پہلے کرتے رہے ہیں۔ لیکن حکومت کا یہ بیان ہمارے لیے تکلیف پر توہین کا اضافہ ہے اور اس میں ایک صریح اور ناروا زیادتی کو حق بہ جانب ثابت کرنے کی ایسی کوشش کی گئی ہے، جسے چیلنج کیے بغیر گزر جانے نہیں دیا جاسکتا۔ لہٰذا اپنی طرف سے اور اپنے رفقاء کی طرف سے اس پر کچھ گزارشات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ بہ راہ کرم انھیں حکومت مغربی پاکستان تک پہنچادیں۔

حکومت کا پریس نوٹ تین مضامین پر مشتمل ہے:

(۱) جس میں بہ جائے خود پبلک سیفٹی ایکٹ کو حق بہ جانب ٹھہرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۲) جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مغربی پنجاب کی حکومت اسے بڑی احتیاط کے ساتھ بہت ہی ناگزیر صورت میں استعمال کر رہی ہے۔

(۳) جس میں مغربی پنجاب کے چھ نظر بندوں پر نام بنام متعین الزامات عائد کرنے

کے بہ جائے مجمل طور پر چند بہت ہی خطرناک جرائم کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے، جس سے لامحالہ عوام الناس کے دل میں یہی وسوسہ پیدا ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں نے، ان سب یا ان میں سے بعض کا ارتکاب کیا ہوگا۔

۱۔ مضمون اول کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ پبلک سیفٹی ایکٹ کے بارے میں یہ گنجائش تو پہلے ہی موجود تھی کہ ایک شخص ہائی کورٹ میں ہیبس کارپس کی درخواست پیش کر کے حکومت کے ''حسنِ نیت'' (Banfides) کو چیلنج کرے۔ اور اب اس میں یہ اضافہ کر دیا گیا ہے کہ حکومت ایک کافی تجربہ کار سیشن جج کے سامنے وہ مواد رکھ دے گی، جس کی بنا پر اس نے کسی شخص کو نظر بند کیا ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس قانون کی رُو سے ہائی کورٹ فی نفسہٖ ان وجوہ کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے جن پر حکومت نے کسی شخص کو نظر بند کیا ہو؟ اگر نہیں تو صرف حکومت کے ''حسنِ نیت'' پر یا چند ادھر ادھر کے قانونی اسقام پر (جن کا وجوہِ نظر بندی کی معقولیت یا عدم معقولیت سے بہ ہر حال کوئی تعلق نہیں) بحث کر لینے سے انصاف کا مقصد کس طرح پورا ہوسکتا ہے اور وجوہِ نظر بندی کو زیر بحث لائے بغیر خود حسنِ نیت کے بارے میں بھی کوئی رائے کس طرح قائم کی جاسکتی ہے۔ پھر اب جو سیشن جج کے سامنے معاملہ رکھنے کا قاعدہ نئے سیفٹی ایکٹ میں بڑھایا گیا ہے اس کے بارے میں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت جس سیشن جج کے سامنے اپنی بنائے کاروائی کا مواد رکھے گی، وہ اس مواد کے صحیح یا غلط ہونے کی تحقیق بھی کر سکے گا؟ اور کیا وہ خود نظر بند کو بھی صفائی پیش کرنے کا موقع دے گا؟ اگر نہیں تو پھر عقل اور انصاف کی رو سے اس کے دیے ہوئے اس یک طرفہ مشورے کی قیمت ہی کیا ہے۔ میں تو ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ حکومت بہ راہ کرم اس سیشن جج کا نام ضرور شائع فرمائے، جس نے ایسی شرائط کے تحت نظر بندوں کے معاملے میں مشورہ دینا قبول کیا ہو۔ آخر پبلک کو معلوم تو ہونا چاہیے کہ اس ملک کے نظامِ عدالت میں وہ کون سا منصف مزاج افسر ہے، جو برسوں کی قانونی تعلیم و تربیت اور مدتوں منصبِ انصاف پر سرفراز ہونے کے بعد بھی اسے جائز سمجھتا ہے کہ حکومت کے پیش کردہ یک طرفہ مواد کو دیکھ کر ملک کی کسی شہری کی آزادی سلب کیے جانے کا مشورہ دے دے۔

اس سلسلے میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ حکومت اس قانون کے تحت ایک شخص کی نظر بندی کا فیصلہ صرف اس صورت میں کرتی ہے جب کہ وہ پوری طرح اس بات پر مطمئن ہو جاتی ہے کہ

ریاست کے تحفظ کے لیے ایسا کرنا بالکل ناگزیر ہے اور یہ کہ معمولی قانون کے تحت اس شخص پر مقدمہ چلانا خود اس تحفظ کے مقصد کو ضائع کر دے گا یا نقصان پہنچا دے گا۔ میں ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ کسی شخص کو شرائط انصاف کے مطابق مجرم ثابت کیے بغیر آزادی سے محروم کر دینا ایک ایسا فعل ہے، جس کو اس طرح کی سخن سازیوں سے حق بہ جانب ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۳۵ء کے کانسٹی ٹیوشن کی رُو سے سیفٹی ایکٹ کی دستوری پوزیشن خواہ کچھ ہو اور اس کی ضرورت خواہ کتنے ہی خوش نما الفاظ میں بیان کی جائے۔ لیکن یہ ایکٹ ایک طرف انصاف کے ان اصولوں کے قطعاً خلاف ہے، جو اسلام نے ہم کو سکھائے ہیں (جن پر ریاست پاکستان کی تعمیر کرنے کا فیصلہ ہماری دستور ساز اسمبلی کر چکی ہے) اور دوسری طرف اس تصوّر انصاف کے بھی خلاف ہے، جس سے عام انسانی عقل قدیم ترین زمانے سے آج تک آشنا رہی ہے۔ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ اسلام کا دستوری قانون کسی حکومت کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ مقدمہ چلائے بغیر کسی شخص کی جان، مال یا آزادی، محض ایک انتظامی فیصلے کی بنا پر سلب کرے۔

حضرت عمرؓ نے ایک مقدمے کے سلسلے میں اس دستوری نکتہ کو بایں الفاظ واضح کیا تھا:

لا یوسہ رجل فی الاسلام بغیر العدل. (موطا کتاب احکام خلافہ)

''اسلام میں کسی شخص کو عدل کے بغیر قید نہیں کیا جا سکتا۔''

ایک اور مقدمے میں، جس میں مصر کے گورنر عمرو بن عاصؓ نے ایک مصری کو اس کا کوئی جرم ثابت کیے بغیر قید کر رکھا تھا۔ حضرت عمرؓ نے قیدی کو بری کرتے ہوئے اپنے گورنر کو خطاب کر کے کہا:

یا عمرو امتٰی عبدتم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احراراً.

(الفاروق عمر تالیف محمد حسین ہیکل جلد دوم ص:۲۱۸،۱۹)

''اے عمرو! یہ تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا۔ حالاں کہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا؟''

خود نبی ﷺ کے زمانے میں ایک سیاسی شبہ کی بنا پر مدینہ کی پولیس نے چند آدمیوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ اس پر ان کے محلّے کے ایک شخص نے عین خطبہ جمعہ میں آں حضورؐ کو ٹوک کر پوچھا کہ میرے ہمسائے کس قصور میں پکڑے گئے ہیں؟

اس کے جواب میں آں حضورؐ نے خطبہ ختم کرنے کے بعد فوراً ہی ان آدمیوں کی رہائی کا حکم دے دیا۔ (ابوداؤد کتاب القضا)

اپنے اس فعل سے آں حضرت ﷺ نے اس اصول کو برحق قرار دیا کہ محض الزام پر کسی شخص کو قید کر دینا غلط ہے۔ یا تو اس پر الزام ثابت کر کے باقاعدہ سزا دو، اگر ثابت نہیں کر سکتے تو چھوڑ دو۔

یہ تو ہے انصاف کے اسلامی اصولوں کا معاملہ۔ رہے دنیا کے مانے ہوئے دستوری اصول اور عدل و انصاف کے قانونی تصوّرات تو میں سمجھتا ہوں کہ میری طرح خود مغربی پنجاب کی حکومت بھی یہ تسلیم کرے گی کہ اس مسئلہ میں قائداعظم مرحوم سے بڑھ کر قابلِ اعتماد سند دوسری نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے ۲۸ رجنوری ۱۹۳۵ء کو قدیم ہندستانی مجلس قانون ساز میں سیفٹی ایکٹ جیسے ایک مسوّدہ قانون پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"میری آزادی اگر جائز طور پر چھینی جاسکتی ہے تو صرف اس صورت میں جب کہ مجھ پر ایک مناسب عدالت میں ٹھیک ٹھیک قانونی طریقے پر مقدمہ چلایا جائے اور اس کے سامنے مجھ کو اپنی صفائی پیش کرنے کے تمام حقوق حاصل ہوں۔ کیا تم محض اپنے محکمۂ جاسوسی کی دی ہوئی خبروں کے بل پر ایک آدمی کو یوں ہی قید کر دو گے؟ اس کا جواب ہمیں ہوم ممبر کی طرف سے کیا ملتا ہے؟ وہ کہتے ہیں۔ "میرے پاس قانونی شہادت موجود نہیں ہے۔ اس لیے میں اسے عدالت کے سامنے پیش نہیں کرتا۔ جب ایسی شہادت مل جائے گی تو یہ بھی کر دوں گا۔" اس طرح تو تم ترتیب اُلٹی کیے دے رہے ہو۔ ایک شخص آزاد رہنے کا حق رکھتا ہے جب تک کہ تم اس کے خلاف وہ شہادت نہ پالو جسے عدالت میں پیش کر سکو۔ مگر ہوم ممبر صاحب برابر کہتے ہیں۔ "میں اسے بند رکھنے کا مجاز ہوں۔ کیوں کہ میرا پولیس کمشنر کہتا ہے کہ وہ اس شخص کے خلاف کچھ شہادت رکھتا ہے یا محض شبہ رکھتا ہے۔" جناب میں کہتا ہوں کہ اول تو یہ بات سخت افسوس ناک ہے اور پھر یہ ان بنیادی

اصولوں کے بھی خلاف ہے، جنھیں ہر اس مہذب حکومت کو ملحوظ رکھنا چاہیے،
جو کسی باقاعدہ دستوری نظام پر قائم ہو۔"

ان زبردست اسناد کے مقابلے میں مغربی پنجاب کی حکومت کے پاس وہ کون سے وزنی دلائل ہیں، جن کی بنا پر وہ توقع کر سکتی ہے کہ پاکستان کے باشندے اسلام، عقل اور قانونی مسلمات کے خلاف اس نئے تصوّرِ انصاف کو تسلیم کر لیں گے کہ کسی حال میں انصاف کی شرطیں پوری کیے بغیر بھی ایک شہری کی آزادی سلب کر لینا جائز ہو سکتا ہے۔

(۲) حکومت کا پریس نوٹ مغربی پنجاب کی پبلک کو یہ اطمینان دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ حکومت بڑی ہی احتیاط کے ساتھ اس قانون کو استعمال کر رہی ہے۔ اس کے ثبوت میں مشرقی پنجاب اور مدراس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہاں کی حکومتوں نے ایسے ہی قوانین کے تحت علی الترتیب ۱۷۵ اور ۶۰۰ آدمی پکڑ رکھے ہیں اور یہاں صرف ۶ آدمی مقدمہ چلائے بغیر قید کیے گئے ہیں۔ اس فرق کو آپ کی حکومت اس بات کا ثبوت قرار دیتی ہے کہ سیفٹی ایکٹ اس صوبہ میں جائز طور پر بھی استعمال ہو رہا ہے اور اس کے استعمال میں بے احتیاطی بھی نہیں برتی جا رہی ہے ممکن ہے کہ اس عجیب استدلال پر حکومت خود مطمئن ہو۔ لیکن مجھے معاف کیا جائے اگر میں صاف گوئی سے کام لے کر کہوں کہ یہ ایسا ہی استدلال ہے جیسے ایک شخص نے اپنے چند گناہوں کو اس دلیل سے جائز ثابت کرے کہ دوسرے شخص نے ایسے ایسے سینکڑوں گناہ کر ڈالے ہیں۔ جب کہ مذہب، اخلاق، عقلِ عام اور دنیا بھر کے مسلّم تصوّراتِ انصاف کسی چیز کی رُو سے بھی قید بلا مقدمہ کو جائز ثابت نہیں کیا جا سکتا تو پھر اس سے کیا فرق ہو جاتا ہے کہ ایک حکومت نے اپنے ۶ شہریوں کی آزادی ناجائز طور پر سلب کی ہے اور دوسری نے سینکڑوں پر یہی ظلم کر ڈالا ہے۔

(۳) جزو سوم اس پریس نوٹ کا سب سے زیادہ افسوس ناک اور دل آزار حصہ ہے اور فی الحقیقت وہی سب سے بڑھ کر میری ان گزارشات کا محرک ہے۔ پہلے تو حکومت اپنے نوٹ کی ابتدا میں فرماتی ہے کہ اس کے قبضہ میں کچھ "اطلاعات" ہیں جن پر خوب غور کرنے کے بعد اس نے میری اور میرے رفقاء کی نظر بندی میں تیسری ششماہی کے لیے توسیع کی ہے۔ پھر وہ مجموعی طور پر مغربی پنجاب کے نظر بندوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بیان کرتی ہے کہ اس کو کسی فرد یا پارٹی

کے سیاسی وتمدّنی نظریات اور پروگرام سے کوئی دشمنی نہیں ہے مگر وہ ایسی صورتوں میں سیفٹی ایکٹ استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

(ا) جب کہ پاکستان کے تحفظ اور استحکام کی دانستہ بیخ کنی کی جائے۔

(ب) جب کہ تحفظ و استحکام کے اس اہم ترین بنیادی مقصد کے ساتھ اہل ملک کی وفاداری کو متزلزل کرنے کی کوشش کی جائے۔

(ج) جب کہ بیرونی اغراض کے آلۂ کار لوگ جاسوسی کریں یا داخلی خلفشار پیدا کریں۔

(د) جب کہ کچھ لوگ پاکستان کے ساتھ وفاداری اور خود اپنے اخلاقی یا اجتماعی تصورات کے ساتھ وفاداری کو ایک دوسرے کی ضد ٹھہرا کر ان کے درمیان ایک جھوٹ موٹ کا مگر خطرناک تصادم پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

اس بیان کو، جو شخص بھی پڑھے گا وہ یہ سمجھے بغیر نہ رہے گا کہ حکومت کے قبضہ میں، جو ''اطلاعات'' ہیں وہ ضرور ان چاروں جرائم یا ان میں سے بعض ہی کے ارتکاب سے متعلق ہوں گی۔ اور ہم چھ نظر بند، انھی سب جرائم کے یا ان میں سے بعض کے مجرم پائے گئے ہوں گے حالاں کہ حکومت نے اپنے پورے بیان میں ہم پر یا ہم میں سے کسی پر بھی تعین کے ساتھ یہ الزام نہیں لگایا ہے کہ فلاں شخص نے فلاں جرم یا جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ الزام دہی کا طریقہ بڑا ہی نازیبا ہے۔ ممکن ہے حکومتیں اخلاق کے معمولی تقاضوں سے بالاتر ہوا کرتی ہوں لیکن ہم عامی انسان تو اپنے آپ کو اس طرزِ عمل سے کسی طرح مانوس نہیں کر سکتے کہ چند آدمیوں کو پکڑ کر آپ سال بھر تک بلا مقدمہ چلائے بند رکھیں اور پھر مزید کئی مہینہ تک انھیں بند رکھنے کو جائز ثابت کرنے کے لیے ان پر پبلک میں اس طرح کے مبہم اور گھناؤنے الزامات لگائیں۔ جب کہ وہ ان الزامات کی تردید نہ پبلک میں کر سکتے ہوں نہ عدالت میں۔

میں آپ کی حکومت کو چیلنج کرتا ہوں کہ اگر اس کے پاس کوئی ایسی اطلاعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ میں نے یا میرے رفقاء نے مذکورہ بالا افعال میں سے کسی فعل کا ارتکاب کیا ہے تو وہ اپنی اطلاعات کو چھپا کر نہ رکھے بلکہ انھیں یا تو شائع کرے اور مجھے پبلک میں جواب دہی کا موقع دے۔ یا پھر بہ الفاظ قائد اعظم مرحوم مجھ پر ایک مناسب عدالت میں ٹھیک ٹھیک قانونی طریقہ پر مقدمہ چلائے، جس کے سامنے مجھ کو اپنی صفائی پیش کرنے کے تمام حقوق حاصل ہوں۔

الزام الف کے متعلق میں پورے زور کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے اور میرے رفقاء نے اس کے سوا کوئی قصور نہیں کیا کہ قیام پاکستان کے بعد اس ریاست کو فی الواقع ایک اسلامی ریاست بنانے کا مطالبہ کیا تھا۔ اور جب اربابِ اقتدار کو اس معاملے میں تساہل کرتے دیکھا تو بالکل جائز آئینی اور جمہوری ذرائع سے ان پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اگر اس ضمن میں اس کے سوا حکومت کوئی اور ''اطلاعات'' رکھتی ہے تو وہ انھیں ضرور پبلک میں یا عدالت میں سامنے لائے اور اگر ہمارا قصور واقعی وہی ہے، جو میں نے خود بیان کر دیا ہے تو حکومت ذرا ہمت کر کے صاف صاف یہ کہے تو سہی کہ ہمارا پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی کوشش ہی اس کے نزدیک اس ریاست کے تحفظ اور استحکام کی دانستہ بیخ کنی (Delibrats Sabotage) تھی۔ پھر میں عرض کرتا ہوں کہ ہماری اس کوشش پر جتنا غصہ بھی آپ کی حکومت کو تھا اسے ۱۲/ مارچ ۱۹۴۹ء کو فرو ہو جانا چاہیے تھا۔ جب کہ دستور ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد پاس کی۔ اور جماعت اسلامی نے بلاتوقف اعلان کر دیا کہ اس قرارداد سے ریاست پاکستان، ایک اسلامی ریاست ہوگئی ہے۔

الزام ب کے سلسلے میں ہمارا کوئی قصور اس کے سوانہیں بتایا جاسکتا کہ ہم اسلامی ریاست کے اعلان سے پہلے ملازمینِ سرکار سے حلفِ وفاداری لیے جانے کو قبل از وقت قرار دیتے تھے۔اس معاملے میں ہماری پوزیشن جائز قانونی حدود کے اندر تھی یا اس کے باہر۔اس نکتہ کو بڑی آسانی کے ساتھ ایک عدالت میں ہم پر مقدمہ چلا کر صاف کیا جاسکتا تھا۔اور ہم اس کے لیے بالکل تیار تھے۔مگر یہ بات حکومت خود ہی بتا سکتی ہے کہ اس نے یہ سیدھا اور صاف طریق کار اختیار کرنے سے کیوں پہلو بچایا۔تاہم اس معاملے میں بھی ہمارا اور حکومت کا اختلاف ۱۲/مارچ ۱۹۴۹ء کو ختم ہو گیا۔ قرار داد مقاصد پاس ہو جانے کے بعد ہم صرف سرکاری ملازمین ہی کا نہیں بلکہ ہر مسلمان کا فرض اور عین تقاضائے ایمان سمجھتے ہیں کہ ریاست پاکستان کا خیر خواہ اور مخلص خیر خواہ ہو۔

الزام ج اس قدر گھناؤنا ہے کہ اس پر گفتگو کرتے ہوئے میں دلی نفرت محسوس کرتا ہوں۔لیکن چوں کہ حکومت نے اپنے پریس نوٹ میں اس کا بھی ذکر کر دیا ہے اس لیے میں صرف اتنا عرض کرنا کافی سمجھتا ہوں کہ، جو شخص ان جرائم کا مرتکب ہو وہ یقیناً واجب القتل ہے نہ صرف از روئے قانون ملکی، بلکہ از روئے شریعت اسلامی بھی۔

الزام د کے بارے میں گزارش ہے کہ میں اور میرے رفقاء اسلام اور خالص اسلام کے سوا اور کوئی اخلاقی یا اجتماعی تصورات رکھتے ہی نہیں۔بیس سال سے، جو کچھ میں نے اور مولانا امین احسن صاحب نے لکھا ہے وہ ساری دنیا کے سامنے ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس میں ہم نے اسلام کے سوا کوئی دوسرا اخلاقی یا اجتماعی تصور پیش کیا ہے۔بلاشبہ ہم پہلے بھی یہ کہتے رہے ہیں اور آج بھی کہتے ہیں کہ ہم سب سے پہلے خدا اور اس کے دین کے وفادار ہیں اور پھر اس معاشرے اور ریاست کے، جو خدا اور اس کے

دین کی مطیع و وفادار ہو۔ قرار داد مقاصد کے پاس ہونے سے پہلے صرف
پاکستان کا معاشرہ خدا اور دین خدا کا وفادار تھا۔ مگر ریاست کا معاملہ معلّق
تھا۔ اس لیے ہم نے کوشش کی کہ اسے بھی اس وفاداری میں منسلک کر لیا
جائے تاکہ ہم ضمیر کے پورے اطمینان کے ساتھ اس کے وفادار ہو سکیں۔
جب قرار داد مقاصد پاس ہوگئی تو یہ نزاع بھی ختم ہوگیا۔ اب میں پوچھتا
ہوں کہ کون سا سچا یا جھوٹا تضاد اور تصادم ہے، جو اپنے اخلاقی و اجتماعی
تصوّرات کی وفاداری اور ریاست پاکستان کی وفاداری میں ہماری طرف
سے پیدا کیا جا رہا ہے۔

میں اپنے مدعا کی طویل ترجمانی کے لیے معذرت خواہ ہوں اور اسے ختم کرتے ہوئے صرف اتنی بات اور عرض کیے دیتا ہوں کہ حکومت جس چیز کا بھی ہم سے انتقام لینا چاہے اور جب تک چاہے لیتی رہے۔ ان شاء اللہ وہ ہم کو صابر پائے گی۔ لیکن اگر وہ چاہتی ہے کہ اس کی یہ کارروائی اخلاقی حیثیت سے بھی درست مانی جائے تو یہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ غیر اخلاقی طریق کار چھوڑ کر ایسے سیدھے اور معقول طریقے اختیار کیے جائیں، جو اخلاقی مسلمات کے مطابق ہوں خواہ ان سے انتقام کے مقاصد پورے ہو سکیں یا نہ ہو سکیں۔ انسانی عقل اصولی طور پر اس حقیقت کو جانتی ہے اور اس کے اس وجدانی علم کو کبھی محو نہیں کیا جا سکتا کہ، جو روشنی میں آنے سے گھبراتا ہو اور تاریکی ہی میں کام کرنے پر اصرار کرے وہ ضرور اپنے دامن کردار پر کوئی داغ رکھتا ہے، جس کے ظاہر ہو جانے کا اسے خوف ہے۔ میری اس صاف گوئی کو احترام حکومت کے منافی نہ سمجھا جائے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے کوئی بات بے احترامی کی نیت سے نہیں لکھی ہے بلکہ، جو کچھ بھی لکھا ہے صرف اپنے نقطۂ نظر کو واضح طور پر پیش کرنے کی غرض سے لکھا ہے۔

۳/اکتوبر ۱۹۴۹ء

خاکسار

ابوالاعلیٰ مودودی

(۸)

نئی سنٹرل جیل ملتان

۲۳ رنومبر ۱۹۴۹ء

بھائی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

پچھلے خط میں آپ کو اطلاع دے چکا ہوں کہ، جو کاغذات آپ نے مانگے تھے میں نے انھیں آپ کے حوالے کرنے کے لیے اجازت طلب کی تھی۔ اب ایک لمبی مدّت کے بعد اس کا جواب مل گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ احکامِ نظر بندی کی نقلیں دی جا سکتی ہیں۔ رہی میری اس چٹھی کی نقل جو میں نے حکومت کو بھیجی تھی، تو اس کے متعلق سکوت ہے نہ صاف انکار ہی ہے اور نہ اجازت ہی۔ لہٰذا وہ تو میں آپ کو نہ دے سکوں گا۔ البتہ احکام نظر بندی کی نقلیں آپ لینا چاہیں تو آئندہ ملاقات کے موقعے پر وہ آپ کو دے دوں گا۔

آپ لوگ جب کبھی میری رہائی کے لیے کسی کوشش کا خیال ظاہر کرتے ہیں، میں اس سے آپ کو منع نہیں کرتا۔ صرف اس وجہ سے کہ آپ لوگوں کی خصوصاً والدہ صاحبہ کی دِل شکنی مجھے گوارا نہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ میرے نزدیک یہ ایک فضول اور غیر ضروری کام ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ لوگ ذرا صبر کے ساتھ دیکھتے رہیں کہ اس آغاز کا انجام کیا ہوتا ہے۔ میرا عمر بھر کا مطالعہ مجھے بتاتا ہے کہ دنیا میں کبھی وہ طاقتیں زندہ نہیں رہ سکی ہیں جنھوں نے قلعوں میں پناہ لینے کی کوشش کی ہے۔ کیوں کہ میدان کے مقابلے سے جی چرانا اور قلعوں کے پیچھے چھپنا بزدلی کی کھلی علامت ہے اور خدا نے اپنی یہ زمین بزدلوں کی فرماں روائی کے لیے نہیں بنائی ہے۔ اسی طرح میرا مطالعہ مجھے یہ بھی بتاتا ہے کہ جن لوگوں کا کاروبار جھوٹ اور فریب اور مکر کے بل پر چلتا ہے اور جن کے لیے حقیقت وصداقت کا روشنی میں آجانا ''خطرے'' کا حکم رکھتا ہے اور جن کو اپنی حکمرانی کی حفاظت کے لیے ''سیفٹی'' قسم کے قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے ایسے اخلاقی بزدلوں کی چوبی ہنڈیا زیادہ دیر تک چولھے پر نہ کبھی چڑھی رہ سکی ہے اور نہ رہ سکتی ہے۔ یہ چیز عقل کے خلاف ہے۔ قانونِ فطرت کے خلاف ہے اور ہزار ہا برس کے تاریخی تجربات اس پر شاہد ہیں کہ ان سہاروں پر جینے والے تھوڑی دیر کے لیے چاہے، کتنا ہی زور باندھ لیں، بہ ہر حال وہ دیر تک نہیں جی سکتے۔

میں اپنی خاطر نہیں خود ان لوگوں کی خاطر ہی یہ چاہتا تھا کہ یہ ہوش کے ناخن لیں اور سیدھے سیدھے بھلے آدمیوں کی طرح کام کریں۔ اس لیے میں نے انھیں باہر بھی سمجھانے کی کوشش کی اور اب اندر سے بھی اتمامِ حجت کر دیا۔ اب اگر یہ دنیا کی ہزاروں مرتبہ آزمائی ہوئی حماقتوں کا تجربہ کرنے ہی پر مصر ہیں تو انھیں تجربہ کر لینے دو۔

ابوالاعلیٰ مودودی

بنام: جناب ابوالخیر مودودی صاحب لاہور

(۹)

نئی سنٹرل جیل ملتان

۱۳ر جنوری ۱۹۵۰ء

عزیزم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۸ر دسمبر ۴۹ء کل ۱۲ر جنوری کو ملا۔ میں نے پہلے اڑتی ہوئی سی خبر سنی تھی کہ آپ کو بھی نظر بندی کی سعادت حاصل ہو چکی ہے۔ اب آپ کے خط سے اس کی تصدیق ہوئی۔ اس سعادت کے معاملے میں کسب کو کچھ دخل نہیں۔ یہ تو ایک وہبی چیز ہے۔

آپ نے اپنی جس اخلاقی لغزش کا ذکر کیا ہے اس میں آپ کے مبتلا ہونے کی اصل وجہ آپ کا بے جا، زعم اور اپنی اخلاقی طاقت پر غلط اعتماد تھا۔ آئندہ کے لیے یہ بات بہ طور اصول ذہن نشین کر لیجیے کہ جو کوئی اپنی طاقت کا غرّہ رکھتا ہو اور جان بوجھ کر آزمائش کو دعوت دے، اللہ تعالیٰ اُسے ضرور آزمائش میں ڈال دیتا ہے اور پھر اس کی مدد نہیں کرتا۔ بہ خلاف اس کے، جو شخص خود اپنی عاجزی کا معترف ہو اور خدا سے ہمیشہ عافیت مانگتا رہے اور دعا کرتا رہے کہ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ تو اللہ اگر اس پر آزمائش بھیجتا بھی ہے تو اس کے غرور کا سر کچلنے کے لیے نہیں بلکہ اس کی تربیت کرنے کے لیے بھیجتا ہے اور آزمائش کے دوران میں اگر اس بندے کا اخلاص برقرار رہے تو خدا خود اس کی مدد کرتا ہے تاکہ وہ اس سے کام یاب ہو کر نکلے۔

اس سلسلے میں ایک بات اور سمجھ لیجیے۔ خالق نے انسان کی فطرت کے لیے، جو خوبی

رکھی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہی نہ ہو۔ یہ خوبی انسان کے لیے نہیں بلکہ فرشتوں کے لیے رکھی گئی ہے۔ انسان کے لیے اصل خوبی یہ ہے کہ جب کبھی بشری کمزوری سے کوئی قصور اس سے ہو جائے تو جلدی سے جلدی وہ سنبھلے اور اس پر شرم سار و نادم ہو اور اصلاح کی کوشش اور اپنے اس قصور کی تلافی کرے اس معاملہ میں، جو شخص تساہل برتتا ہے اور جھوٹی تاویلیں کر کر کے اپنے نفس کو خود (Allowances) دیتا چلا جاتا ہے اس کا حال بالآخر چوہڑے جیسا ہو جاتا ہے کہ ہر وقت گندگی میں پڑا رہتا ہے اور اسے کچھ احساس نہیں ہوتا کہ کس حال میں مبتلا ہے۔ بہ خلاف اس کے، جو شخص ہر لغزش پر سنبھل جاتا ہے اور بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اصلاح و تلافی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اس سے اگر ہزار مرتبہ بھی لغزش ہو جائے تب بھی اس کی فطرت گندی نہیں ہو سکتی۔ گندگی صرف اوپر ہی اس کو لگے گی۔ اور بار بار دھلتی رہے گی۔ بلکہ اگر وہ نیک نیتی و اخلاص کے ساتھ توبہ و اصلاح کرتا رہے تو اسی چیز سے بالآخر اس کے اندر اتنی قوت بھی پیدا ہو جائے گی کہ وہ آزمائشوں کا مقابلہ زیادہ مضبوطی سے کر سکے گا۔

ابوالاعلیٰ مودودی

بنام: نذر الرحمٰن صاحب حافظ آباد

(۱۰)

نئی سنٹرل جیل ملتان

۲۸/اپریل ۱۹۵۰ء

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عنایت نامہ مورخہ ۱۴/اپریل مجھے ۲۷/اپریل کو وصول ہوا۔ صحرائی صاحب کی مجھ سے یا میرے رفقاء سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی اس بات کی تو سرکاری ذرائع سے بھی تحقیق کی جا سکتی ہے کہ آخر وہ مجھ سے کب ملے اور کیسے مل سکتے تھے؟ آپ کے باقی ماندہ سوالات ایسی صورت میں غیر متعلق ہو جاتے ہیں جب کہ سرے سے کوئی ملاقات ہوئی ہی نہیں۔

برادرم! میں اس وقت ایسی پوزیشن میں ہوں کہ اپنے خلاف کسی الزام کی تردید کرنا تو درکنار، اکثر حالات میں یہ جاننا بھی مشکل ہے کہ باہر کیا الزام مجھ پر لگایا جا رہا ہے، یہ ایک نادر موقع ہے جس کے لیے بھی مجھ پر حملہ آور ہونا مفید ہو سکتا ہو ضرور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

انسان کا گوشت ویسے ہی ایک لذیذ چیز ہے۔ پھر جب کہ وہ مفت بٹ رہا ہو تو ہمارے موجودہ اخلاقی ماحول میں بھلا ایسے زاہد کتنے نکل آئیں گے، جو اس سے متمتع ہونے میں تامل کر جائیں۔

صحرائی صاحب نے تو، جو کچھ کیا اس کا مجھے کوئی رنج نہیں۔ کیوں کہ وہ مجھے نہیں جانتے اور جانتے بھی ہوں تو ان کے کرنے کا کام وہی ہے جو انھوں نے کیا۔ مگر آپ نے، جو مجھ سے یہ پوچھا کہ کیا تو نے پاکستان کی تخریب کے عزائم کا اظہار کیا اور کیا تو نے قائداعظم مرحوم کو گالیاں دیں، اس سے فی الواقع مجھے بڑی اذیت ہوئی۔ کیوں کہ آپ سے میری توقعات کچھ اور تھیں۔ برادر عزیز! کیا اب کوئی ذلیل سے ذلیل بہتان بھی میرے مرتبے سے اتنا فروتر نہیں رہا کہ آپ اسے سن کر سُبحانَکَ ھٰذا بھتان عظیم کہہ سکیں اور مجھ سے اس کے دریافت کرنے کی ضرورت نہ سمجھیں؟ اور بالفرض اگر تحقیق کرنا ضروری ہی تھا تو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں کوئی اجنبی اور غیر معروف آدمی تو نہیں ہوں۔ کم و بیش ۳۰ سال سے پبلک لائف میں ہوں۔ برسوں اخبار نویسی کر چکا ہوں۔ سترہ اٹھارہ برس سے "ترجمان القرآن" نکال رہا ہوں۔ کتابوں اور رسالوں کی شکل میں میرے لکھے ہوئے ہزاروں صفحے موجود ہیں جن کو بلا مبالغہ لاکھوں آدمی پڑھ چکے ہیں پاکستان اور ہندستان میں ایسے ہزارہا آدمی موجود ہیں جنھوں نے اپنے کانوں سے میری تقریریں سنی ہیں۔ ہزاروں آدمی ذاتی طور پر میرے جاننے والے موجود ہیں۔ خود شہر لاہور میں برسوں رہ چکا ہوں۔ آپ نے کیوں نہ پبلک میں اعلان کیا کہ، جو شخص ابوالاعلیٰ کو ایک بدزبان اور یاوہ گو انسان کی حیثیت سے جانتا یا جس نے کبھی اسلام اور مسلمانوں کے دشمن و بدخواہ کی حیثیت سے جانا ہو وہ اپنی شہادت پیش کرے؟ آپ نے کیوں نہ میرے نئے اور پرانے ہم سایوں سے پوچھا کہ انھوں نے کبھی کوئی گالی یا بیہودہ بات میری زبان سے سنی ہے؟ آپ نے کیوں نہ میرے ذاتی ملازموں سے پوچھا کہ میں نے کبھی ان کو سخت سست کہا ہے؟ نہیں، بلکہ جو لوگ وقتاً فوقتاً مجھ کو گالیاں دیتے رہے ہیں اور آج بھی گالیوں سے نواز رہے ہیں آپ نے انھی سے قسم دے کر پوچھ لیا ہوتا کہ کبھی میں نے بھی ان کی گالی کا جواب گالی سے دیا ہے؟ یہ ساری شہادتیں اگر دنیا سے ناپید ہو چکی ہوتیں تو البتہ آپ حق بہ جانب تھے کہ مجھ سے دریافت فرماتے۔ "پاکستان کی تخریب کے عزائم کا اظہار!" اور وہ بھی میری زبان سے! سبحان اللہ! میرے عزیز! تھوڑی دیر کے لیے دین وملت کے سوال کو بھی نظر انداز کر دیجیے۔ خالص مادی نقطۂ نظر ہی سے دیکھیے تو بھلا

یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے کہ، جو شخص خود اپنے بال بچوں سمیت اس کشتی میں سوار ہے وہ اس میں چھید کرے گا؟ کیا وہ خود یہ چاہے گا کہ اس کا اور اس کی بیوی اور بیٹیوں اور بچوں کا وہی حشر ہو، جو اس کی آنکھیں مشرقی پنجاب میں اپنی قوم کی بہنوں اور بیٹیوں کا دیکھ چکی ہیں۔ اس قسم کا عجیب سوال مجھ سے کرنے کے بہ جائے آپ نے جیل کے ڈاکٹر سے پوچھا ہوتا کہ ابوالاعلیٰ اس قید کے زمانے میں کہیں پاگل تو نہیں ہو گیا ہے؟ اگر میں عقل و خرد سے محروم نہیں ہوں تو کیا غیرت اور حمیّت، شرافت سب آپ ہی لوگوں کے حصہ میں آ گئی ہے میرے اندر اس کا شائبہ بھی نہیں رہا۔

بنام: شورش کاشمیری۔ مدیر چٹان لاہور ابوالاعلیٰ مودودی

(۱۱)

نئی سنٹرل جیل ملتان

۶ر اپریل ۵۰ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ مورخہ یکم مارچ مجھے یہاں یکم اپریل کو ملا۔ جواب میں مزید تاخیر اس لیے ہوئی کہ میرے پاس خط لکھنے کا کاغذ موجود نہ تھا۔ امید ہے کہ میری مجبوری کو پیش نظر رکھ کر تاخیر جواب کو معاف فرمائیں گے۔ آپ کی اور سب احباب کی یاد فرمائی کا میں بھی شکر گزار ہوں اور میرے دونوں ساتھی بھی۔ ہم بھی آپ سب کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کا رہ نما اور ولی و مددگار ہو۔

میری جس عبارت کا آپ نے حوالہ دیا ہے اور اس کے مقابلے میں میری جو گفتگو نقل کی ہے، ان دونوں میں درحقیقت کوئی تضاد نہیں ہے۔ مقدم الذکر عبارت کا اصل منشاء صرف یہ بتانا ہے کہ اسلام کا مزاج موجودہ زمانے کی انقلابی تحریکوں کے مزاج سے مختلف ہے۔ آج کل کی انقلابی تحریکیں اول تو ان سب لوگوں کے خلاف سخت انتقامی کارروائیاں کرتی ہیں، جو ان کی کام یابی کی راہ میں مزاحم رہے ہوں، دوسرے وہ ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام قائم کرنے میں سخت اکھیڑ پچھاڑ اور توڑ پھوڑ کا طریقہ استعمال کرتی ہیں اور اس کی کچھ پروا نہیں کرتیں کہ اس تغیر و تبدل سے کتنے لاکھ یا کتنے کروڑ بندگانِ خدا تباہ ہو جائیں گے۔ اسلام اس کے برعکس جب کام یابی (یعنی حکمرانی) کے مرحلے پر پہنچتا ہے تو وہ بالعموم انتقام کے بہ جائے عفو و درگزر کی پالیسی پر عمل کرتا

میں آپ کی حکومت کو چیلنج کرتا ہوں کہ اگر اس کے پاس کوئی ایسی اطلاعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ میں نے یا میرے رفقاء نے مذکورہ بالا افعال میں سے کسی فعل کا ارتکاب کیا ہے تو وہ اپنی اطلاعات کو چھپا کر نہ رکھے بلکہ انھیں یا تو شائع کرے اور مجھے پبلک میں جواب دہی کا موقع دے۔ یا پھر بہ الفاظ قائداعظم مرحوم مجھ پر ایک مناسب عدالت میں ٹھیک ٹھیک قانونی طریقہ پر مقدمہ چلائے، جس کے سامنے مجھ کو اپنی صفائی پیش کرنے کے تمام حقوق حاصل ہوں۔

الزام الف کے متعلق میں پورے زور کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے اور میرے رفقاء نے اس کے سوا کوئی قصور نہیں کیا کہ قیام پاکستان کے بعد اس ریاست کو فی الواقع ایک اسلامی ریاست بنانے کا مطالبہ کیا تھا۔ اور جب اربابِ اقتدار کو اس معاملے میں تساہل کرتے دیکھا تو بالکل جائز آئینی اور جمہوری ذرائع سے ان پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اگر اس ضمن میں اس کے سوا حکومت کوئی اور ''اطلاعات'' رکھتی ہے تو وہ انھیں ضرور پبلک میں یا عدالت میں سامنے لائے اور اگر ہمارا قصور واقعی وہی ہے، جو میں نے خود بیان کر دیا ہے تو حکومت ذرا ہمت کر کے صاف صاف یہ کہے تو سہی کہ ہمارا پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کی کوشش ہی اس کے نزدیک اس ریاست کے تحفظ اور استحکام کی دانستہ بیخ کنی (Delibrats Sabotage) تھی۔ پھر میں عرض کرتا ہوں کہ ہماری اس کوشش پر جتنا غصّہ بھی آپ کی حکومت کو تھا اسے ۱۲؍ مارچ ۱۹۴۹ء کو فرو ہو جانا چاہیے تھا۔ جب کہ دستور ساز اسمبلی نے قرار داد مقاصد پاس کی۔ اور جماعت اسلامی نے بلاتوقف اعلان کر دیا کہ اس قرار داد سے ریاست پاکستان، ایک اسلامی ریاست ہوگئی ہے۔

ہے۔ اور سابق نظام کی خرابیوں کو بدلنے اور ان کی جگہ اپنا اصلاحی پروگرام نافذ کرنے میں بھی اس کی عام پالیسی یہ ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ نرمی اور تدریج کے ساتھ اصلاح کی جائے۔ اور انسانی زندگی کو طوفان خیز تغیرات سے جس حد تک بھی ممکن ہو بچایا جائے۔ اسلام کی اس پالیسی کو بیان کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ روح اسلام سے نابلد لوگ اصلاح کے غیر حکیمانہ جوش میں دنیا کے چلتے ہوئے انقلابی مسلکوں کی، جو نقل اتارنا چاہتے ہیں اور پھر اپنی اس نقالی پر اسلام کا لیبل بھی چپکا دیتے ہیں۔ ان کے طریق فکر کی غلطی واضح کروں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ، جو صریح اور ثابت شدہ بے انصافیاں ہمارے نظام معاشی یا نظام معاشرت میں موجود ہوں ان کا تدارک کرنے میں اسلام کی مذکورہ بالا پالیسی مانع ہو۔ اگر ہمیں تحقیق سے معلوم ہو جائے کہ ایک چیز قائم ہی ظلم پر ہوئی ہے اور اس بات کا ثبوت مل جائے کہ اس چیز کے لیے فی الاصل کوئی بنیاد موجود نہیں ہے تو ہم اس میں تغیر و تبدل، تنسیخ سب ہی کچھ کر سکتے ہیں بہ شرطے کہ یہ، جو کچھ بھی کیا جائے اسلامی نظریات کی بنا پر کیا جائے، نہ یہ کہ نظریات و تصوّرات تو لائے جائیں کہیں اور سے اور استعمال کیا جائے اس کے لیے اسلام کا نام۔

یہ تو ظاہر ہے کہ جب اسلامی نظام کے قیام سے قبل ایک مدّتِ دراز تک سارا لین دین اور معاشی کاروبار غیر اسلامی قوانین پر چلتا رہا تو اس مدت کی ساری ہی ملکیتیں مشتبہ ہو جاتی ہیں۔ خواہ وہ زمینیں ہوں، یا مکانات، یا کپڑے اور برتن اور فرنیچر اور سواریاں یا بینکوں کے ڈپازٹ یا تجارتی کمپنیوں کے حصے یا اور دوسری قسم کی جائیدادیں۔ اب یہ بہ ہر حال ممکن نہیں ہے کہ اسلامی نظام قائم ہونے پر ان سب کو منسوخ کر کے نئی تقسیم کی جائے یا ان میں سے ہر ایک کی اصلیت (Origin) معلوم کی جائے اور صرف ان ملکیتوں کو باقی رکھا جائے، جو اسلامی قانون کے لحاظ سے جائز طریقہ پر حاصل کی گئی ہوں۔ بالعموم تو وہی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جو قرآن میں متعدد مواقع پر کسی چیز کی حرمت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ پہلے، جو ہو چکا ہے سو ہو چکا۔ یعنی یہ حکم (Retrospective Effect) نہیں رکھتا، آئندہ کے لیے اپنے عمل کی اصلاح کرو۔ البتہ جن خاص امور میں ہم کو متعین طور پر معلوم ہو کہ ظلم اور بے انصافی کی کوئی مخصوص شکل کسی بڑے پیمانہ پر رائج رہی ہے اور اس کی تحقیق و تلافی انصاف کے ساتھ کی جا سکتی ہو، ایسے معاملات میں مذکورہ بالا عام اصول سے ہٹ کر بھی عمل کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک زمینوں کی ملکیت اور سابق حکومتوں کی عطا کردہ اراضی اور جاگیرات کا تعلق

ہے، ان سب پر کوئی ایک حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ جن زمین داروں کی اصل اتنی قدیم ہے کہ ان کی تحقیق ممکن نہیں ہے۔ وہ منسوخ کرنے کی نہیں، بلکہ برقرار رہنے کی مستحق ہیں کیوں کہ اصول یہ ہے کہ منسوخ اسے کیا جائے گا، جس کا ناجائز ہونا ثابت ہو جائے نہ کہ ہر اس جائداد کو جس کا جائز ہونا ثابت نہ ہو۔ اسی طرح زرخرید زمین کو بھی خواہ اس کا رقبہ کتنا ہی ہو، نہیں چھینا جا سکتا۔ البتہ وہ زمین داریاں منسوخ کرنے کے لائق ہیں جن کی نوعیت دراصل نائب تحصیل داری کی تھی مگر سابق حکومت نے زبردستی، سراسر ناجائز طور پر ان کو مالکانہ حیثیت دے دی تھی۔ علیٰ ہذا القیاس سابق حکومتوں کے سارے عطیّے باطل ہی نہ تھے۔ ہر ایک کے کاغذات کو دیکھ کر ہی رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ ان میں سے کون جائز نوعیت کے تھے اور کون ناجائز۔ اسی بنا پر میں نے اپنی کتاب ''ملکیت زمین'' میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بے لگام انقلابی فلسفوں کی تقلید میں اندھا دُھند احکام لگانے کے بہ جائے تمام زمین داریوں اور جاگیروں کی باقاعدہ تحقیق ہونی چاہیے نیز یہ کہ جس انصاف کے مستحق کاشتکار ہیں وہ ان کے ساتھ اور جس انصاف کے مستحق مالکان ہیں وہ ان کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اگر زمین داروں کی خاطر کاشتکاروں کی حق ماری ظلم ہے تو کاشتکاروں کی خاطر زمین داروں کی حق ماری بھی ظلم ہے۔

بنام: جناب چودھری غلام محمد صاحب کراچی ابوالاعلیٰ مودودی

(۱۲)

دارالاسلام پٹھان کوٹ

۴۱ء

محترمی و مکرمی! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

آپ کی تحریر میں نے رات ہی کو دیکھی۔ اس کے بعد سونا چاہا مگر سو نہ سکا۔ اس لیے رات ہی کو لکھنے بیٹھ گیا۔ میرے لیے اس میں کوئی چیز رنج پہنچانے والی نہیں ہے بلکہ میں خوش ہوں کہ آپ نے، جو کچھ محسوس کیا اور سوچا سمجھا اسے صاف صاف لکھ دیا۔ صرف افسوس اگر ہے، تو اس کا کہ آپ نے بات کے انتہائی حدود تک پہنچ جانے کے بعد مجھ سے رجوع کیا۔ ورنہ ابتدائی مراحل ہی میں آپ مجھے اپنے خیالات سے آگاہ کر دیتے تو شاید حل اتنا مشکل نہ ہوتا جتنا اب ہو گیا ہے۔ البتہ جس چیز نے مجھے نیند سے محروم کر دیا وہ دراصل یہ ہے کہ میں برسوں کی سعی و جہد کو

اس نتیجے پر ختم ہوتے ہوئے ٹھنڈے دل سے گوارہ نہیں کرسکتا۔ اگر یہ سعی و جہد اپنی ذات کے لیے ہوتی تو خدا کی قسم اس سے بھی زیادہ کسی برے نتیجے پر اس کے ختم ہونے کی مجھے کچھ پروانہ ہوتی۔ مگر جب کہ یہ خدا کے لیے اور اس کے دین کے لیے تھی، تو میرے لیے بہت مشکل ہے کہ میں اس بدانجامی پر اس کے ختم ہونے کو اطمینان کے ساتھ برداشت کرلوں اس لیے میں ایک آخری کوشش اس کے بچانے کی کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ مصرف القلوب ہے ممکن ہے کہ آپ اور دوسرے لوگ، جو ایک پہلو سے سارے معاملے کو دیکھ رہے ہیں۔ اگر ان کے سامنے وہ دوسرا پہلو بھی رکھ دوں تو شاید یہ کام بربادی سے بچ جائے۔

پہلا سوال جس پر آپ کو اور آپ کی طرح سوچنے والوں کو غور کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کو اس کام کی طرف جس چیز کی کشش نے کھینچا وہ کیا چیز تھی؟ اگر وہ میری ذات کی کشش تھی تو وہ بہ جائے خود نہایت غلط چیز تھی، اس کی طرف آپ کو کھنچنا ہی نہ چاہیے تھا۔ اور اب خدا کا بڑا فضل ہوا کہ وہ کشش باقی نہ رہی ایسے ایک نامبارک تائف واجتماع سے لاکھ درجہ زیادہ بہتر ہے کہ آپ سب بکھر جائیں۔ اور اگر وہ اقامتِ دینِ حق کے نصب العین کی کشش تھی اور اگر اس کی طرف کھنچنے کے لیے آپ لوگوں کو مجبور کرنے والی طاقت دراصل اس احساس کی طاقت تھی کہ اس نصب العین کے لیے کوشش کرنا مسلمان ہونے کا عین اقتضا ہے اور اس کوشش کی صحیح صورت یہی ہے کہ اجتماعی طور پر کام کیا جائے، تو میں نہیں سمجھتا کہ محض ایک میرے نااہل ثابت ہوجانے سے آپ لوگ اس قدر جلدی اور اتنی آسانی سے بکھر جانے پر کیسے آمادہ ہوگئے۔ کیا اس نصب العین میں اب کشش نہ رہی؟ ایک شخص کی نالائقی سے وہ نصب العین حق نہ رہا؟ یا اب یہ انکشاف ہوا کہ اس کے لیے کوشش کرنا مسلمان کا اقتضا نہیں؟ یا اجتماعی سعی اب اس کے لیے غیر ضروری ہوگئی؟ اگر ان میں سے کوئی صورت نہیں ہے، بلکہ صرف ایک شخص نالائق ثابت ہوا ہے تو بہ جائے اس کے کہ آپ اس شخص کو اس کام پر قربان کرنے پر آمادہ ہوتے، آپ نے اس ایک حد تک بنے ہوئے کام کو اس پر قربان کرنے کا کیوں ارادہ کرلیا۔ اشخاص نصب العین کے لیے ہوتے ہیں، نصب العین اشخاص کے لیے نہیں ہوتے۔ نصب العین اگر عزیز تر ہے تو آپ کو ہر اس محبت اور تعلق پر چھری چلادینی چاہیے جو اس کی راہ میں روڑا بنتی ہو، چاہے وہ باپ اور بیٹے کی محبت ہی کیوں نہ ہو۔

دوسرا سوال جس پر آپ حضرات کو اپنی قوتِ فکر صرف کرنی چاہیے، وہ یہ ہے کہ خدا کے ہاں آپ کی مسئولیت کس چیز پر ہے۔ آیا اس پر ہے کہ اس نصب العین کے لیے آپ، جو کچھ کر سکتے تھے وہ آپ نے کیا یا نہیں؟ یا اس پر کہ جو کچھ نہیں کر سکتے تھے وہ کیا یا نہیں؟ آپ سے یہ پوچھا جائے گا کہ جو اسباب و وسائل تم کو میسّر تھے، ان سے تم نے کیا کیا اور کتنا کام لیا؟ یا یہ پوچھا جائے گا کہ جو اسباب و وسائل میسّر نہ تھے ان سے کیوں کام نہیں لیا؟ نیز کیا آپ یہ جواب دہی کر سکیں گے کہ ہم جس معیار کے اسباب و وسائل چاہتے تھے، چوں کہ وہ میسر نہ آئے تھے، لہٰذا ہم نے کام نہیں کیا اور جو تھوڑا بہت کام ابتداء میں کیا بھی تھا اسے بھی ملیا میٹ کر آئے ہیں؟ خصوصاً جب کہ وہ معیار جو آپ نے اسباب و وسائل کے لیے تجویز کیا ہے، منصوص نہیں ہے اور خدا اور رسولؐ نے اس معیار کے اسباب و وسائل کی فراہمی کو اس خدمت کی انجام دہی کے لیے شرط نہیں ٹھہرایا ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ محض یہ عذر کہ اس معیار کے وسائل فراہم نہیں ہوئے آپ کو کام نہ کرنے اور شروع کیے ہوئے کام ملیا میٹ کر دینے پر خدا کی پکڑ سے نہ بچا سکے گا اور اس پر، جو مواخذہ ہوگا وہ غالباً اس مواخذہ سے شدید تر ہوگا، جس کا خطرہ آپ نے اپنی تحریر میں ظاہر کیا ہے۔

ان دو سوالات پر غور کرنے سے مجھے امید ہے کہ آپ کو بہ آسانی وہ راستہ سوجھ جائے گا جو اس حالت میں اختیار کرنا چاہیے۔ سب سے پہلی بات، جو آپ لوگوں کو قطعی طور پر طے کر لینی چاہیے، وہ یہ ہے کہ اقامتِ دین کے لیے اجتماعی کوشش بہ ہر حال کرنی ہے اور یہ کوشش جس مرحلے تک پہنچی ہے یا پہنچ چکی ہے اسے اس سے پیچھے نہیں جانے دینا ہے بلکہ آگے بڑھانا ہے اور اس کے آگے بڑھانے میں، جو چیز بھی سدِ راہ ہو، اسے اٹھا کر پھینک دینا ہے خواہ وہ امیر جماعت ہو، یا اپنی جماعت کا کوئی رفیق ہو، یا ہمارے باپ، بھائی، اولاد، اقارب ہوں یا ہمارے شخصی کاروبار اور وسائل معیشت ہوں۔

دوسری بات جو طے کر لینی ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ جو اسباب و وسائل ہمیں میسر ہیں انھی سے کام لینا ہے۔ کیوں کہ ہم خدا کی سامنے انھی پر مسئول ہیں۔ اسباب و وسائل کی تعریف میں جس طرح روپیہ، آلات اور مادی قویٰ آتے ہیں اسی طرح انسان بھی اسی تعریف میں آتے ہیں۔ جو انسان ہمیں میسر ہیں ہم کو اپنے مقصد کی راہ میں جدوجہد کرنے کے لیے انھی سے کام لینا ہے فرشتے لانے کے لیے ہم مکلّف نہیں ہیں۔ نہ یہ کسی نص میں تصریح ہے کہ اس معیار کے آدمی اگر

فراہم نہ ہوں تو اقامتِ دین کی سعی کا فریضہ تم سے ساقط ہے، نہ یہ کہیں لکھا ہے کہ اقامتِ دین کی سعی اگر تم نے شروع کی اور کسی مرحلہ پر جا کر معلوم ہوا کہ فلاں فلاں معیار کے اشخاص موجود نہیں ہیں تو جتنا کام تم کر چکے ہو، اسے بھی فوراً ملیا میٹ کر دو، ورنہ خدا کے ہاں پکڑے جاؤ گے۔ ایسی کوئی ہدایت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں نہیں ہے۔ اپنی خودساختہ شرطوں اور معیاروں کو لپیٹ کر رکھ دینا چاہیے، ایک شخص اگر نالائق ثابت ہوا ہے تو پھر سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے اور اسے ہٹا کر اپنے میں سے کسی دوسرے شخص کو لیڈر بنانا چاہیے اور مسلسل کام کرتے رہنا چاہیے تا آں کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا شخص پیدا کر دے۔ جس کی کاملیّت پر سب لوگ یا بیشتر لوگ مطمئن ہو جائیں۔ بہ ہر حال جو اشخاص موجود ہیں اور میسر آ سکتے ہیں انھی میں سے کسی اصلح آدمی کو منتخب کرنا لازم ہے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یکے بعد دیگرے دس آدمی بھی میری طرح مایوس کن ثابت ہوں تو ہم گیارھویں آدمی کو ان کی جگہ لے آئیں۔ میرا دل اس منطق کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ تو نااہل ثابت ہوا اور میں خود اپنے کو بھی نااہل سمجھتا ہوں اور کوئی تیسرا آئے تو مجھے ڈر ہے کہ وہ کہیں مجھ سے اور تجھ سے زیادہ نااہل نہ نکل آئے۔ لٰہذا یہ ساری بساط لپیٹ دی جائے۔

برسبیل تذکرہ یہ بھی عرض کر دوں کہ اب تک میں نے جس طریق پر کام کیا ہے اس کی بنیاد انھی دو امور پر ہے جن کا اوپر ذکر کر آیا ہوں۔ اولاً میں نے اپنے دل میں اس بات کا فیصلہ کر لیا کہ اقامتِ دین کے لیے اجتماعی کوشش بہ ہر حال کرنی ہے خواہ بری یا بھلی، دوسرے یہ کہ جو اسباب و وسائل میسر ہیں انھی سے کام لینا ہے اور بلند معیار تک پہنچنے کی کوشش کرنے کے ساتھ جیسا کچھ پست معیار اس وقت پایا جاتا ہے اس کو انتہائی ممکن حد تک استعمال کرنا ہے۔ جہاں تک میری اپنی کم زوریوں کا تعلق ہے آپ اس سے جس قدر واقف ہیں میں اس سے بہت زیادہ ان کو جانتا ہوں مگر ان کو جاننے کے باوجود، میں نے اس بارِ عظیم کو اٹھانے کی ہمت صرف اس لیے کی کہ جو قوتیں مجھ میں نہیں ہیں یا جن کی میرے اندر کمی ہے، ان کے فقدان یا قلت سے دل شکستہ ہو کر ان قوتوں سے بھی کام نہ لینا، جو میرے اندر ہیں میرے نزدیک حرام ہے اور میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ اگر اونچے درجے کا کام نہیں ہو سکتا تو جس درجہ کا کام ہو سکتا ہے وہ بھی نہ کیا جائے — اسی طرح میں اپنے رفقاء سے بھی فرداً فرداً اکثر و بیشتر کی کم زوریوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرے قریبی رفیقوں میں مدتوں سے کام کرنے والوں میں اور ان لوگوں میں جن پر میں نے ذمّہ داری کے

کاموں کا بوجھ ڈالا ہے، متعدد اشخاص ایسے ہیں جن سے مجھے نہایت تلخ تجربے ہوئے اور اب تک ہو رہے ہیں لیکن میں ان سے مایوس نہیں ہوا، نہ کبھی میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ایسے نافرض شناس، ناکارہ اور اخلاقی کم زوریوں سے بھرے ہوئے لوگوں کو لے کر کیا کام کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ہمیشہ نہایت صبر کے ساتھ ان کی کم زوریوں کو برداشت کیا اور یہی فیصلہ کیا کہ برے یا بھلے جیسے آدمی بھی میسر ہیں، انھیں ساتھ لے کر کام کرنا چاہیے اور ساتھ ساتھ ان کی اصلاح کی بھی کوشش کرنی چاہیے ـــــ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں اس بلند معیار سے واقف نہیں ہوں، جو اس کام کے لیے مطلوب ہے، نہیں، معیار میری نگاہ میں اسی طرح واضح ہے جس طرح آپ کی نگاہ میں ہے اور اس کے لحاظ سے میں اپنی اور سب لوگوں کی پستی و بلندی کا اندازہ قریب قریب صحت کے ساتھ کرتا ہوں، لیکن میرے اور آپ لوگوں کے نقطۂ نظر میں فرق صرف یہ ہے کہ میں اعلیٰ معیار کو کام کرنے کے لیے شرط نہیں سمجھتا بلکہ صرف مطلوب سمجھتا ہوں جسے حتی الامکان تلاش اور حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے، لیکن کم سے کم ناگزیر معیار تک جتنے لوگ بھی ملیں ان سے کام لینے میں دریغ نہ کرنا چاہیے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ سب لوگ ٹھنڈے دل سے اس طرزِ عمل پر غور کریں اور اگر دل گواہی دے کہ کام اسی طرح ہو سکتا ہے تو یہی طرزِ عمل اختیار کریں۔ بورڈ کی تجویز کو میں ناقابلِ عمل سمجھتا ہوں، اگر بورڈ بنایا بھی جائے تو بہ ہر حال صدر ناگزیر ہے، جس کے ہاتھ میں بڑی حد تک امارت کے اختیارات دینے پڑیں گے ورنہ وہی حشر ہوگا، جو میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈ کا ہوتا ہے۔ خصوصاً ایک تحریک کو چلانے کے لیے بورڈ کبھی موزوں نہیں ہوتے۔ ان کے لیے لیڈر بہ ہر حال ضروری ہے، لہٰذا جماعت کا ایک اجتماع کر کے لیڈر ضرور منتخب کرنا چاہیے خواہ وہ معیار مطلوب سے نیچا ہی کیوں نہ ہو، رہا میں، تو میں نہ پہلے اس منصب کا خواہش مند تھا، نہ اب ہوں۔ بلکہ خدا سے چاہتا ہوں کہ دوسرا شخص مجھے اس بار سے سبک دوش کر دے۔ البتہ میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں کہ سرے سے یہ بار ہی اتار کر پھینک دیا جائے اور ساری بساط لپیٹ کر ہم سب حسبِ سابق انفرادی وعظ گوئی میں لگ جائیں۔

یہاں تک جماعت اور اس کے مستقبل کی گفتگو تھی۔ اب میں اپنی ذات کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن اس کی غرض نہ اپنی صفائی پیش کرنا ہے اور نہ امارت اور قیادت کے لیے اپنی

اہلیت ثابت کرنا، بلکہ میں بعض غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہتا ہوں، بعض امور میں آپ سے رہ نمائی چاہتا ہوں اور بعض معاملات کو جن کا آپ نے ذکر کیا ہے صاف کرنے کے لیے کچھ تجویزیں پیش کرنا چاہتا ہوں، تاکہ ان میں آپ مجھے مشورہ دے سکیں۔

سب سے پہلے میں غلط فہمیوں کو صاف کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ سے جن صاحب نے یہ بیان کیا کہ میں نے اپنے موجودہ طرز معیشت کو حق بہ جانب ثابت کرتے ہوئے ان سے یہ کہا کہ ''اگر میں اس حیثیت سے اپنے معیار کو نیچے اتارلوں تو پھر لوگوں پر میرا کوئی خاص اثر اور اقتدار نہیں رہے گا اور پھر میری بات میں وزن نہیں مانا جائے گا۔'' انھوں نے اصل بات کو بالکل غلط رنگ میں آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے مجھ سے مطالبہ فرمایا تھا کہ میں ترجمان القرآن اور رسالۂ دینیات وغیرہ کو بھی دوسری کتابوں کی طرح جماعت کی ملک بنادوں اور جماعت کے فنڈ سے تنخواہ لیا کروں۔ میں نے اس سے اختلاف کیا اور ان سے کہا کہ اولاً آپ کا یہ مطالبہ غیر شرعی ہے، اللہ اور اس کے رسول نے کبھی یہ حکم نہیں دیا کہ سب لوگ اپنے وسائل معیشت جماعت کے حوالہ کردیں اور جماعت کے تنخواہ وار کارکن بن کر رہیں۔ یہ مارکس لینن کی شریعت کا قاعدہ ہے نہ کہ خدا اور رسولؐ کی شریعت کا۔ ثانیاً اگر میں آپ کے اس مطالبہ پر عمل کروں تو میرے لیے اخلاق حسنہ کی پرورش کا ایک دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہوجائے گا۔ جب تک میں اپنی معیشت میں آزاد ہوں میرے لیے موقع ہے کہ خدا کے کام میں اپنے اختیار سے جتنا چاہوں خرچ کروں، لیکن آپ مجھے پابند بنا کر، باختیار خود راہِ خدا میں خرچ کرنے کا دروازہ مجھ پر بند کرنا چاہتے ہیں۔ ثالثاً جماعت کے فنڈ سے تنخواہ لے کر کام کرنے کی صورت میں میری بات کا وہ وزن نہیں ہوسکتا، جو اب ایک بے غرض اور بے لاگ آدمی ہونے کی حیثیت سے ہے اور قریبی دور کے تجربہ سے یہی معلوم ہوا ہے کہ جس نے بھی جماعتی فنڈ سے تنخواہ لے کر کام کیا ہے وہ پھر جماعت کی قیادت کا کام نہیں کرسکا ہے۔ یہ تھی اصل بات جس کو اس طرح مسخ کرکے آپ سے بیان کیا گیا۔ لوگوں کے ساتھ میرے طرز عمل کے متعلق، جو شکایات ہیں ان کو میں قطعاً بے اصل سمجھتا ہوں، جہاں تک میرا اندازہ ہے اس معاملہ میں آپ نے، جو خیالات ظاہر کیے ہیں وہ آپ کے اپنے احساسات نہیں ہیں بلکہ وہ روایات ہیں، جو میرے چند عنایت فرما ایک مدّت سے میرے متعلق پھیلا رہے ہیں اور صرف آپ ہی سے نہیں بلکہ اکثر لوگوں سے نہایت ہم دردانہ اور

خیر خواہانہ رنگ میں انھیں بیان کرتے رہتے ہیں۔ مجھ سے لوگوں کو بدگمان کرنے اور جماعت کے اندر بددلی پھیلانے میں ان حضرات نے کافی سعی کی ہے اور یہی نہیں تاہنوز اس عنایت کا سلسلہ جاری ہے ـــــ میں اب تک خود نہیں سمجھ سکا ہوں کہ یہ کس گناہ کی سزا ہے، جو مجھے دی جارہی ہے۔ جہاں تک میرے امکان میں تھا میں نے ان کے ساتھ ہمیشہ بھلائی ہی کی حتیٰ کہ ان کے ایسے قصوروں تک سے چشم پوشی کی ہے جن پر میں سختی سے باز پرس کر سکتا تھا، لیکن ان کا طرزِ عمل میرے ساتھ یہ ہے کہ میری حرکات وسکنات کو خوردبین لگا کر دیکھتے رہتے ہیں اور ان سے عجیب عجیب معنی نکال نکال کر اپنی مجلسوں میں اکثر انھیں موضوعِ گفتگو بنایا کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کے سامنے انھیں نہایت اخلاص کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

آپ نے خود اگر یہ محسوس کیا ہے کہ بعض لوگوں کے ساتھ میں بے رُخی برتتا ہوں تو اس کو غلط رنگ میں دیکھنے پر آپ مجبور ہیں، کیوں کہ آپ کو حقیقت کا علم نہیں ہے۔ میں ان لوگوں سے واقف ہوں اور اب میرے دل میں ان کے لیے کچھ زیادہ جگہ باقی نہیں رہی ہے اس لیے فطرتاً ان کے ساتھ حُسن التفات نہیں برت سکتا۔ لیکن آپ کو اس معاملہ کا علم نہیں ہے اس لیے آپ کا اس غلط فہمی میں مبتلا ہونا حق بہ جانب ہے۔ جہاں تک تقویٰ کا تعلق ہے میں خود اس معاملہ میں اپنے اندر بہت کمی محسوس کرتا ہوں اور اصلاح کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں کبھی اس بات پر برا نہیں مانتا کہ کوئی شخص میری کسی غلطی یا کوتاہی یا گناہ کو دیکھے اور مجھے اس پر ٹوک دے، برا ماننا تو درکنار میں تو ایسے شخص کا شکر گزار ہوتا ہوں۔ لہٰذا جہاں، جو کوتاہی بھی آپ لوگ دیکھیں اس پر مجھے متنبہ کر دیں، اپنی اصلاح کے لیے میں خود کوشاں ہوں اور آپ لوگوں سے بھی مدد کا متوقع ہوں۔ البتہ یہ بات میرے لیے خلاف توقع ہے کہ میری کم زوریوں کو اس کام ہی کے ختم کر دینے کے لیے حیلہ بنایا جائے۔

میری معاشرت کا، جو معیار ہے اس میں جس قسم کا تغیر آپ حضرات کے نزدیک ضروری ہے اس کے متعلق مجھے بے تکلف مشورہ دیجیے۔ اگر موجودہ حالات میں میرے لیے یہ ممکن ہوا کہ بہ آسانی وہ تغیر کر سکوں تو بہتر ہے اور اگر میں نے یہ محسوس کیا کہ اس حد تک تغیر کو میرے اہل وعیال برداشت نہ کر سکیں گے تو مجھے اپنی بیوی کو طلاق دینے میں بھی کوئی تامّل نہیں ہے، جو چیز بھی نصب العین کی راہ میں رکاوٹ ہو، اسے میں راستہ سے ہٹا دوں گا خواہ وہ بیوی ہو یا اولاد یا کوئی اور چیز۔

آپ کا یہ اندازہ کہ میں ایک نیا دارالمصنفین یا ایک جدید قسم کا دارالعلوم بنا دینے سے زیادہ کوئی عزم نہیں رکھتا، ایک غلط اندازہ ہے۔ اگر آپ اس معاملے میں مجھ سے تفصیلی گفتگو کر لیتے، تو آپ کو اس نقشہ کا علم ہو جاتا جس پر میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ اور یہ معلوم ہو جاتا کہ میرا عزم کیا ہے؟ آپ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ تو اس کے سوا کچھ کرنے کا اہل نہیں ہے کیوں کہ اس قسم کی رائے قائم کرنے کا آپ کو اور ہر شخص کو حق ہے لیکن میرے عزم کے متعلق مجھ سے پوچھئے کہ کیا ہے خود اپنے گمان سے ایک عزم میری طرف منسوب نہ کر دیجئے۔

آپ کا یہ اندازہ بھی صحیح نہیں ہے کہ کسی اجتماعی کام کو منظّم کر کے چلانے اور اس کی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت یا طاقت نہیں رکھتا اور شاید ان ذمے داریوں کا پورا احساس بھی مجھے نہیں ہوتا۔ اس قسم کے خیالات قائم کرنے سے پہلے کبھی میری مشکلات اور مجبوریوں کو بھی پوچھئے۔ اگر آپ بھی ایک بیرونی ناظر کی طرح معاملات کو دیکھیں اور چند قیاسات قائم کر کے الگ ہو جائیں تو یہ ستم ہے۔ ذرا شریک کار بن کر دیکھئے کہ کس قسم کے آدمیوں سے کام لینا پڑ رہا ہے اور کن مشکلات سے میں گزر رہا ہوں۔ میں نے اب تک یہ محسوس نہیں کیا ہے کہ آپ شریک کار ہیں بلکہ اس کے برعکس میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ آپ کو اس کام میں وہ دل چسپی نہیں ہے جو آدمی کو اپنے کام سے ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے ابھی تک آپ کو حقیقی صورت حال سے آگاہ بھی نہیں کیا ہے کیوں کہ (معاف کیجئے) میں آپ کو اب تک اس درجہ میں سمجھتا ہوں کہ جس اوکھلی میں میں نے سر دیا ہے اس کے دھمکوں سے آپ کو باخبر کر دوں تو آپ اس میں میرے ساتھ اپنا سر رکھنے کے بہ جائے الٹے بانس بریلی واپس تشریف لے جائیں گے۔

مالی معاملات کے متعلق یہ عرض ہے کہ پریس پر جماعت کا، جو روپیہ صرف ہوا ہے میں اپنے ذمہ لینے اور اس کو اپنی ذمہ داری پر چلانے کے لیے تیار ہوں۔ جماعت کے بک ڈپو کو میں ترجمان سے پہلے ہی الگ کر چکا ہوں۔ اب میرا خود یہ ارادہ ہے کہ چند ذمّہ دار لوگ یہاں موجود ہوں تو مالیات پورے کے پورے ان کے حوالے کر دوں۔ میں نہ جماعت کا سرمایہ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہوں نہ بک ڈپو کو بہ راہِ راست اپنے ہاتھ میں رکھنا پسند کرتا ہوں۔ اور نہ میں اس بات ہی کو صحیح سمجھتا ہوں کہ جماعت کے سرمایہ کو تنہا اپنی صواب دید پر خرچ کروں۔ لیکن مجھے بتائیے کہ وہ کون سے ذمہ دار لوگ ہیں، جو یہاں میرے ساتھ شریک کار بن کر رہنے کو تیار ہیں۔ رہے پچھلے

حسابات تو میں آج سے نہیں تقریباً سال ڈیڑھ سال سے کہہ رہا ہوں کہ کوئی آدمی کام سنبھالنے والا دیجیے میں شاہ صاحب کو الگ کرنے کے لیے تیار ہوں، مگر جو لوگ مجھ پر نکتہ چینی کرتے ہیں، نہ انھوں نے خود کام سنبھالا اور نہ کوئی آدمی دیا۔ اب آپ مجھے کوئی آدمی دیں، میں ابھی شاہ صاحب کو رخصت کیے دیتا ہوں۔ میں ان کی خطاؤں سے واقف ہونے کے باوجود، ان کو صرف اس لیے الگ نہ کرسکا کہ ان کی جگہ کسی اناڑی آدمی کو رکھتا تو دوسری بار اتنا ہی نقصان ہوتا جتنا اب ہو رہا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ قریبی تاریخوں میں جماعت کا ایک اجتماع کرلیا جائے اور اس میں پوری صورت حال پیش کردی جائے۔ بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ میری اور آپ کی یہ تحریریں بھی پوری جماعت کے سامنے رکھ دی جائیں۔

بنام: محمد منظور نعمانی صاحب ابوالاعلیٰ

نوٹ: اس خط کے سلسلے میں چند تشریحات ضروری ہیں، جو ذیل میں کی جارہی ہیں:

مولانا منظور نعمانی صاحب جماعت اسلامی کے اولین ارکان میں سے تھے۔ ابتدا میں جو نقشہ کار جماعت اسلامی نے بنایا تھا اس میں ایک ایسے مرکز کا قیام تھا، جو تحریک اسلامی کی علمی، فکری اور دینی رہ نمائی کرسکے اور ملک میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کا مرکز بن جائے۔ اس سلسلہ میں طے ہوا تھا کہ جماعت کے سربرآوردہ لوگ اس مرکز میں منتقل ہوجائیں گے اور وہیں سے تحریک کی رہ نمائی کریں گے۔ مولانا منظور نعمانی صاحب بھی ان لوگوں میں سے تھے جن کو اس مرکز میں منتقل ہونا تھا۔ مولانا مودودی صاحب اس فیصلہ کے فوراً بعد دارالاسلام منتقل ہوگئے لیکن مولانا منظور صاحب نے منتقلی کی بہ جائے صرف چند دن کے لیے مرکز میں قیام کیا اور ان (تقریباً) دو ہفتوں کے قیام کے بعد (واضح رہے کہ ان دنوں میں بھی مسلسل بارش ہوتی رہی تھی اور بالکل جھڑی لگی ہوئی تھی) آپ نے اپنے خیال میں تمام حالات کا ''جائزہ'' لے کر مولانا مودودی صاحب اور جماعت سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کردیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے مولانا مودودی صاحب کو ایک خط لکھا، جس میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ اس خط میں مولانا منظور نعمانی صاحب کا استدلال یہ تھا۔

۱- آپ کی زندگی ایسی متقیانہ اور پرہیزگارانہ نہیں ہے، جو آپ کے منصب کے مناسب ہو۔ نیز آپ میں تواضع و مواسات اور مساوات وغیرہ اخلاق حمیدہ کی بھی کمی ہے۔

۲- آپ کی معاشرت و معیشت کا معیار نہایت بلند ہے اور اس سے مختلف مفاسد کا اندیشہ ہے۔ مثلاً:

(ا) تحریک سے متاثر ہو کر اعلیٰ معیار زندگی کو ترک کر کے آنے والے بددل ہو جائیں گے۔

(ب) غرب میں احساس کم تری پیدا ہوگا۔

(ج) آپ میں نہیں تو آپ کے گھر والوں میں احساس برتری پیدا ہوگا۔

(د) اس غلط معیار زندگی کا نتیجہ ہے کہ آپ نے ایک دفعہ اپنے ایک مخلص دوست کے اعتراض کے جواب میں کہا کہ اگر میں یہ معیار قائم نہ رکھوں تو میری بات کا وزن نہیں رہے گا۔

۳- آپ میں انتظامی قابلیت نہیں ہے۔

۴- آپ کے پیش نظر لٹریچر کی اشاعت، ایک اعلیٰ دارالمصنفین اور ایک اعلیٰ دارالعلوم کے قیام کے سوا اور کچھ نہیں۔ (اگرچہ یہ بھی غنیمت ہے) اس سے آگے نہ آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں اور نہ کرنے کی استعداد رکھتے ہیں۔

۵- مالی معاملات میں آپ کما حقہ، سوجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ دوسرے جس طرح چاہتے ہیں خرد برد کرتے ہیں مگر آپ حالات کو کنٹرول نہیں کر سکتے۔ پریس وغیرہ کی خرید میں بھی آپ نے سخت دھوکہ کھایا ہے اور ایک ناکارہ پریس خرید لیا ہے وغیرہ۔

ان حالات میں مولانا منظور نعمانی صاحب کا استدلال یہ تھا:

- ان کی نگاہ میں مودودی صاحب اس کام کو کرنے کے اہل نہیں
- اور خود وہ اس بارِ گراں کے تحمل کی استعداد نہیں رکھتے۔ اس لیے بہتری کی کوئی صورت نہیں۔

ان حالات کا نتیجہ تھا کہ قیام کے بعد ہی جماعت اسلامی ایک شدید انتشار سے دوچار ہوگئی۔ مولانا مودودی صاحب کا یہ خط منظور نعمانی صاحب کے مذکورہ بالا خط کا جواب ہے اور ایک تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ خط کی مستند تلخیص یہاں دے دی گئی ہے تاکہ جواب کو سمجھنے میں آسانی ہو اور ان کا نقطۂ نظر بھی سامنے آجائے۔

مولانا منظور نعمانی صاحب کو اس خط کا چھپنا ناپسند تھا اور وہ شروع ہی سے اسے چھاپنے سے منع کرتے رہے ہیں لیکن گزشتہ دنوں اپنی ایک سرگزشت میں (مطبوعہ الفرقان) انھوں نے کہیں اشاروں میں اور کہیں تفصیل کے ساتھ اس کے مندرجات کا ذکر کیا ہے، ان حالات میں یہ

مناسب معلوم ہوا کہ ہم اس کو چھاپ دیں۔ مولانا موصوف نے اس خط کی اشاعت کی اجازت بھی دے دی ہے۔

یہ ایک تاریخی خط ہے، جو ملت کی امانت ہے اور اس سے اسے محروم رکھنا کسی طرح درست نہیں۔ ہم یہ خط ایڈیٹر چراغ راہ کراچی کے مندرجہ بالا نوٹ اور شکریہ کے ساتھ یہاں شامل اشاعت کر رہے ہیں۔ (ا۔گ)

(۱۳)

اچھرہ، لاہور

۳۰/مارچ ۱۹۵۱ء

محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ مجھے ۲۳/مارچ کو وصول ہوا۔ عدیم الفرصتی کے سبب سے جلدی جواب نہ دے سکا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم سے میرے تعلقات کوئی بہت زیادہ وسیع تو نہ تھے۔ البتہ قلبی حیثیت سے گہرے ضرور تھے۔ میں جب حیدر آباد سے رسالہ ترجمان القرآن نکالا کرتا تھا، اس زمانے میں مجھے خبر تک نہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب مجھ سے واقف ہیں مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ برابر اس رسالہ کو منگوا کر میرے مضامین دل چسپی کے ساتھ پڑھوا کر سنتے رہتے تھے۔ مجھے پہلی مرتبہ ان کی دل چسپی کا علم اس وقت ہوا جب ۱۹۳۷ء کے آغاز میں ان کا عنایت نامہ مجھے ملا، جس میں انھوں نے اس خواہش کا اظہار فرمایا تھا کہ میں حیدر آباد چھوڑ کر پنجاب چلا آؤں اور لاہور میں رہ کر فقہ اسلامی کی تدوینِ جدید میں ان کے ساتھ تعاون کروں۔ اس کے بعد کچھ مراسلت شروع ہوئی اور ۳۷ء کے آخر میں لاہور آ کر دو تین مرتبہ ان سے ملا۔ ان ملاقاتوں میں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میری اور ان کی بہت پرانی واقفیت ہے اور ہم ایک دوسرے کے دل سے بہت قریب ہیں۔ یہاں میرے اور ان کے درمیان یہ بات طے ہوگئی کہ میں پنجاب منتقل ہو جاؤں اور پٹھان کوٹ کے قریب اس وقف کی عمارات میں جس کا نام ہم نے بالاتفاق "دارالاسلام" تجویز کیا تھا، ایک ادارہ قائم کروں جہاں دینی تحقیقات اور تربیت کا کام کیا جائے۔ انھوں نے مجھ سے وعدہ فرمایا کہ میرے وہاں منتقل ہو جانے کے بعد وہ بھی، ہر سال چند مہینے وہاں آ کر قیام فرمایا کریں گے۔ چناں چہ اس قرار داد کے مطابق میں نے حیدر آباد جا کر ہجرت کی تیاریاں شروع کر دیں اور

مارچ ۳۸ء میں نقل مقام کر کے دارالاسلام پہنچ گیا۔ مگر افسوس کہ مرحوم کی زندگی کے وہ آخری ایام تھے دوسرے ہی مہینہ ان کا انتقال ہوگیا اور میں اس کام کے لیے تنہا رہ گیا جسے ان کے ساتھ مل کر کرنا چاہتا تھا۔

بس یہ میرے اور ان کے تعلقات کی مختصر داستان ہے۔

رحم اللہ علیہ۔ خاکسار

ابوالاعلیٰ

چند مزید توضیحات

سوالات

(۱) کیا یہ صحیح ہے کہ علامہ اقبال مرحوم لاہور میں آپ کی تشریف آوری کا سبب بنے تھے۔

(۲) اور وہ کون سے تاثرات اور دواعی تھے جن کی بنا پر علاّمہ مرحوم نے آپ کو پنجاب میں آنے کی دعوت دی تھی۔

(۳) کیا آپ کو علامہ مرحوم کے ساتھ کبھی تبادلۂ خیالات کا موقع بھی ملا تھا۔ بالمشافہ یا کسی اور طریق سے۔ یا نہ؟ علامہ مرحوم کو آپ کے نظریۂ حیات اور تشریح وتعبیر سے کس حد تک دل چسپی تھی یا آپ کو مرحوم کے پیغام سے کہاں تک دل چسپی ہے؟ آپ کے نزدیک مرحوم کا آخری پیغام کیا ہے؟

جوابات

(۱) جی ہاں، میں پنجاب سے کوئی دل چسپی نہ رکھتا تھا۔ بلکہ یہاں کی صحافت اور سیاست اور مذہبی مناظرہ بازیوں کا رنگ دیکھ کر دور ہی سے اتنا بدگمان تھا کہ پنجاب آنا پسند بھی نہ کرتا تھا۔ مگر ۱۹۳۶ء کے اواخر میں ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مجھے توجہ دلائی کہ دکن کو چھوڑ کر پنجاب میں قیام کروں۔ پہلی نگاہ میں تو مجھے اس تجویز نے کچھ زیادہ متاثر نہ کیا۔ مگر جب ۱۹۳۷ء کے اواخر میں میں نے دکن چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا اور کسی دوسرے مستقر کی تلاش میں حیدر آباد سے نکلا تو مرحوم سے مشورہ کرنے کے بعد مجھے اطمینان ہوگیا کہ آئندہ میرے لیے پنجاب ہی میں قیام کرنا زیادہ مناسب ہے۔

(۲) اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں پہلے بھی یہ نہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم مجھ سے واقف ہیں۔ یہ بات لاہور آکر مجھے معلوم ہوئی کہ وہ ترجمان القرآن کا بڑی دل چسپی کے ساتھ مطالعہ فرمایا کرتے تھے۔

(۳) جی ہاں۔ مگر بہت کم۔ ۱۹۳۶ء کے اواخر میں جیسا کہ اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ پہلی مرتبہ ان کا نوازش نامہ آیا تھا اس کے بعد کچھ تھوڑی سی مراسلت ہوتی رہی۔ پھر ۱۹۳۷ء کے اواخر میں لاہور آیا اور یہاں صرف دو مرتبہ ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد میں یہ فیصلہ کر کے حیدر آباد واپس چلا گیا کہ جلدی سے جلدی پنجاب منتقل ہو جاؤں۔ چناں چہ مارچ ۳۸ء میں مستقل طور پر ہجرت کر کے پنجاب آیا اور ابھی دم بھی نہ لینے پایا تھا کہ اپریل میں مرحوم اپنے رب سے جا ملے۔

مجھے جس حد تک معلوم ہوا ہے مرحوم میرے خیالات سے بڑی حد تک متفق تھے۔ اور ترجمان القرآن کے مضامین کی تحسین وتصویب فرماتے رہتے تھے۔ رہا میں ــــ تو میرے نزدیک وہ اکابر مفکرین اسلام میں سے تھے۔ اور انھوں نے خصوصیت کے ساتھ شعر کی طاقت سے اسلام کی خدمت سرانجام دینے میں بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

آپ کا یہ سوال کہ ان کا آخری پیغام کیا ہے؟ میرے نزدیک کچھ عجیب سا ہے! اگر پیغام دینے والا خود بھی ظاہر نہ کر سکا ہو کہ اس کا پیغام کیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ میرے نزدیک تو ان کا پیغام ان کے آخری زمانہ کے کلام میں بالکل واضح ہے۔

والسّلام

خاکسار

ابوالاعلیٰ

(بشکریہ چٹان لاہور)

(۱۴)

دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور، ۶۱ء

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

ہندستان کے ایک شہر جبل پور میں ۱۱/اور ۱۴/فروری ۶۱ء کے درمیانی عرصہ میں وہاں

کے بے بس مسلمانوں پر، جو حادثہ گزر رہا ہے، امید ہے کہ اس کی خبریں آپ کے کانوں تک پہنچ چکی ہوں گی۔ ہمارے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ ہمارے عرب بھائیوں کو ان واقعات کی خبر نہ ہوئی ہوگی۔ ہندستان کے دارالحکومت دہلی میں عرب سفارت خانے قائم ہیں اسی طرح دہلی بمبئی اور دوسرے بڑے شہروں میں عرب اخبارات کے نمائندے بھی موجود ہیں ان واقعات کی مفصل روداد یں پاکستان کے اخبارات میں شائع ہوئی ہیں بلکہ پاکستان کے عوام نے ہر جگہ ان واقعات پر احتجاج کیا ہے اور یہاں بھی تمام عرب ممالک کے سفارت خانے موجود ہیں۔ لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے ابھی تک نہ کسی عرب حکومت نے ان واقعات کے خلاف کوئی احتجاج کیا ہے اور نہ کسی عرب اخبار ہی نے ان پر افسوس و مذمّت کا کوئی حرف لکھا ہے بلکہ ان واقعات کی خبریں تک عربی اخبارات میں نہیں آئی ہیں کجا کہ حکومت ہند سے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کا اور ان مظالم کے انسداد کا مطالبہ کیا جاتا ہے، جو تقسیم ملک کے بعد سے مسلسل وہاں کے مسلمانوں پر توڑے جارہے ہیں۔ عرب بھائیوں کی طرف سے یہ بڑی افسوس ناک روش سامنے آرہی ہے، جو ہندستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے مسلمانوں میں اپنے ناگوار اثرات چھوڑے بغیر نہیں رہ سکتی۔

ہمارے عرب بھائی غیر عرب مسلمانوں سے تو یہ چاہتے ہیں کہ وہ فلسطین، الجزائر، بریمی اور دوسرے مسائل میں ان کی ہر طرح کی تائیدیں کریں، لیکن دوسرے مسلمانوں پر اگر قیامت بھی ٹوٹ پڑے تو وہ خود ہم دردی کا ایک کلمہ اور احتجاج و مذمت کا ایک لفظ تک زبان سے نکالنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ہمارا خیال ہے کہ عرب بھائی ہندستان میں رونما ہونے والے فسادات کے بارے میں یہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں کہ اگر ان کے متعلق انھوں نے حکومت ہند کی مسلم کش کارروائیوں کے خلاف کوئی احتجاج کیا تو ان کی یہ دوست حکومت ناراض ہوجائے گی۔ کیا اسی اساس پر پاکستانی مسلمانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بھی جواب میں ایسا ہی نقطۂ نظر اختیار کرلیں اور یہ سوچنے لگیں کہ اگر الجزائر کے مسئلہ میں انھوں نے عرب بھائیوں کی تائید کی تو فرانس بگڑ جائے گا، قضیۂ فلسطین پر ان کا ساتھ دیا تو اسرائیل بلکہ دنیا بھر کے یہودیوں کی ناراضی مول لینی پڑے گی، جن کا اثر و نفوذ ساری دنیا میں اور خاص طور پر امریکہ میں جتنا کچھ پایا جاتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ بریمی کے معاملہ میں ان کی حمایت کی تو انگریز کو ناگوار گزرے گا۔ لیکن ہم ان تمام

باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ ہمارے سامنے وہ دینی رشتہ ہے، جو ہمیں عربوں کے ساتھ مربوط کیے ہوئے ہے اور جو ہر دوسرے رشتہ سے زیادہ مضبوط ہے۔ ہم بہ ہر حال اپنے ملکی اور قومی مفادات کو اہمیت دیئے بغیر عربوں کے ہر قضیہ میں ان کی حمایت کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ لیکن ہمیں تعجب ہے کہ عرب آخر ان تمام وحشیانہ مظالم پر کیوں چپ سادھے ہوئے ہیں، جو ان کی آنکھوں کے سامنے حکومت ہند وہاں کی مسلم اقلیت پر مسلسل توڑ رہی ہے۔ یہ صورت حال کئی سالوں سے مشاہدے میں آ رہی ہے وہ مصر جس کو اب تک ہم سے شکایت ہے کہ پاکستان کے ایک سابق وزیر اعظم سہروردی صاحب نے، نہ کہ پاکستان کے عوام نے قضیۂ سوئز میں اس کی حمایت نہیں کی۔ آج جبل پور کے مسلمانوں پر ہندوؤں کے ہاتھوں بے پناہ مظالم ڈھائے جانے پر بھی کیوں شرم ناک خاموشی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

میں ان گزارشات کے ساتھ جبل پور کے مظالم کی مختصر روداد بھیج رہا ہوں، جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ وہاں کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ہاتھوں کن شرم ناک وحشیانہ دراز دستیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یہ تمام تفصیلات میں آپ کو خاص طور پر اس لیے بھیج رہا ہوں کہ سعودی عرب اور دوسرے کسی عرب ملک میں آپ کے سوا مجھے کوئی ایسا آدمی نظر نہیں آتا، جو اس معاملے کی اہمیت کو سمجھے اور اس کے متعلق کوئی عملی اقدام کرے اور اس طرح عدل وانصاف اور اپنے ہندی بھائیوں کے ساتھ دینی رشتہ کے تقاضوں کو پورا کرے۔ اگر میں اس کے متعلق بہ راہ راست کسی عرب ملک کے اخبار کو کچھ لکھوں، تو مجھے یہ بھی توقع نہیں کہ وہ اس آواز پر کان دھرے اور اسے اپنے صفحات میں جگہ دے گا۔

اس کا سب سے تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ بلادِ عرب اور بلاد ہند و پاکستان کے مسلمانوں کے درمیان اگر موجودہ روش برقرار رہی تو دیر یا سویر اس کا اِدھر کے مسلمانوں میں بھی لازماً بر اردِ عمل رُونما ہوگا، اور اخوت اسلامی کے رہے سہے جذبات بھی ماند پڑتے چلے جائیں گے۔ کیا وہ وقت بہت پسندیدہ ہوگا جب ہر مسلمان ملک بس اپنے ہی مفاد کو دیکھتا رہے اور ایک پر کوئی آفت آئے تو دوسرے ٹس سے مس نہ ہوں۔

والسلام

ابوالاعلیٰ

بہ خدمت محترم محمد احمد ہاشمیل صاحب
سیکریٹری ہیئۃ امر بالمعروف مکہ معظّمہ
سنٹرل جیل لاہور
۱۸/اگست ۵۳ء

عزیزم! السلام علیکم

مجھے خطوط مل تو جاتے ہیں مگر میرا جواب مکتوب الیہ تک نہیں پہنچنے دیا جاتا اور ویسے بھی مجھ کو پندرہ دن میں صرف ایک خط لکھنے کی اجازت ہے اس لیے مجھ سے مراسلت کرنا بے فائدہ ہے ــــ جب تک میں قید میں ہوں آپ کے کچھ زیادہ کام نہیں آسکتا۔

آپ نے اپنے مطالعہ کا جو پروگرام لکھا ہے وہ مناسب ہے۔ آگے اپنے ہی اجتہاد سے اپنا راستہ بنائیے۔ کام کرتے کرتے خود بہ خود ترقی کرتے چلے جائیں گے۔ میں صرف تین چار باتوں کا آپ کو مشورہ دینا کافی سمجھتا ہوں۔

(۱) اپنے مطالعہ کو زیادہ سے زیادہ وسیع کیجئے اور ہر چیز کے متعلق کچھ نہ کچھ واقفیت پیدا کر لیجئے۔

(۲) مطالعہ کے دوران میں اپنی قوت تنقید کو ہر وقت بیدار رکھئے تا کہ صحیح اور غلط میں امتیاز کرتے رہیں اور کام کی باتیں چن لیں۔

(۳) اپنی ایک بنیادی فکر ذہن میں محفوظ رکھئے تا کہ تمام معلومات اسی نیوکلس کے گرد جمع ہوتی رہیں۔

(۴) کسی ایک شعبۂ علم کو انتخاب کر لیجیے جس میں آخر کار آپ کو مہارت پیدا کرنی ہو۔

آپ کے والد صاحب کی خرابیِ صحت کا حال معلوم کر کے افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ انھیں صحت عطا فرمائے۔

ابوالاعلیٰ

بنام خورشید احمد صاحب کراچی

علم وادب کا مخزن

مولانا مودودی علم وادب، فکر و تحقیق اور عمل و جہد ہر میدان کے شہسوار ہیں۔ وہ ایک نظامِ حیات کے داعی اور مبلغ ہیں۔ اس دور میں جب کہ اس نظام کی کوئی مثالی صورت نافذ نہیں ہے، وہ اس کے علم بردار ہیں۔ اس دور میں جب کہ روشن خیالی نے مذہب کو ایک قدیم چیز اور ہر قدیم کو از کار رفتہ شے سمجھ کر رد کر رکھا ہے وہ مذہبی بنیادوں پر ایک نظام فکر و عمل لے کر اُٹھے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں سب سے کٹھن کام یہی ہے کہ کوئی شخص مذہب کا حامی اور علم بردار ہو۔ اور پھر ان میں بھی اسلام کو لے کر اٹھے، جس کے خلاف جدید یورپ نے تعصب اور تنگ دلی کو اپنے اسلاف سے ورثے میں پایا ہو اور مولانا مودودی کو یہ نظام فکر جن لوگوں کے سامنے اور درمیان اور مقابلے میں پیش کرنا ہو ان کے نزدیک مغرب سے آئی ہوئی ہر شے وحی والہام ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا مودودی کو اسلام بہ طور ایک نظام حیات کے پیش کرتے ہوئے سخت ذہنی اور عقلی رکاوٹوں سے واسطہ پیش آتا رہا ہے، جو ذہنی اور عقلی سے بڑھ کر مغرب کی مرعوبیت پر مبنی ہوتی رہی ہیں۔ پھر انھیں ان لوگوں کی مخالفتوں اور اعتراضات سے بھی واسطہ پڑا جو مذہب کے قدیم علم بردار چلے آرہے تھے اور جنھوں نے مذہب کی ایک متحجر شکل کو اپنے حلقے میں محفوظ اور مرتب کر کے اسی کے گرد اپنے حصارِ عقیدت کی فصیل بنادی تھی اور جسے دنیا کے وسیع تر مسائل سے کوئی دل چسپی نہ تھی جو قیصر کا قیصر کو اور خدا کا خدا کو دینے کے اصول پر دین و دنیا کا علیحدہ علیحدہ دائرہ کھینچ کر بیٹھ گئے تھے اور دنیا داروں کی ایک حقیر سی نیکی پر انھیں بخشوانے کا اطمینان دلانے پر مامور ہو گئے تھے یا کم از کم دین کو انھوں نے اس بات پر مطمئن کر لیا تھا کہ وہ

زندگی کے دوسرے مسائل پر غالب آنے کی تمنا نہ کرے۔اس لیے کہ کافروں اور خود دین کے بعض پیرووں کو یہ ناگوار گزرتا تھا۔

ایسی صورت حال میں جو شامت کا مارا بھی اپنا فرض ایمانی سمجھ کر اسلام کو پوری متاعِ زندگی پر غالب کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو ظاہر ہے کہ اس کی ہر حرکت دوسروں کو کتنی کچھ ناگوار نہ ہوگی۔ جھنجھلا جھنجھلا کر اعتراض کرنے والے، سوالات اٹھانے والے، الزامات لگانے والے، بہتانات تراشنے والے اور مزاحمتیں کرنے والے کتنے ہی پیدا ہو جائیں گے۔ مولانا مودودی کو ان سب اقسام کے حضرات سے پالا پڑا ہے۔ دین کے قدیم علم برداروں نے اعتراضات اٹھائے اور عقلیت کے فریب میں آئے ہوئے دنیاداروں نے اعتراضات اٹھائے اور ان سب اعتراضات کا مقابلہ مولانا مودودی کو ذہنی میدان میں بھی کرنا پڑا اور عملی میدان میں بھی۔

مولانا مودودی کا سب سے پہلا فرض یہ تھا کہ وہ جس فکر کے داعی ہیں اور جس نظامِ حیات کے علم بردار ہیں، اس نظامِ حیات کا گوشہ گوشہ نمایاں واضح کریں، اور کوئی چیز بھی مبہم نہ چھوڑیں۔ مولانا مودودی نے حقیقت یہ ہے کہ اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ پھر ان کا یہ بھی فرض تھا کہ دنیا کے چلتے ہوئے نظاموں کی کم زوریاں اسلام کے مقابلے میں واضح کریں اور جن نظریات پر دنیا مٹی جا رہی تھی اور دور جدید کی پیداوار سمجھ کر ان پر شیدا تھی، انھیں اسلام کے مقابلے میں ناقص اور نقصان دہ ثابت کریں۔ انھوں نے یہ بھی ثابت کیا اور حق یہ ہے کہ اس کا بھی حق ادا کر دیا۔ یہ سارا کام انھوں نے تقریباً تیس سال کے عرصے میں کیا ہے۔ اب تک کیے جا رہے ہیں۔ چناں چہ ہر موضوع پر ان کے مدلل مضامین کا ایک بیش بہا خزانہ موجود ہے۔ ان کا تیار کیا ہوا لٹریچر علم و ادب اور فکر و تحقیق کا ایک خزانہ بلکہ ایک کان ہے کہ جس میں بڑے بڑے قیمتی گوہر موجود ہیں۔

میں نے اس نقطۂ نظر سے جب مولانا کے علمی اور ادبی ذخیرے کا جائزہ لیا تا کہ اس میں غوطہ زن ہو کر اس میں سے قیمتی قیمتی جواہر چن کر قارئین کے سامنے رکھوں اور ان کو مولانا کے فکری عجائب خانہ کا نوادرات سے متعارف کراؤں تو حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنے آپ کو اس مقام پر آ کر بڑا ہی بے بس محسوس کیا۔ وہ جو ایک بات سنتے آئے تھے کہ ؎

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

وہی معاملہ میرے ساتھ پیش آیا، مجھے توقع نہ تھی کہ میں کتاب کے اس باب میں آکر اس پریشانی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ لٹریچر کے ایک سرسری مطالعے کے بعد جب میں نے اپنے نشان زدہ اقتباسات کا جائزہ لیا تو وہ خود ایک علیحدہ کتاب کی ضخامت رکھتے تھے جب کہ ان اقتباسات کے انتخابات میں بھی مجھے برابر یہ احساس رہا تھا کہ مجھے مولانا پر ایک مختصر کتاب تیار کرنا ہے اور اس مختصر کتاب کا بھی یہ ایک نہایت مختصر باب ہونا چاہیے۔

یہ باب جو، میں نے ان اقتباسات میں سے صرف ایک چوتھائی لے کر مرتب کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ میرے نزدیک یہ کتنا کچھ تشنہ ہو سکتا ہے۔ پھر بھی میں نے کوشش کی ہے کہ مولانا کے علم و ادب اور فکر و تحقیق کے چمن میں سے ایک ایسا گل دستہ مرتب ہو جائے جو مختلف مسائل پر ان کے نظریات کی ایک بڑی حد تک نمائندگی کر سکے۔ مولانا کو اپنی دعوت اور مشن کے پیش نظر سب سے زیادہ دینیات، اجتماعیات اور سیاسیات پر لکھنا پڑا ہے۔ چناں چہ ان موضوعات پر چھانٹی کے باوجود اقتباسات دوسرے عنوانات کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ باقی میں نے نظریات، اخلاقیات، عمرانیات، معاشیات اور تعلیمات کے موضوعات پر اقتباسات جمع کر دیے تاکہ ان موضوعات پر بھی مولانا کا نکتۂ نظر سامنے آجائے۔

موضوع چاہے کوئی بھی ہو مولانا کا فکری محور اسلام کا نظریۂ زندگی ہی رہتا ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنی زندگی کو اسی کے لیے وقف کیا ہے کہ اس دور جدید میں اسلام کو جدید ذہنوں کے لیے جدید مسائل کی روشنی میں جدید تقاضوں کے مطابق نکھار کر پیش کریں اور صرف پیش ہی نہ کریں بلکہ ان کا قابل عمل ہونا بھی ثابت کریں اور یہ ثبوت صرف عقلی اور علمی ہی نہ ہو بلکہ عملی بھی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا مودودی گزشتہ ۷ ابرس سے، اسلامی نظام حیات کو بالفعل برپا کرنے کے لیے مسلسل اجتماعی کوشش کر رہے ہیں اور یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے جو انھیں تاریخ میں اکابر ملت کے درمیان ہمیشہ نمایاں جگہ دے گا۔ اب میں ترتیب وار مختلف موضوعات پر وہ اقتباسات پیش کرتا ہوں جو میں نے مولانا مودودی کے لٹریچر میں سے اخذ کیے ہیں۔

دینیات

• فہم قرآن • سنتِ رسولؐ • تجدد اور تجدید • الامام المھدی • فتنۂ تکفیر • مسلم • عبادت کا وسیع مفہوم۔

فہمِ قرآن

''آدمی قرآن کی روح سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا۔ جب تک کہ وہ عملاً وہ کام نہ کرے، جس کے لیے قرآن آیا ہے۔ اسے تو پوری طرح آپ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اس طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزول قرآن کے وقت پیش آئے تھے۔ مکے اور حبش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر و احد سے لے کر حنین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا، منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے اور سابقین اولین سے لے کر مؤلفۃ القلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ لیں گے اور برت بھی لیں گے۔ یہ ایک اور ہی قسم کا ''سلوک'' ہے، جس کو میں ''سلوک قرآنی'' کہتا ہوں۔ اس سلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گزرتے چلے جائیں گے قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آکر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اس منزل میں اتری تھیں اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔ اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لغت اور نحو اور معانی اور بیان کے کچھ نکات سالک کی نگاہ سے چھپے رہ جائیں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی روح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بخل برت جائے۔''

(مقدمہ تفہیم القرآن ص: ۳۳،۳۴)

سنتِ رسولؐ

''نبی ﷺ نے بعثت سے رحلت تک تقریباً ربع صدی کا جو زمانہ بسر کیا وہ محض قرآن پڑھنے اور سنانے ہی میں بسر نہیں ہوا ہوگا۔ بلکہ آپ تلاوت آیات کے علاوہ بھی شب و روز اپنے

دین کی تبلیغ فرماتے رہتے ہوں گے۔ گم راہ لوگوں کو سمجھانے کی کوشش بھی فرماتے ہوں گے، ایمان لانے والوں کو تعلیم بھی دیتے ہوں گے اور اپنی عبادات، اپنے اخلاق اور اپنے اعمال حسنہ کا نمونہ پیش کر کے لوگوں کی تربیت اور اصلاح کرنے میں مشغول رہتے ہوں گے، خود قرآن میں فرمایا گیا ہے:

يَتْلُوا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّالَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ:۱۵۱)

نیز قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ معلمانہ زندگی ایسی شدید مصروفیت میں بسر ہوتی تھی کہ آپ کو اپنے آرام کا ذرّہ برابر خیال نہ تھا۔ ہر لمحہ یا تو عبادات میں بسر ہوتا تھا یا وعظ و نصیحت اور تعلیم حکمت اور تزکیۂ نفوس میں۔ حتیٰ کہ بار بار اللہ تعالیٰ آپ سے فرماتا تھا کہ آپ اس قدر محنت کیوں کرتے ہیں؟ اپنے آپ کو ہلاک کیوں کیے ڈالتے ہیں؟ اب کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایسی سرگرم مبلّغانہ زندگی میں آیاتِ قرآنی کے سوا کوئی بات بھی آپ کی زبان سے نہ نکلتی تھی، جو یاد رکھنے اور بیان کرنے کے قابل ہوتی؟ کوئی کام بھی آپ کی زندگی کا ایسا نہ تھا جس کو لوگ اپنے لیے نمونہ سمجھتے اور دوسروں کو اس پاکیزہ نمونہ کی تقلید کا مشورہ دیتے۔ آپ کے اقوال و اعمال کے متعلق تو اہل ایمان کا اعتقاد تھا اور قرآن نے بھی ان کو یہی اعتقاد رکھنے کا حکم دیا تھا کہ آپ کا ہر اشارہ حق ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (النجم:۱) اور آپ کا ہر عمل واجب التقلید ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ ظاہر ہے کہ یہ اعتقاد رکھتے ہوئے تو مسلمان یقیناً آں حضرت ﷺ کے ہر ارشاد کو دل سے سنتے ہوں گے، ہر عمل پر نگاہ رکھتے ہوں گے اور آپس میں ایک دوسرے کے سامنے حضورؐ کے اقوال و اعمال کے چرچے کرتے ہوں گے۔ جہاں رسالت یا کسی قسم کے تقدّس کا اعتقاد نہیں ہوتا وہاں بھی بڑے لوگوں کی باتوں اور حرکات و سکنات پر لوگ نظر رکھتے ہیں اور ان کے اقوال و اعمال کے چرچے کیا کرتے ہیں۔ پھر کیوں کر ممکن تھا کہ صحابہ کرام جس مقدس انسان کو خدا کا رسولؐ اور اسلام کا مکمل نمونہ سمجھتے تھے اس سے صرف قرآن لے لیتے اور اس کے دوسرے تمام ارشادات اور اس کے تمام اعمال کی طرف سے کان اور آنکھیں بند کر لیتے۔'' (تفہیمات اوّل ص:۲۷۱)

تجدّد اور تجدید

''عموماً لوگ تجدد اور تجدید میں فرق نہیں کرتے اور سادہ لوحی سے ہر متجدّد کو مجدد کہنے لگتے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو نیا طریقہ نکالے اور اس کو ذرا زور سے چلا دے وہ مجدد ہوتا ہے۔ خصوصاً جو لوگ کسی مسلمان قوم کو برسر انحطاط دیکھ کر اس کو دنیوی حیثیت سے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے زمانہ کی برسرِ عروج جاہلیت سے مصالحت کر کے اسلام اور جاہلیت کا ایک نیا مخلوط تیار کر دیتے ہیں یا فقط نام باقی رکھ کر اس قوم کو پورے جاہلیت کے رنگ میں رنگ دیتے ہیں ان کو مجدّد کے خطاب سے نواز دیا جاتا ہے حالاں کہ وہ مجدّد نہیں ہوتے اور ان کا کام تجدید نہیں تجدّد ہوتا ہے۔ تجدید کا کام اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ جاہلیت سے مصالحت کی صورتیں نکالنے کا نام تجدید نہیں ہے اور نہ اسلام اور جاہلیت کا کوئی نیا مرکب بنانا تجدید ہے بلکہ دراصل تجدید کا کام یہ ہے کہ اسلام کو جاہلیت کے تمام اجزا سے چھانٹ کر الگ کیا جائے اور کسی نہ کسی حد تک اس کو اپنی خالص صورت میں پھر سے فروغ دینے کی کوشش کی جائے۔ اس لحاظ سے مجدد جاہلیت کے مقابلے میں سخت غیر مصالحت پسند آدمی ہوتا ہے اور کسی خفیف سے خفیف جز میں بھی جاہلیت کی موجودگی کا روادار نہیں ہوتا۔'' (تجدید واحیائے دین ص:۲۸)

الامام المہدی

''مسلمانوں میں جو لوگ الامام المہدی کی آمد کے قائل ہیں، وہ بھی ان متجددین سے جو اس امر کے قائل نہیں ہیں اپنی غلط فہمیوں میں کچھ پیچھے نہیں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امام مہدی کوئی اگلے وقتوں کے مولویانہ وصوفیانہ وضع قطع کے آدمی ہوں گے۔ تسبیح ہاتھ میں لیے یکا یک کسی مدرسے یا خانقاہ کے حجرے سے برآمد ہوں گے۔ آتے ہی انا المہدی کا اعلان کریں گے، علماء اور مشائخ کتابیں لیے ہوئے پہنچ جائیں گے اور لکھی ہوئی علامتوں سے ان کے جسم کی ساخت وغیرہ کا مقابلہ کر کے انھیں شناخت کریں گے۔ پھر بیعت ہوگی اور اعلانِ جہاد کر دیا جائے گا۔ چلے کھینچے ہوئے درویش اور سب پرانے طرز کے بقیۃ السلف ان کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے، تلوار تو محض شرط پوری کرنے کے لیے برائے نام چلانی پڑے گی۔ اصل میں سارا کام برکت اور

روحانی تصرف سے ہوگا۔ پھونکوں اور وظیفوں کے زور سے میدان جیتے جائیں گے۔ جس کافر پر نظر ماریں گے تڑپ کر بے ہوش ہو جائے گا اور محض بد دعا کی تاثیر سے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں میں کیڑے پڑ جائیں گے۔ عقیدۂ ظہور مہدی کے متعلق عام لوگوں کے تصورات کچھ اسی قسم کے ہیں مگر میں جو کچھ سمجھا ہوں اس سے مجھ کو معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانے میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا۔ وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی، زندگی کے سارے مسائل مہمہ کو وہ خوب سمجھتا ہوگا، عقل و ذہنی ریاست، سیاسی تدبّر اور جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکّہ جما دے گا اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ کر جدید ثابت ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی جدّتوں کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کریں گے۔ پھر مجھے یہ بھی امید نہیں کہ وہ اپنی جسمانی ساخت میں عام انسانوں سے کچھ بہت مختلف ہوگا کہ اس کی علامتوں سے اس کو تاڑ لیا جائے۔ نہ میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے مہدی ہونے کا اعلان کرے گا بلکہ شاید اسے خود بھی اپنے مہدی موعود ہونے کی خبر نہ ہوگی اور اس کی موت کے بعد اس کے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہوگا کہ یہی تھا وہ خلافت کو منہاج النبوۃ پر قائم کرنے والا تھا، جس کی آمد کا مژدہ سنایا گیا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں نبی کے سوا کسی کا یہ منصب ہی نہیں ہے کہ دعوے سے کام کا آغاز کرے اور نہ نبی کے سوا یہ کسی کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس خدمت پر مامور ہوا ہے۔ مہدویت دعویٰ کرنے کی چیز نہیں کر کے دکھانے کی چیز ہے۔ اس قسم کے دعوے جو لوگ کرتے ہیں اور جو ان پر ایمان لاتے ہیں میرے نزدیک دونوں اپنے علم کی کمی اور اپنے ذہن کی پستی کا ثبوت دیتے ہیں۔'' (تجدید و احیائے دین ص:۳۲)

فتنۂ تکفیر

''مسلمان کی تکفیر کے معاملے میں انتہا درجے کی احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے۔ اتنی ہی احتیاط جتنی ایک شخص کے قتل کا فتویٰ صادر کرنے میں ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ ہر شخص جو مسلمان ہے اور لا الہ الا اللہ کا قائل ہے، اس کے حق میں یہی گمان ہونا چاہیے کہ اس کے دل میں ایمان ہے۔ اگر وہ کوئی ایسی بات کرتا ہے جس میں کفر کا شائبہ پایا جاتا ہو تو اس کے حق میں یہ امید رکھنی چاہیے کہ

اس نے کفر کے ارادے سے ایسی بات نہ کی ہوگی بلکہ محض جہل اور ناسمجھی سے کی ہوگی۔ اس لیے اس کی بات سنتے ہی کفر کا فتویٰ نہ جڑ دینا چاہیے۔ بلکہ عمدہ طریقے سے اس کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے اور اگر وہ پھر بھی نہ مانے اور اپنی بات پر اصرار کرے تو اس بات کو جس پر وہ اصرار کر رہا ہے کتاب اللہ پر پیش کر کے دیکھا جائے کہ آیا وہ کفر و ایمان کے درمیان فرق کرنے والی صریح نصوص کے خلاف ہے یا نہیں؟ اور اس شخص کے زیر بحث قول یا فعل میں کسی تاویل کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اگر صریح نصوص کے خلاف نہ ہو تو کفر کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ ایسے شخص کو گم راہ کہا جا سکتا ہے اور وہ بھی اس خاص مسئلہ میں نہ کہ بالکلیہ۔ البتہ اگر اس کا اعتقاد نصِ صریح کے خلاف ہو اور وہ شخص یہ معلوم کرنے کے بعد بھی کہ اس کا اعتقاد کتاب اللہ کی تعلیم کے خلاف ہے اپنی بات پر قائم رہے اور اس کے قول کی کوئی مناسب تاویل بھی نہ کی جا سکتی ہو تو ایسی صورت میں مسئلہ کی نوعیت کا لحاظ کرتے ہوئے فسق یا کفر کا حکم لگایا جا سکتا ہے لیکن اس پر بھی مدارج و مراتب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، تمام جرم اور تمام مجرم یکساں نہیں ہیں ان میں بھی فرق مراتب ہوتا ہے اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس فرق کو ملحوظ رکھ کر سزا تجویز کی جائے۔ سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکنا یقیناً بے انصافی ہے۔" (تفہیمات حصہ دوم ص: ۱۴۷)

مسلم

"اسلام کے معنی عربی زبان میں اطاعت اور فرماں برداری کے ہیں۔ مذہب اسلام کا نام "اسلام" اس لیے رکھا گیا ہے کہ یہ اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں سب ایک قاعدے اور قانون کی تابع ہیں۔ چاند اور ستارے سب ایک زبردست قاعدے میں بندھے ہوئے ہیں، جس کے خلاف وہ بال برابر جنبش نہیں کر سکتے۔ زمین اپنی خاص رفتار کے ساتھ گھوم رہی ہے۔ اس کے لیے جو وقت اور رفتار اور راستہ مقرر کیا گیا ہے، اس میں ذرا فرق نہیں آتا۔ پانی اور ہوا، روشنی اور حرارت سب ایک ضابطے کے پابند ہیں۔ جمادات، نباتات اور حیوانات میں ہر ایک کے لیے جو قانون مقرر ہے اسی کے مطابق یہ سب پیدا ہوتے ہیں، بڑھتے ہیں اور گھٹتے ہیں، جیتے ہیں اور مرتے ہیں۔ خود انسان کی حالت پر بھی تم غور کرو گے تو تم کو معلوم ہوگا کہ وہ بھی قانون قدرت کا تابع ہے۔ جو قاعدہ اس کی پیدائش کے لیے

مقرر کیا گیا ہے، اسی کے مطابق سانس لیتا ہے۔ پانی اور غذا اور حرارت اور روشنی حاصل کرتا ہے۔ اس کے دل کی حرکت، اس کے خون کی گردش، اس کے سانس کی آمد و رفت اسی ضابطے کی پابند ہے۔ اس کا دماغ، اس کا معدہ، اس کے پھیپھڑے، اس کے اعصاب اور عضلات، اس کے ہاتھ پاؤں، زبان آنکھیں کان اور ناک غرض اس کے جسم کا ایک ایک حصہ وہی کام کر رہا ہے جو اس کو بتادیا گیا ہے۔ یہ زبردست قانون جس کی بندش میں بڑے بڑے سیاروں سے لے کر زمین کا ایک چھوٹے سے چھوٹا ذرہ تک جکڑا ہوا ہے، ایک بڑے حاکم کا بنایا ہوا قانون ہے۔ ساری کائنات اور کائنات کی ہر چیز اس حاکم کی مطیع اور فرماں بردار ہے۔ کیوں کہ وہ اسی کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت اور فرماں برداری کر رہی ہے۔ اس لحاظ سے ساری کائنات کا مذہب اسلام ہے۔ سورج چاند اور تارے سب مسلم ہیں۔ زمین بھی مسلم ہے۔ ہوا اور پانی اور روشنی بھی مسلم ہیں۔ درخت اور پتھر اور جانور بھی مسلم ہیں۔'' (رسالہ دینیات ص:۱۱)

عبادت کا وسیع مفہوم

''مومن صالح صرف اسی وقت اللہ کا عبادت گزار نہیں ہوتا جب وہ دن میں پانچ وقت نماز پڑھتا ہے اور بارہ مہینوں میں ایک مہینے کے روزے رکھتا ہے اور سال میں ایک وقت زکوٰۃ دیتا ہے اور عمر بھر میں ایک مرتبہ حج کرتا ہے، بلکہ اس کی ساری زندگی عبادت ہی عبادت ہے، وہ کاروبار میں حرام کے فائدوں کو چھوڑ کر حلال کی روزی پر قناعت کرتا ہے تو کیا وہ عبادت نہیں کرتا؟ جب وہ معاملات میں ظلم اور جھوٹ اور دغا سے پرہیز کر کے انصاف اور راست بازی سے کام لیتا ہے تو کیا یہ عبادت نہیں ہے؟ جب وہ خلق خدا کی خدمت اور حق داروں کی حق رسانی کے لیے کمر بستہ ہوتا ہے تو کیا اس کی ہر حرکت عین عبادت نہیں ہوتی؟ جب وہ اپنے افعال و اقوال میں خدا کے قانون کی پیروی کرتا ہے اور اس کی حدود کا لحاظ رکھتا ہے تو کیا اس کا ہر قول و فعل عبادت میں شمار نہ ہوگا؟ پس حق یہ ہے کہ اللہ کے قانون کی پیروی اور اس کی شریعت کے اتباع میں انسان دین اور دنیا کا جو بھی کام کرتا ہے وہ سراسر عبادت ہے حتیٰ کہ بازاروں میں اس کی خرید و فروخت اور اپنے اہل و عیال میں اس کی معاشرت اور اپنے خالص دنیوی اشغال میں اس کا انہماک بھی عبادت ہے۔'' (تفہیمات ص:۵۵)

نظریات

● ڈارون کا نظریۂ ارتقاء ● مارکس کی مادی تعبیر تاریخ ● انسان خدا کی پیدائشی رعیت
● اسلام میں نظریۂ خلافت

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء

''عام انسانی ذہن نے ڈارون کے بیان سے متاثر ہو کر کائنات کا جو تصور قائم کیا وہ یہ تھا کہ یہ کائنات ایک رزم گاہ ہے، جہاں ہر آن ہر طرف زندگی اور بقاء کے لیے ایک ابدی جنگ برپا ہے۔ نظامِ فطرت ہے ہی کچھ ایسا ہے کہ جسے زندہ اور باقی رہنا ہو، اسے نزاع اور کش مکش اور مزاحمت کرنی پڑتی ہے اور مزاجِ فطرت واقع ہی کچھ اس طرح ہوا ہے کہ اس کی نگاہ میں وہی بقا کا مستحق ہے، جو قوت بقا کا ثبوت دے دے۔ اس بے رحم نظام میں جو فنا ہوتا ہے وہ اس لیے فنا ہوتا ہے کہ وہ کم زور ہے اور اسے فنا ہونا ہی چاہیے اور جو باقی رہتا ہے وہ اس لیے باقی رہتا ہے کہ وہ طاقت ور ہے اور اسے باقی ہی رہنا چاہیے۔ زمین اور اس کا ماحول اور اس کے وسائل زندگی غرض یہاں جو کچھ بھی ہے طاقت ور کا حق ہے، جس نے زندہ رہنے کا ثبوت دے دیا ہو۔ کم زور کا ان چیزوں پر کوئی حق نہیں ہے۔ اسے طاقت ور کے لیے جگہ خالی کرنی چاہیے اور طاقت ور سراسر برسر حق ہے اگر وہ اسے ہٹا کر یا مٹا کر جگہ لیتا ہے۔ غور کیجیے یہ تصور کائنات جب دماغوں میں بیٹھ جائے اور نظام فطرت کو اس نگاہ سے دیکھا جانے لگے تو انسان انسان کے لیے کیا کچھ بن کر رہے گا۔ اس فلسفہ زندگی میں ہم دردی، رحم، محبت، ایثار اور اس طرح کے دوسرے شریفانہ انسانی جذبات کے لیے کیا جگہ ہو سکتی ہے؟ اس میں عدل و انصاف، امانت و دیانت، صداقت اور راست بازی کا کیا کام؟ اس میں حق کا وہ مفہوم کہاں باقی رہتا ہے جو کبھی کم زور کو بھی پہنچ سکتا ہو اور ظلم کے وہ معنی کب ہو سکتے ہیں جن سے کبھی طاقت ور بھی گناہ گار ٹھہرایا جا سکتا ہو؟ لڑنے جھگڑنے کا کام اگرچہ پہلے بھی انسان کرتا رہا ہے مگر پہلے اسے فساد سمجھا جاتا تھا اور اب وہ عین تقاضائے فطرت ہے کیوں کہ کائنات تو ہے ہی ایک میدان جنگ۔ ظلم پہلے بھی دنیا میں ہوتا تھا مگر وہ ظلم تھا اور اب اسے ایسی منطق مل گئی ہے جس سے وہ طاقت ور کا حق بن گیا ہے۔ اس فلسفے کے بعد یورپ والوں کو ان تمام مظالم کے لیے جو انھوں نے دوسری قوموں پر ڈھائے، ایک محکم دلیل

ہاتھ آگئی۔ انھوں نے اگر امریکہ اور آسٹریلیا اور افریقہ کی پرانی نسلوں کو مٹایا اور کم زور قوموں کو اپنا غلام بنایا تو یہ گویا ان کا حق تھا، جو انھوں نے عین قانون فطرت کے مطابق حاصل کیا۔ مٹنے والے مٹنے ہی کے مستحق تھے اور ان کی جگہ لینے والوں کا یہی حق تھا کہ وہ ان کی جگہ لیں۔ اس بارے میں اگر اہل مغرب کے ضمیر میں پہلے کوئی خلش تھی بھی تو ڈارون کی منطق نے اسے دلائل وشواہد سے دور کر دیا۔ سائنس میں اس نظریے کی حیثیت جیسی کچھ بھی ہو۔ معاشرت، تمدن اور سیاست میں تو اس نے انسان کو انسان کے لیے بھیڑیا بنا کر رکھ دیا ہے۔''

(مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل)

مارکس کی مادی تعبیر تاریخ

''ہیگل نے فکر کی دنیا کو رزم گاہ بنا کر پیش کیا تھا۔ ڈارون نے کائنات اور نظامِ فطرت کو میدانِ جنگ بنا کر دکھا دیا اور مارکس نے وہی تصوّر خود انسانی معاشرے کی بنیاد بنا کر دکھا دیا۔ اس تصویر میں انسان، ہم کو شروع سے لڑتا جھگڑتا نظر آتا ہے۔ اس کی فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنی اغراض اور اپنے مفاد کے لیے اپنے ہم جنسوں سے لڑے۔ وہ سراسر خود غرضی کی بنا پر مختلف طبقوں میں تقسیم ہوا ہے۔ سراسر خود غرضی کی بنا پر ان طبقوں میں کش مکش اور نزاع برپا رہی ہے اور انسانی تاریخ کا سارا ارتقاء اسی خود غرضانہ طبقاتی کش مکش کی بہ دولت ہوا ہے۔ قوموں اور قوموں کی لڑائی تو درکنار خود ایک ہی قوم کے مختلف طبقوں کی لڑائی بھی اس تصویر میں ہم کو سراسر ایک تقاضائے فطرت نظر آتی ہے۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اور انسان کے درمیان اگر کوئی رشتہ ہے تو وہ صرف اغراض و مفاد کے اشتراک کا رشتہ ہے۔ ان رشتہ داروں سے ملنا اور متفق ہو کر ان سب لوگوں سے لڑنا جن سے آدمی کی معاشی اغراض متصادم ہوں خواہ وہ اپنے ہی ہم قوم اور ہم مذہب کیوں نہ ہوں سراسر حق ہے اور یہ حرکت کسی جرم کا ارتکاب نہیں بلکہ اس سے اجتناب خلاف فطرت ہے۔ مارکس کے پیروان تمام مذہبی، اخلاقی اور قانونی تصورات کو جو کسی خاص تاریخی عہد میں پائے جاتے ہوں، اسی خاص دور کے معاشی نظام کی پیدا کردہ چیز سمجھتے ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ وہ تصورات اور اصول وقوانین اپنے ہی دور کے معاشی نظام کی حمایت وحفاظت کے لیے وضع کیے گئے ہوتے ہیں۔ لہٰذا منطقی طور پر ان کے اس عقیدے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب انسان

کی معاشی ضروریات مہیا کرنے کا طریقہ Means of Production and Distribution بدل جائے تو اس کے ساتھ ہی مذہب، اخلاق، قانون ہر چیز کو بدل جانا چاہیے۔ کیوں کہ ان کا جوڑ صرف پرانے نظام معیشت کے ساتھ تھا نئے نظام کی روح سے ان کو کوئی مناسبت نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس مارکسی نظریہ پر جو شخص اعتقاد رکھتا ہو وہ صدیوں پہلے کی کسی مذہبی تعلیم یا کسی شریعت یا کسی اخلاقی سسٹم پر ایمان رکھ سکتا ہے۔" (تفہیمات حصہ دوم ص:۲۱۸)

انسان: خدا کی پیدائشی رعیّت

"الکتاب اور الرسول نے زندگی کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ عظیم الشان کائنات جو تمھیں صریحاً ایک نظام میں جکڑی ہوئی ایک مقررہ قانون پر چلتی ہوئی نظر آرہی ہے، دراصل ایک خدا کی حکومت ہے۔ خدا ہی اس کا مالک ہے۔ وہی اس کا خالق ہے اور وہی اس کا فرماں روا ہے۔ یہ زمین جس پر تم رہتے ہو، اس کی بے پایاں سلطنت کے لاتعداد صوبوں میں سے ایک چھوٹا سا صوبہ ہے اور یہ صوبہ بھی مرکزی اقتدار کی اس گرفت میں پوری طرح جکڑا ہوا ہے، جس میں اس جہانِ ہست و بود کا ہر حصہ جکڑا ہوا ہے۔ تم اس صوبے میں خدا کی پیدائشی رعیت ہو۔ تم اپنے خالق آپ نہیں ہو بلکہ اس کے پروردہ ہو۔ اپنے بل پر آپ نہیں جی رہے ہو بلکہ اس کے جلائے جی رہے ہو۔ اس لیے تمھارے ذہن میں اپنی خود مختاری کا اگر کوئی زعم ہے تو وہ ایک غلط فہمی اور نظر کے ایک دھوکے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اپنی زندگی کے ایک بہت بڑے حصے میں تو تم صریح طور پر رعیت ہو اور اپنی محکومی کو جانتے ہو۔ اپنی ماؤں کے پیٹوں میں استقرار حمل سے لے کر اپنی موت کی آخری ساعت تک تم خدا کے قانون طبعی سے اس طرح بندھے ہوئے ہو کہ ایک سانس تک اس کے خلاف نہیں لے سکتے اور تمھارے اوپر فطرت کی قوتیں اور قوانین اس طرح حاوی ہیں کہ تم جو کچھ کر سکتے ہو ان کے تحت رہ کر ہی کر سکتے ہو۔ ایک لمحہ کے لیے بھی تمھارا ان سے آزاد ہونا ممکن نہیں ہے۔" (اسلامی قانون:۹-۱۰)

اسلام میں نظریۂ خلافت

"اسلام میں اصل حاکم اللہ ہے۔ اس اصل الاصول کو پیش نظر رکھ کر جب آپ اس

سوال پر غور کریں گے کہ زمین میں جو لوگ خدا کے قانون کو نافذ کرنے کے لیے اٹھیں ان کی حیثیت کیا ہونی چاہیے تو آپ کا ذہن خود بہ خود پکارے گا کہ وہ اصل حاکم کے نائب قرار پانے چاہئیں۔ ٹھیک ٹھیک یہی حیثیت اسلام نے بھی ان کو دی ہے۔ چناں چہ قرآن کہتا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص (النور:۵۵)

''اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا اسی طرح جس طرح ان سے پہلے اس نے دوسروں کو خلیفہ بنایا تھا۔''

یہ آیت اسلام کے نظریۂ ریاست (Theory of state) پر نہایت صاف روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں دو بنیادی نکات بیان کیے گئے ہیں۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ اسلام حاکمیت Sovereignty کی بہ جائے خلافت (Vicegerncy) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ چوں کہ اس کے نظریے کے مطابق حاکمیت خدا کی ہے لہٰذا جو کوئی اسلامی دستور کے تحت زمین پر حکمراں ہو اسے لامحالہ حاکم اعلیٰ کا خلیفہ (Vicegerent) ہونا چاہیے، جو محض تفویض کردہ اختیارات (Delegated powers) استعمال کرنے کا مجاز ہوگا۔ دوسری کانٹے کی بات اس آیت میں یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوئی ہے، وہ عمومی خلافت (Popular Vicegrency) ہے کسی شخص یا خدان یا نسل یا طبقہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ ہر مومن اپنی جگہ خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً ہر ایک خدا کے سامنے جواب دہ ہے (کُلکُم راعٍ و کُلکُم مسئول عن رعیتہٖ) اور ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ کے مقابلے میں کسی حیثیت سے فروتر نہیں ہے۔'' (اسلام کا نظریۂ سیاسی ص:۳۶-۳۷)

اخلاقیات

● اسلام میں خدا کا تصور ● تصوّف ● باطن کی اصلاح

اسلام میں خدا کا تصوّر

''اسلام اس پوری فکری اور عملی انارکی کو ختم کر دیتا ہے جو انسان کو بے خدا فرض کر کے اس کے لیے ایک نظام اخلاق تجویز کرنے کی کوششوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اسلام خدا کا جو تصوّر پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا ہی انسان کا اور ساری کائنات کا مالک، خالق، معبود اور حاکم ہے۔ اس کی خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اس کے ہاں بجز دعائے خیر کے اور کوئی سفارش کی گنجائش بھی نہیں جو زور سے منوائی جاتی ہو اور رد نہ کی جا سکتی ہو۔ اس کے ہاں ہر شخص کی کام یابی و ناکامی کا مدار اس کے اپنے طرز عمل پر ہے نہ کوئی کسی کا کفارہ بن سکتا ہے نہ کسی کے عمل کی ذمہ داری دوسرے پر ڈالی جاتی ہے اور نہ کسی کے عمل کا صلہ دوسرے کو ملتا ہے۔ اس کے ہاں جانب داری نہیں کہ ایک شخص یا خاندان یا قوم یا نسل سے اس کو دوسرے کی بہ نسبت زیادہ دل چسپی ہو۔ سب انسان اس کی نگاہ میں یکساں ہیں اور سب کے لیے ایک ہی قانون اخلاق ہے۔ اور فضیلت جو کچھ بھی ہے اخلاقی فضیلت کے اعتبار سے ہے۔ وہ خود رحیم ہے اور رحم کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود فیاض ہے اور فیاضی کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود عادل ہے اور عدل کو پسند کرتا ہے۔ وہ خود ظلم سے تنگ نظری و تنگ دلی سے، بے رحمی سے اور سنگ دلی سے، تعصب اور نفسانی جانب داری سے پاک ہے اس لیے اُنھی کو پسند کرتا ہے جو ان صفات سے پاک ہوں۔ پھر کبریائی تنہا اسی کا حق ہے اس لیے تکبّر اسے ناپسند ہے۔ خدائی صرف اس کے لیے ہے اور دوسرے اس کے بندے ہیں اس لیے ایک بندے پر دوسرے کی خداوندی اس کو پسند نہیں۔ مالک وہ اکیلا ہے اور دوسروں کے پاس جو کچھ ہے امانت کی حیثیت سے ہے اس لیے کسی بندے کی خود مختاری اور کسی کا کسی کے لیے قانون بنانا اور کسی کا کسی کے لیے بہ ذاتِ خود واجب الاطاعت ہونا یہ سب فی الحقیقت غلط ہے۔ سب کا مطاع وہی ایک ہے اور سب کے لیے خیر اسی میں ہے کہ اس کی بے چون و چرا اطاعت کریں۔ پھر وہ محسن ہے اور شکر احسان مندی اور محبت کا مستحق ہے۔ وہ منعم ہے اور اس کا حق دار ہے کہ اس کی نعمتوں میں اسی کی منشا کے مطابق تصرف کیا جائے۔ وہ منصف ہے اور لازم ہے کہ انسان اس کے انصاف میں سزا پانے کا خوف اور جزا پانے کی طمع رکھے۔ وہ علیم و خبیر ہے اور دلوں کی چھپی ہوئی نیتوں سے بھی واقف ہے اس لیے ظاہری حسن اخلاق سے اس کو دھوکا نہیں

دیا جاسکتا۔ وہ محیط ہے اس لیے کوئی یہ امید نہیں کر سکتا کہ جرم کر کے اس کی پکڑ سے بچ نکلے گا۔''
(اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر صفحہ: ۳۵-۳۶)

تصوّف

''تصوّف کسی ایک چیز کا نام نہیں بلکہ بہت سی مختلف چیزیں اس نام سے موسوم ہوگئی ہیں۔ جس تصوّف کی ہم تصدیق کرتے ہیں وہ اور چیز ہے، جس تصوّف کی ہم تردید کرتے ہیں وہ ایک دوسری چیز ہے اور جس تصوّف کی ہم اصلاح چاہتے ہیں وہ ایک تیسری چیز ہے۔

ایک تصوف وہ ہے جو اسلام کے ابتدائی دور کے صوفیا میں تھا۔ مثلاً فضیل بن عیاضؒ، ابراہیمؒ، معروف کرخیؒ وغیرہم رحمہم اللہ اس کا کوئی الگ فلسفہ نہ تھا۔ اس کا کوئی الگ طریقہ نہ تھا وہی افکار اور وہی اشغال و اعمال تھے جو کتاب و سنت سے ماخوذ تھے اور ان سب کا وہی مقصود تھا، جو اسلام کا مقصود ہے۔ یعنی اخلاص للہ اور توجہ الی اللہ وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ اس تصوف کی ہم تصدیق کرتے ہیں اور صرف تصدیق ہی نہیں کرتے بلکہ اس کو زندہ اور شائع کرنا چاہتے ہیں۔

دوسرا تصوف وہ ہے جس میں اشراقی اور رواقی اور زردشتی اور ویدانتی فلسفوں کی آمیزش ہوگئی ہے۔ جس میں عیسائی راہبوں اور ہندو جوگیوں کے طریقے شامل ہوگئے ہیں، جس میں مشرکانہ تخیلات و اعمال تک خلط ملط ہو گئے ہیں، جس میں شریعت، طریقت اور معرفت الگ الگ چیزیں، ایک دوسرے سے کم و بیش بے تعلق بلکہ بسا اوقات باہم متضاد بن گئی ہیں۔ اور جس میں انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض کے فرائض کی انجام دہی کے لیے تیار کرنے کی بہ جائے اسے بالکل مختلف دوسرے کاموں کے لیے ہی تیار کیا جاتا ہے۔ اس تصوف کی ہم تردید کرتے ہیں اور ہمارے نزدیک اس کو مٹانا خدا کے دین کو قائم کرنے کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ جاہلیت جدیدہ کو مٹانا۔

ان دونوں کے علاوہ ایک اور تصوف بھی ہے جس میں کچھ خصوصیات پہلے قسم کے تصوف کی اور کچھ خصوصیات دوسرے قسم کے تصوف کی ملی جلی پائی جاتی ہیں۔ اس تصوف کے طریقوں کو متعدد ایسے بزرگوں نے مرتب کیا ہے جو صاحبِ علم تھے، نیک نیت تھے مگر اپنے دور کی

خصوصیات اور پچھلے ادوار کے اثرات سے بالکل محفوظ بھی نہ تھے۔انھوں نے اسلام کے اصلی تصوف کو سمجھنے کے طریقوں کو جاہلی تصوف کی آلودگیوں سے پاک کرنے کی پوری کوشش کی۔لیکن اس کے باوجود ان کے نظریات میں کچھ نہ کچھ اثرات جاہلی فلسفہ، تصوف کے اور ان کے اعمال و اشغال میں کچھ نہ کچھ اثرات باہر سے لیے ہوئے اعمال و اشغال کے باقی رہ گئے، جن کے بارے میں ان کو یہ اشتباہ پیش آیا کہ یہ چیزیں کتاب وسنت کی تعلیم سے متصادم نہیں ہیں یا کم از کم تاویل سے انھیں غیر متصادم سمجھا جاسکتا ہے۔علاوہ بریں اس تصوف کے مقاصد اور نتائج بھی اسلام کے مقصد اور اس کے مطلوبہ نتائج سے کم وبیش مختلف ہیں۔نہ اس کا مقصد واضح طور پر ہر انسان کو فرائض اخلاق کی ادائے گی کے لیے تیار کرنا اور وہ چیز بتانا ہے جسے قرآن نے لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ کے الفاظ میں بیان کیا ہے اور نہ اس کا نتیجہ ہی یہ ہوسکا ہے کہ اس کے ذریعے سے ایسے آدمی تیار ہوتے جو دین کے پورے تصوّر کو سمجھنے اور اس کی اقامت کی فکر انھیں لاحق ہوتی اور وہ اس کام کو انجام دینے کے اہل بھی ہوتے۔اس تیسری قسم کے تصوف کی نہ ہم کلی تصدیق کرتے ہیں اور نہ کلّی تردید۔بلکہ اس کے پیروؤں اور حامیوں سے ہماری گزارش یہ ہے کہ بہ راہِ کرم بڑی بڑی شخصیتوں کی عقیدت کو اپنی جگہ رکھتے ہوئے آپ اس تصوف پر کتاب وسنت کی روشنی میں تنقیدی نگاہ ڈالیں اور اسے درست کرنے کی کوشش کریں نیز جو شخص اس تصوف کی کسی چیز سے اس بنا پر اختلاف کرے کہ وہ اسے کتاب وسنّت کے خلاف پاتا ہے تو قطع نظر اس سے کہ آپ اس کی رائے سے موافقت کریں یا مخالفت بہ ہر حال اس کے حق تنقید کا انکار نہ فرمائیں اور اسے خواہ مخواہ نشانہ ملامت نہ بنانے لگیں۔'' (ترجمان القرآن بابت جمادی الاولیٰ ۷۱ھ فروری ۵۲ء)

باطن کی اصلاح

''لباس اور چہرہ کی وضع قطع کے متعلق آپ نے جو سوال کیا ہے اس کا جواب تو میں دیئے دیتا ہوں لیکن اس سے پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ ظاہر کی اصلاح باطن کی اصلاح پر مقدم نہ ہونی چاہیے۔سب سے پہلے اپنے آپ کو قرآنی معیار کے مطابق حقیقی مسلمان بنانے کی کوشش کیجیے۔پھر ظاہر کی تبدیلی اس حد تک کرتے جایئے جس حد تک باطن میں واقعی تبدیلی ہوتی

جائے۔ ورنہ مجرد ضابطہ و قانون کو سامنے رکھ کر اگر آپ نے اپنے ظاہر کو اس نقشے پر ڈھال لیا جو حدیث و فقہ کی کتابوں میں ایک متقی انسان کے ظاہری نقشے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور اندر حقیقی تقویٰ پیدا نہ ہوا تو آپ کی مثال ایسی ہوگی جیسے تانبہ کے سکّہ پر اشرفی کا ٹھپہ لگا ہوا ہو۔ اشرفی کا ٹھپہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے بہت آسانی سے جس سستی سے سستی دھات پر چاہیں اس کو لگا سکتے ہیں لیکن زرِ خالص بہم پہنچانا ایک مشکل کام ہے اور بہت مدت کی کیمیا گری سے یہ چیز حاصل ہوا کرتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایک مدت سے ظاہر پر غیر معمولی زور دیا جا رہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اشرفی کے ٹھپہ کے ساتھ تانبے لوہے سیسے اور ہر قسم کی گھٹیا دھاتوں کے سکّے چل پڑے ہیں۔ عملی دنیا کا بازار ایسا بے لاگ صرّاف ہے کہ زیادہ مدت تک اس جعل سازی سے دھوکہ نہیں کھا سکتا۔ کچھ مدت تک تو ہمارے دھوکے کی اشرفیاں چل گئیں۔ لیکن اب بازار میں کوڑی بھر بھی ان کی قیمت نہیں رہی ہے پس ہمیں اپنے اندر جس قسم کی دین داری پیدا کرنی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اشرفی کا ٹھپہ لگانے سے پہلے سونے کا سکہ بننے کی کوشش کریں۔

قبل اس کے کہ آپ باہر کی دنیا میں خدا کے باغیوں سے مقابلے کے لیے نکلیں اس باغی کو مطیع بنایئے جو خود آپ کے اندر موجود ہے اور خدا کے قانون اور اس کی رضاء کے خلاف چلنے کے لیے ہر وقت تقاضا کرتا رہتا ہے۔ اگر یہ باغی آپ کے اندر پل رہا ہے اور آپ پر اتنا قابو یافتہ ہے کہ آپ سے رضائے الٰہی کے خلاف اپنے مطالبات منوا سکتا ہے تو یہ بالکل ایک بے معنی بات ہے کہ آپ بیرونی باغیوں کے خلاف اعلان جنگ کریں یہ تو وہی بات ہوئی کہ گھر میں شراب کی بوتل پڑی ہے اور باہر شرابیوں سے لڑائی ہو رہی ہے۔ یہ تضاد ہماری تحریک کے لیے تباہ کن ہے پہلے خود خدا کے آگے سر جھکایئے پھر دوسروں سے اطاعت کا مطالبہ کیجیے۔''

(ترجمان القرآن جلد ۲۵ عدد ۳،۴ ص: ۴۰۸،۴۰۷)

اجتماعیات

● اسلام ایک تحریک ● قومیت اسلام ● دنیا کے لیے فلاحی نظریہ ● خدا کے قانون کی ایک اہم دفعہ ● ایمان اور اطاعت ● اصلاح اور قیادت ● اصلاح کا صحیح طریق کار

اسلام ایک تحریک

''مسلمان کے نام سے جو قوم اس وقت موجود ہے، وہ خود بھی اس حقیقت کو بھول گئی ہے اور اس کے طرزِ عمل نے دنیا کو بھی یہ بات بھلا دی کہ اسلام اصل میں ایک عالم گیر تحریک کا نام ہے، جو دنیا میں ایک مقصد اور کچھ اصول لے کر آئی تھی اور مسلمان کا لفظ اس جماعت کے لیے وضع کیا گیا تھا جو اس تحریک کی پیروی اور اس کی علم برداری کے لیے بنائی گئی تھی۔ تحریک گم ہوگئی اس کا مقصد فراموش کر دیا گیا، اس کے اصولوں کو ایک ایک کر کے توڑا گیا اور اس کا نام اپنی تمام معنویت کھودینے کے بعد اب محض ایک نسلی و معاشرتی قومیت کے نام کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ اسے ان مواقع پر بھی بے تکلف استعمال کیا جاتا ہے جہاں اسلام کا مقصد پامال ہوتا ہے، جہاں اس کے اصول توڑے جاتے ہیں اور جہاں اسلام کی بہ جائے غیر اسلام ہوتا ہے۔'' (سیاسی کش مکش سوئم ص:۲۸)

قومیّتِ اسلام

''اسلام نے قومیت کا جو دائرہ کھینچا ہے وہ کوئی حسی اور مادی دائرہ نہیں بلکہ ایک خالص عقلی دائرہ ہے۔ ایک گھر کے دو آدمی اس دائرے سے جدا ہو سکتے ہیں اور مشرق و مغرب کا بُعد رکھنے والے دو آدمی اس میں داخل ہو سکتے ہیں اس دائرہ کا محیط ایک کلمہ ہے لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه اسی کلمہ پر دوستی بھی ہے اور دشمنی بھی۔ اسی کا اقرار جمع کرتا ہے اور اسی کا انکار جدا کر دیتا ہے، جن کو اس نے جدا کر دیا ہے، ان کو نہ خون کا رشتہ جمع کر سکتا ہے نہ خاک کا۔ نہ زبان کا۔ نہ حکومت کا۔ اور جن کو اس نے جمع کر دیا ہے انھیں کوئی چیز جدا نہیں کر سکتی کسی دریا۔ کسی پہاڑ۔ کسی سمندر کسی زبان۔ کسی نسل کسی رنگ اور کسی زر و زمین کے قضیہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اسلام کے دائرے میں امتیازی خطوط کھینچ کر مسلمان اور مسلمان کے درمیان فرق کرے۔ ہر مسلمان خواہ وہ چین کا باشندہ ہو یا مراکش کا۔ گورا ہو یا کالا۔ ہندی ہو یا عربی، سامی ہو یا آرین، ایک حکومت کی رعیت ہو یا دوسری کی۔ مسلمان قوم کا فرد ہے، اسلامی سوسائٹی کا رکن ہے، اسلامی اسٹیٹ کا شہری ہے، اسلامی فوج کا سپاہی ہے، اسلامی قانون کی حفاظت کا مستحق ہے، شریعتِ اسلامیہ میں کوئی دفعہ ایسی نہیں ہے جو عبادات، معاملات، معاشرت، معیشت، سیاست غرض زندگی کے کسی

شعبہ میں جنسیت یا زبان یا وطنیت کے لحاظ سے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے مقابلے میں کم تر یا بیشتر حقوق دیتی ہو۔'' (مسئلہ قومیت ص: ۲۲، ۲۳)

دنیا کے لیے فلاحی نظریہ

''دنیا اگر کسی نظریہ سے فلاح کی اُمیدیں وابستہ کرسکتی ہے تو وہ صرف ایک ایسا نظریہ ہی ہوسکتا ہے، جو انسان کو انسان قرار دے نہ کہ جانور جو اپنی ذات کے متعلق انسان کی رائے کو بہتر بنائے۔ جس کا تصور انسانیت مغربی سائنس کے ''تصور حیوانی'' اور میسیحیت کے ''پیدائشی گنہ گار'' اور ہندومت کے ''مجبور تناسخ'' سے بلند تر ہو۔ جو انسان کو مختار مطلق اور شتر بے مہار نہ بنائے۔ بلکہ اسے سلطانِ کائنات کے اقتدار اعلیٰ کا تابع قرار دے اور اس کے آگے ذمہ دار و جواب دہ ٹھہرائے۔ جو اخلاق کے ایک ایسے قابل عمل ضابطے کا انسان کو پابند بنائے، جس میں اپنی خواہشات کے مطابق ردّ و بدل کرنے کا حق اس کو نہ ہو۔ جو مادی بنیادوں پر انسانیت کو تقسیم کرنے کے بہ جائے ایک ایسی اخلاقی و روحانی بنیاد فراہم کرے جس پر انسانیت متحد ہوسکتی ہو۔ جو اجتماعی زندگی کے لیے ایسے اصول انسان کو دے جن پر افراد اور جماعتوں اور قوموں کے درمیان صحیح اور متوازن عدل قائم ہوسکے۔ جو زندگی کے نفس پرستانہ مقاصد سے بلند تر مقاصد اور قدر و قیمت کے مادہ پرستانہ معیاروں سے بہتر معیار انسان کو دے اور ان سب خصوصیات کے ساتھ جو علمی عقلی و تمدنی ارتقاء میں انسان کی صرف مدد ہی نہ کرے بلکہ صحیح رہ نمائی بھی کرے اور مادی و اخلاقی ہر دو حیثیتوں سے اسے ترقی کی طرف لے جائے۔ ایسا ایک نظریہ اسلام کے سوا دنیا میں اور کون سا ہے لہٰذا یہ کہنا بالکل حق بہ جانب ہے کہ اب انسانیت کا مستقبل اسلام پر منحصر ہے۔'' (سیاسی کش مکش سوئم ص: ۱۹۹، ۲۰۰)

خدا کے قانون کی ایک اہم دفعہ

''خدا کے قانون کی پہلی اور سب سے اہم دفعہ یہ ہے کہ وہ بناؤ کو پسند کرتا ہے اور بگاڑ کو پسند نہیں کرتا۔ مالک ہونے کی حیثیت سے اس کی خواہش یہ ہے کہ اس کی دنیا کا انتظام ٹھیک کیا جائے، اس کو زیادہ سے زیادہ سنوارا جائے، اس کے دیئے ہوئے ذرائع اور اس کی بخشی ہوئی

قوتوں اور قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کیا جائے وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اور اس سے یہ توقع بھی نہیں کی جاسکتی کہ وہ کبھی اسے پسند کرے گا کہ اس کی دنیا بگاڑی جائے۔ اجاڑی جائے اور اس کو بد نظمی سے گندگیوں سے ظلم و ستم سے خراب کر ڈالا جائے۔ انسانوں میں سے جو لوگ بھی دنیا کے انتظام کے امیدوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں ان میں سے صرف وہ لوگ خدا کی نظر انتخاب میں مستحق ٹھہرتے ہیں جن کے اندر بنانے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت ہوتی ہے انھی کو وہ یہاں انتظام کے اختیارات سپرد کرتا ہے۔ پھر وہ دیکھتا رہتا ہے کہ یہ لوگ بناتے کتنا ہیں اور بگاڑتے کتنا۔ جب تک ان کا بناؤ ان کے بگاڑ سے زیادہ ہوتا ہے اور کوئی دوسرا امیدوار ان سے اچھا بنانے والا اور کم بگاڑنے والا میدان میں موجود نہیں ہوتا۔ اس وقت تک ان کی ساری برائیوں اور ان کے سارے قصوروں کے باوجود دنیا کا انتظام انھی کے سپرد رہتا ہے مگر جب وہ کم بنانے والا زیادہ بگاڑنے لگتے ہیں۔ تو خدا انھیں ہٹا کر پھینک دیتا ہے اور دوسرے امیدواروں کو اسی لازمی شرط پر انتظام سونپ دیتا ہے۔ یہ قانون بالکل ایک فطری قانون ہے اور آپ کی عقل گواہی دے گی کہ اس کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ (بناؤ اور بگاڑ ص:۳)

ایمان اور اطاعت

''کوئی مذہب یا تہذیب ہو یا کسی قسم کا نظام جماعت ہو۔ اس کے متعلق دو ہی طرز عمل انسان کے لیے معقول ہو سکتے ہیں۔ اگر وہ اس میں داخل ہو تو اس کے اساسی اصول پر پورا پورا اعتقاد رکھے اور اس کے قانون و ضابطہ کی پوری پوری پابندی کرے۔ اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو اس میں داخل نہ ہو یا ہو چکا ہے تو بالاعلان اس میں سے نکل جائے، ان دونوں کے درمیان کوئی تیسری صورت معقول نہیں ہے۔ اس سے زیادہ نامعقول کوئی طرز عمل نہیں ہوسکتا۔ تم ایک نظام میں شریک بھی ہو۔ اس کے ایک جزو بن کر بھی رہو۔ اس نظام کے تابع ہونے کا دعویٰ بھی کرو اور پھر اس کے اساسی اصولوں سے کلاً یا جزاً انحراف بھی کرو اور اس کے قانون کی خلاف ورزی بھی کرو۔ اپنی آپ کو اس کے آداب اور اس کے ضوابط کی پابندی سے مستثنیٰ بھی کر لو اس طرز عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم میں منافقانہ خصائل پیدا ہوں۔ خلوص نیت سے تمھارے دل خالی ہو جائیں۔ تمھارے قلوب میں کسی مقصد کے لیے گرم جوشی اور رسوخِ عزم نہ پیدا ہو سکے۔ فرض

شناسی، اتباعِ قانون اور باضابطگی کے اوصاف سے تم عاری ہو جاؤ۔ اور تم میں یہ صلاحیت باقی نہ رہے کہ کسی نظامِ جماعت کے کارآمد رکن بن سکو۔ ان کم زوریوں اور بدترین عیوب کے ساتھ تم جس جماعت میں بھی شریک ہو گے اس کے لیے لعنت بن جاؤ گے۔ جس نظام میں بھی داخل ہو گے اسے درہم برہم کردو گے۔ جس تہذیب کے جسم میں داخل ہو گے اس کے لیے جذام کے جراثیم ثابت ہو گے۔ جس مذہب کے پیرو بنو گے اس کو مسخ کر کے چھوڑو گے اور ان اوصاف کے ساتھ تمھارے مسلمان ہونے سے بدرجہا بہتر ہے کہ جس گروہ کے اصولوں پر تمھارا دل ٹھکے اور جس گروہ کے طریقوں کی تم پوری پوری پیروی کر سکو اسی میں جا شامل ہو۔ منافق مسلمان سے تو وہ کافر بہتر ہیں جو اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے دل سے معتقد ہوں اور اس کے ضوابط کی پابندی کریں۔" (تنقیحات ۱۴۰-۱۴۶)

اصلاح اور قیادت

"دنیا گویا ایک ریل گاڑی ہے جس کو فکر و تحقیق کا انجن چلا رہا ہے اور مفکرین و محققین اس کے انجن ڈرائیور ہیں۔ یہ گاڑی ہمیشہ اسی رخ پر سفر کرتی ہے جس رخ پر ڈرائیور اس کو چلاتے ہیں۔ جو لوگ اس میں بیٹھے ہوئے ہیں وہ مجبور ہیں کہ اس طرف جائیں جس طرف گاڑی جا رہی ہے خواہ وہ اس طرف جانا چاہیں یا نہ چاہیں۔ اگر گاڑی میں کوئی ایسا مسافر بیٹھا ہے جو اس سمت پر نہیں جانا چاہتا تو وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ چلتی ہوئی گاڑی ہی میں بیٹھے بیٹھے اپنی نشست کا رُخ آگے کی بہ جائے پیچھے یا دائیں بائیں پھیر دے مگر نشست کا رُخ بدل دینے سے وہ اپنے سفر کا رُخ نہیں بدل سکتا۔ سفر کا رُخ بدلنے کی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ انجن پر قبضہ کیا جائے اور اس کی رفتار کو اس جانب پھیر دیا جائے جو مطلوب ہے۔ اس وقت جو لوگ انجن پر قابض ہیں وہ سب خدا سے پھرے ہوئے ہیں اور فکرِ اسلامی سے بے بہرہ ہیں۔ اس لیے گاڑی اپنے مسافروں کو لیے ہوئے الحاد اور مادہ پرستی کی طرف دوڑی چلی جا رہی ہے اور سب مسافر طوعاً وکرہاً اسلام کی منزل مقصود سے دور اور دور تک ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اب اس رفتار کو بدلنے کے لیے ضرورت ہے کہ خدا پرستوں میں سے کچھ باہمت مرد اٹھیں اور جدوجہد کر کے انجن کو ان ملحدین کے ہاتھوں سے چھین لیں۔ جب تک یہ نہ ہو گا گاڑی کا رُخ نہ بدلے گا اور ہمارے

جھنجھلانے، بگڑنے اور شور مچانے کے باوجود وہ اسی راہ پر سفر کرتی رہے گی، جس پر ناخدا شناس ڈرائیور اس کو چلا رہے ہیں۔" (تنقیحات)

اصلاح کا صحیح طریق کار

"اسلام کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہے کہ جن لوگوں نے اس کے نظام اور اصول اور قوانین کو سمجھنے میں اپنی عمر کا کوئی ذرا سا حصہ بھی صرف نہ کیا ہو۔ وہ ادھر اُدھر سے چند آیات اور چند احادیث جمع کر کے چند گھنٹوں کے اندر بڑے بڑے دینی مسائل کے مجتہدانہ فیصلے کر ڈالیں اور الٹا ان لوگوں کو احمق بنانے کی کوشش کریں جنھوں نے اپنی عمریں اس دین کے نظام اور احکام سمجھنے میں کھپادی ہیں۔ یا چند نواب زادے اور چند وکیل اور بیرسٹر صاحبان بیٹھ کر سراسر دنیوی اغراض اور مصلحتوں کی بنیاد پر ایک اصلاحی اسکیم تصنیف کریں اور پھر اسلام کے نام سے اس کو محض پیش کر دینے پر ہی اکتفا نہ کریں بلکہ وہ دھڑلّے کے ساتھ یہ بھی فرمادیں کہ جو مولوی اور ملاّ اس کے مطابق فتویٰ دے بس وہی دین کو جانتا ہے۔ یہ محض جہالت ہی نہیں جہل مرکب ہے۔ اس طرح کے مصلحین کو جاننا چاہیے کہ یہ رویّہ کسی معقول آدمی کو زیب نہیں دیتا، ان کو جاننا چاہیے کہ اسلام ایک باقاعدہ نظام ہے جو اپنا ایک مستقل فلسفۂ زندگی، اپنے جامع اور ہمہ گیر اصول اور اپنے مخصوص ضوابط اور قوانین رکھتا ہے اور کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کا علم حاصل کیے بغیر جو کچھ چاہے اپنے دل سے گھڑ دے یا دوسری جگہ سے لا کر اس کے نظام میں کھپا دے یا ایک سرسری سی واقفیت کے بل بوتے پر مجتہد مطلق بن بیٹھے اور اپنے ذہن کی خام پیداوار کو قطعی اور حتمی فیصلوں کی صورت میں برآمد کرنا شروع کر دے۔ ان کو جاننا چاہیے کہ موجودہ خرابیوں کی اصلاح اور ایک نئے صالح نظام کی تاسیس اگر ہم خود اپنی صواب دید سے کریں تو اس کو اسلام کی طرف منسوب کرنا غلط ہے اور اگر یہ کام ہمیں اسلام کے طریقے پر کرنا ہو تو لامحالہ ہم کو ساری اصلاح و تاسیس ان حدود کے اندر کرنی ہوگی، جو اسلام نے مقرر کی ہیں اور ان اصولوں کے مطابق کرنی ہوگی جو اس نے ہم کو دیئے ہیں۔

ان پہلوؤں سے اگر لوگ اپنے ذہن کو صاف کرلیں اور ہر شخص اور گروہ اپنے حدود کار کو پہچان کر اپنی کارفرمائی اور کارگزاری کو اپنی اہلیت کی حد تک محدود رکھے تو بہت سی وہ الجھنیں

دور ہو جائیں جن کی وجہ سے کام بننے کی بہ جائے الٹا بگڑ رہا ہے۔" (مسئلہ ملکیت زمین ص:۶۹، ۷۰)

عمرانیات

● والدین اور بچے ● دور جدید کا مسلمان ● مسئلہ لباس ● اسلامی معاشرت میں پردہ ● اسلام اور تہوار

والدین اور بچے

"صنفی میلان کی انارکی اور بے اعتدالی سے روک کر اس کے فطری مطالبات کی تشفی و تسکین کے لیے جو راستہ خود فطرت چاہتی ہے کہ کھولا جائے وہ صرف یہی ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان نکاح کی صورت میں مستقل وابستگی ہو اور اس وابستگی سے خاندانی نظام کی بنا پڑے تمدّن کے وسیع کارخانے کو چلانے کے لیے جن پرزوں کی ضرورت ہے وہ خاندان کی اسی چھوٹی کارگاہ میں تیار کیے جاتے ہیں۔ یہاں لڑکیوں اور لڑکوں کے جوان ہوتے ہی کارگاہ کے منتظمین کو خود بہ خود یہ فکر لگ جاتی ہے کہ حتی الامکان ان کے لیے ایسے جوڑ لگائیں جو ایک دوسرے کے لیے زیادہ مناسب ہوں۔ تاکہ ان کے ملاپ سے زیادہ سے زیادہ بہتر نسل پیدا ہو سکے۔ پھر ان سے جو نسل نکلتی ہے اس کارگاہ کا ہر کارکن اپنے دل کے سچے جذبے سے کوشش کرتا ہے کہ اس کو جتنا بہتر بنا سکتا ہے بنائے۔ زمین پر اپنی زندگانی کا پہلا لمحہ شروع کرتے ہی بچے کو خاندان کے دائرہ میں محبت، خبر گیری، حفاظت اور تربیت کا وہ ماحول ملتا ہے، جو اس کی نشو ونما کے لیے آبِ حیات کا حکم رکھتا ہے۔ درحقیقت خاندان ہی میں بچے کو وہ لوگ مل سکتے ہیں جو اس سے نہ صرف محبت کرنے والے ہوں بلکہ جو اپنے دل کی امنگ سے یہ چاہتے ہوں کہ بچہ جس مرتبہ پر پیدا ہوا ہے اس سے اونچے مرتبے پر پہنچے۔ دنیا میں صرف ماں اور باپ ہی کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بچے کو ہر لحاظ سے خود اپنے سے بہتر حالت میں اور اپنے سے بڑھا ہوا دیکھیں۔ اس طرح وہ بلا ارادہ غیر شعوری طور پر آئندہ نسل کو موجودہ نسل سے بہتر بنانے اور انسانی ترقی کا راستہ ہم وار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی اس کوشش میں خود غرضی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ اپنے لیے کچھ نہیں چاہتے وہ بس اپنے بچے کی فلاح چاہتے ہیں اور اس کے ایک کام یاب اور عمدہ انسان بن کر اٹھنے ہی کو اپنی محنت کا کافی صلہ سمجھتے ہیں۔" (پردہ ص:۱۶۷)

دَورِ جدید کا مسلمان

''یہی بحرانی کیفیت کا زمانہ تھا جس میں مغربی لباس مغربی معاشرت مغربی آداب و اطوار حتیٰ کہ چال ڈھال اور بول چال تک میں مغربی طریقوں کی نقل اتاری گئی۔ مسلم سوسائٹی کو مغربی سانچوں میں ڈھالنے کی کوششیں کی گئیں۔ الحاد، دہریت اور مادہ پرستی کو فیشن کے طور پر بغیر سمجھے بوجھے قبول کیا گیا۔ ہر وہ پختہ یا خام تخیل جو مغرب سے آیا اس پر ایمان بالغیب لانا اور اپنی مجلسوں میں اس کو معرض بحث بنانا روشن خیالی کا لازمہ سمجھا گیا۔ شراب، جوا، لاٹری، ریس، تھیٹر، رقص وسرور اور مغربی تہذیب کے دوسرے ثمرات کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ شائستگی، اخلاق معاشرت، معیشت، سیاست، قانون حتیٰ کہ مذہبی عقائد اور عادات کے متعلق جتنے بھی مغربی نظریات یا عملیات تھے ان کو کسی تنقید اور کسی فہم و تدبر کے بغیر اس طرح تسلیم کرلیا گیا کہ گویا وہ آسمان سے اتری ہوئی وحی ہیں، جس پر سمعنا و اطعنا کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اسلامی تاریخ کے واقعات اسلامی شریعت کے احکام اور قرآن وحدیث کے بیانات میں سے جس جس چیز کو اسلام کے پرانے دشمنوں نے نفرت یا اعتراض کی نگاہ سے دیکھا اس پر مسلمانوں کو بھی شرم آنے لگی اور انھوں نے کوشش کی کہ اس داغ کو کسی طرح دھوڈالیں۔ انھوں نے جہاد پر اعتراض کیا، انھوں نے عرض کیا کہ حضور بھلا ہم کہاں اور جہاد کہاں؟ انھوں نے غلامی پر اعتراض کیا، انھوں نے عرض کیا کہ غلامی تو ہمارے ہاں بالکل ہی ناجائز ہے۔ انھوں نے تعدد ازواج پر اعتراض کیا۔ انھوں نے فوراً قرآن کی ایک آیت پر خط نسخ پھیر ڈالا۔ انھوں نے کہا کہ عورت اور مرد میں کامل مساوات ہونی چاہیے۔ انھوں نے عرض کیا کہ یہی ہمارا مذہب بھی ہے۔ انھوں نے قوانین نکاح و طلاق پر اعتراضات کیے۔ یہ ان سب میں ترمیم کرنے پر تل گئے۔ انھوں نے کہا کہ اسلام آرٹ کا دشمن ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسلام تو ہمیشہ سے ناچ گانے اور مصوری اور بت تراشی کی سرپرستی کرتا رہا ہے۔'' (پردہ ص: ۳۶-۳۸)

مسئلۂ لباس

''ایک قوم کا دوسری قوم کے لباس وطرز معاشرت کو اختیار کرنا دراصل احساس کم تری کا نتیجہ اور اس کا اعلان ہے۔ اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خود ذلیل، دنی اور پست

سمجھتی ہے۔اس کے پاس کچھ نہیں ہے جس پر وہ فخر کر سکے۔اس کے اسلاف کوئی ایسی چیز چھوڑ جانے کے قابل ہی نہ تھے جسے وہ شرم کیے بغیر برقرار رکھ سکتی ہو۔اس کا قومی مذاق اتنا پست اور اس کا قومی ذہن اتنا کند ہے اوراس کے اندر تخلیقی قوتوں کا ایسا فقدان ہے کہ وہ خود اپنے لیے سب کچھ دوسروں سے مانگ لاتی ہے اور بغیر کسی شرم کے دنیا کے سامنے اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ تہذیب، شائستگی، حضارت اور حسن و جمال جو کچھ بھی ہے دوسروں کی زندگی میں ہے۔ وہی ہر کمال کا معیار ہیں اور ہم خود سینکڑوں ہزاروں برس کی قومی زندگی میں گویا جانوروں کی طرح جیتے رہے ہیں۔ہم کوئی چیز بھی ایسی پیدا نہ کر سکے جو قدر و عزت کے لائق ہو یا زندہ رہنے کی مستحق ہو۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جس قوم میں خودداری کا شائبہ بھی باقی ہو وہ اس طرح اپنی ذلّت اور پستی کا مجسم اشتہار بننا گوارا نہیں کر سکتی۔تاریخ اس بات پر گواہ ہے اور خود موجودہ زمانے کے حالات جو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اس پر شہادت دیتے ہیں کہ اس حقیر و ذلیل حیثیت کو ایک قوم دو ہی حالتوں میں گوارا کرتی ہے یا تو اسی وقت جب کہ وہ ہر میدان میں دوسری قوموں سے پٹ کر اور پیہم شکستیں کھا کر ہار مان لے اور ڈگیں ڈال دے۔مثلاً ہندستان، ترکی، ایران، مصر وغیرہ۔ یا پھر اس صورت میں جب کہ فی الواقع اس کی پشت پر کسی قسم کی قابل فخر روایات (Traditions) نہ ہوں، اس کی اپنی کوئی تہذیب وثقافت پہلے سے نہ رہی ہو، اس میں اعلیٰ درجے کی تخلیقی قوتیں بھی نہ ہوں اور وہ اقوام عالم کے درمیان محض ایک نو دولتے کی حیثیت رکھتی ہو جیسے جاپان۔“

(مسئلہ لباس)

اسلامی معاشرت میں پردہ

”اسلامی قانون معاشرت کا مقصد ضابطۂ ازدواج کی حفاظت، صنفی انتشار کی روک تھام اور غیر معتدل شہوانی تحریکات کا انسداد ہے۔اس غرض کے لیے شارع نے تین تدبیریں اختیار کی ہیں۔ایک اصلاح اخلاق، دوسرے تعزیری قوانین، تیسرے انسدادی تدابیر یعنی ستر و حجاب۔ یہ گویا تین ستون ہیں جن پر یہ عمارت کھڑی کی گئی ہے جن کے استحکام پر اس عمارت کا استحکام منحصر ہے اور جن کا انہدام دراصل اس پوری عمارت کا انہدام ہے۔اگر احوال زمانہ پر ہی فیصلہ کا انحصار ہے تو میں کہتا ہوں کہ ہندستان کے احوال پردے کی تخفیف کے نہیں اور زیادہ اہتمام

کے مقتضی ہیں کیوں کہ آپ کے نظامِ معاشرت کی حفاظت کرنے والے دو ستون گر چکے ہیں اور اب تمام دار و مدار صرف ایک ہی ستون پر ہے۔ تمدن اور معیشت اور سیاست کے مسائل آپ کو حل کرنے ہیں تو سر جوڑ کر بیٹھیے غور کیجئے اسلامی حدود کے اندر اس کے حل کی دوسری صورتیں بھی نکل سکتی ہیں مگر اس بچے کھچے ستون کو جو پہلے ہی کافی کم زور ہو چکا ہے اور زیادہ کم زور نہ بنائیے۔ اس میں تخفیف کرنے سے پہلے آپ کو کم از کم اتنی قوت پیدا کرنی چاہیے کہ اگر کوئی مسلمان عورت بے نقاب ہو تو جہاں اس کو گھورنے کے لیے دو آنکھیں موجود ہوں وہیں ان آنکھوں کو نکال لینے کے لیے پچاس ہاتھ بھی موجود ہوں۔" (پردہ ص:۳۹۲،۳۹۳)

اسلام اور تہوار

"ایک قوم کا تہوار منانے کا طریقہ گویا ایک پیمانہ ہے، جس سے آپ اس کے مزاج اور اس کے حوصلے اور امنگوں کو علانیہ ناپ کر دیکھ سکتے ہیں۔ جتنی بلند اخلاقی کی روح کسی قوم میں ہوگی اتنے ہی اس کے تہوار مہذب اور پاکیزہ ہوں گے۔ اور اسی طرح اخلاقی اعتبار سے کوئی قوم جتنی پست ہوگی وہ اپنے تہواروں میں اتنے ہی مکروہ مناظر پیش کرے گی۔

اسلام چوں کہ ایک عالم گیر اصلاحی تحریک ہے جو کسی خاص ملک یا قوم سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کو ایک خدا پرستانہ تہذیب کا پیرو بنانا چاہتی ہے اس لیے اس نے جہاں زندگی کے ہر شعبہ کو اپنے خاص ڈھنگ پر ڈالا ہے اسی طرح تہواروں کو بھی ایک نئی شکل دی ہے جو دنیا بھر کے تہواروں سے مختلف ہے۔ سماجی زندگی میں تہوار کی جو اہمیت ہے اور سماج میں اجتماعی تقریبات کے لیے جو ایک قدرتی پیاس پائی جاتی ہے اس کو تو اسلام نے نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ اس سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی ہے مگر تہوار کی تقریب اور تہوار کے منانے کے طریقے اور تہوار کی اخلاقی روح میں بنیادی تغیر کر دیا ہے۔" (عید قرباں ص:۳،۴)

سیاسیات

- اسلامی حکومت ● آزادی کا مفہوم ● دستور اور اس کے اثرات
- اسلامی قانون کا نفاذ

اسلامی حکومت

''ہمارے پیش نظر مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ ''اسلام کی حکومت'' ہے۔ اسی اسلام کی جو مجموعہ ہے دیانت، اخلاق اور مدنیت فاضلہ کے عام اصولوں کا۔ یہ اسلام ہماری یا کسی کے باپ دادا کی میراث نہیں اس کا کسی سے کوئی خاص رشتہ نہیں۔ جو ان اصولوں پر ایمان لائے اور ان پر عمل کرے وہی اسلام کا علم بردار ہے۔ وہ اگر نسل کے اعتبار سے چمار یا بھنگی بھی ہو تو محمد رسول اللہ کی مسند خلافت پر بیٹھ سکتا ہے۔ وہ اگر نکٹا حبشی غلام بھی ہو تو عرب و عجم کے شرفاء اور سادات کا امام بن سکتا ہے۔ ساڑھے تیرہ سو برس سے جن کے خاندان میں اسلام چلا آ رہا ہے وہ اگر آج ان اصولوں سے منحرف ہو جائیں تو اسلام میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اور کل تک جو شخص ہندو یا عیسائی یا یہودی تھا شرک اور بت پرستی، شراب نوشی اور سود اور قمار بازی میں مبتلا تھا۔ وہی اگر آج اسلام کی فطری صداقتوں کو مان کر عملاً ان کا پابند ہو جائے تو اس کے لیے اسلام میں عزت اور بزرگی کے اونچے مراتب تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔''

(سیاسی کش مکش سوئم ص: ۱۳، ۱۴)

آزادی کا مفہوم

''آزادی کے معنی صرف غیر قوموں کی غلامی سے آزاد ہونا ہی نہیں بلکہ خود اپنی قوم کے جبّاروں سے بھی آزاد ہونا ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا میں بیشتر آزادی کی لڑائیاں باہر کے دشمنوں سے نہیں بلکہ گھر کے جبّاروں اور خود اپنی قوم کے ظالم حکم رانوں کے خلاف لڑی گئی ہیں۔ ایرانیوں کو خود اپنے ملک کے ناچاری حکم رانوں کے خلاف لڑنا پڑا۔ ترکوں نے خود اپنی قوم کے ہی عثمانی سلاطین سے آزادی حاصل کرنے کی جدو جہد کی۔ چین کو خود چینی بادشاہوں اور رئیسوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرنی پڑی۔ انگریزوں کو جو اپنے ملک اور قوم کے بڑے خیر خواہ ہیں خود اپنے ملک کے بادشاہوں اور امراء کے خلاف لڑنا پڑا۔ فرانس اور امریکہ کی داستان بھی یہی کچھ ہے۔ اس لیے صرف اس بات پر مطمئن نہ ہو جایئے کہ یہاں گھر کے لوگ ہی حکومت کر رہے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ وہ آپ کی اس ریاست کو کس شکل میں ڈھال رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں میں کس قسم کے اختیارات لے رہے ہیں۔''

(دستوری سفارشات ص: ۱۴، ۱۵)

دستوراوراس کے اثرات

''دستور قانون کی نسبت زیادہ گہرے اثرات رکھتا ہے دستور سے مراد وہ اصول و ضوابط ہوتے ہیں، جن پر کسی مملکت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔اس میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ ریاست کی تشکیل کس طرح کی جائے گی۔ اس کا انتظام کرنے والی حکومت کن ضوابط اور کن اصولوں کی پابند بنائی جائے گی؟ حکم رانی کے اختیارات کن لوگوں کے ہاتھ میں دیئے جائیں گے۔ان کو کون کس طرح چنے گا؟ ان کو کیا اختیارات دیئے جائیں گے؟ باشندگان ملک کے کیا حقوق اور فرائض ہوں گے اور اگر حکومت مطلق العنان ہونا چاہے تو باشندگان ملک کے پاس کون سے آئینی تحفظات اور ذرائع ہوں گے، جن سے وہ اپنے حقوق کی حفاظت کریں گے؟ دستور میں یہ بھی طے کیا جاتا ہے کہ حکومت کے کیا فرائض ہوں گے، وہ کون کون سے کام کرنے کی مجاز ہوگی، آپ اپنی حکومت سے کسی ایسے کام کا مطالعہ نہیں کر سکتے جس کے لیے دستور میں گنجائش نہ ہو نہ اس کو کسی ایسے کام سے روک سکتے ہیں، جس کے لیے دستور میں گنجائش رکھ دی گئی ہو۔ دستور میں یہ بھی طے کیا جاتا ہے کہ مملکت کے قوانین کی نوعیت کیا ہوگی؟ وہ خدا کی شریعت پر مبنی ہوں گے یا انسانوں کی بنائی ہوئی شریعت پر؟ یہ ایسے معاملات ہیں کہ اگر ان کے طے کرنے میں غفلت اور سہل انگاری برتی جائے تو ایک ریاست اپنے مسلمان باشندوں کی خواہش کے خلاف ایک غیر اسلامی نقشے پر تعمیر ہوسکتی ہے اور اس کے انتظام پر ایک ایسی حکومت قابض ہوسکتی ہے جو حدود اللہ کی پابندی سے آزاد اور خدائی قانون کو توڑنے کی مجاز ہو۔ پھر اگر دستور میں حکومت کو اتنے وسیع اختیارات دیئے جائیں یا دستوری ڈھانچے میں ایسے شگاف اور چور دروازے رہنے دیئے جائیں جن سے حکومت مطلق العنانی کے لیے راستہ نکال سکے اور باشندگان ملک کے لیے ایسے آئینی تحفظات اور ضمانتیں موجود نہ ہوں جن سے وہ اپنے حقوق کی حفاظت کرسکیں تو اس کے نتائج نہایت ہی خطرناک ہوتے ہیں۔'' (دستوری سفارشات پر تنقید ص:۴،۵)

اسلامی قانون کا تدریجی نفاذ

''سیاسی طاقت کو اور ملکی ذرائع کو ہاتھ میں لے کر نبی ﷺ نے وسیع پیمانے پر اصلاح و

تعمیر کا وہ کام شروع کیا، جس کے لیے آپ پہلے صرف دعوت وتبلیغ کے ذریعے سے کوشش فرما رہے تھے۔ آپ نے ایک مرتب اور منظّم طریقہ سے لوگوں کے اخلاق، معاشرت، تمدن اور معیشت کو بدلنے کی جدّوجہد کی۔ تعلیم کا ایک نیا نظام قائم کیا جو اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے زیادہ تر زبانی تلقین کے طریقہ پر تھا۔ جاہلیت کے خیالات کی جگہ اسلامی طرز فکر کی اشاعت کی، پرانی رسموں اور طور طریقوں کی جگہ نئے نئے اصلاح یافتہ رواج اور آداب واطوار جاری کیے اور اس ہمہ گیر اصلاح کے ذریعے سے جوں جوں زندگی کے مختلف گوشوں میں انقلاب رونما ہوتا گیا آپ اسی کے مطابق پورے توازن اور تناسب کے ساتھ اسلامی قانون کے احکام جاری کرتے چلے گئے یہاں تک کہ ۹ سال کے اندر ایک طرف اسلامی زندگی کی تعمیر مکمل ہوئی اور دوسری طرف پورا اسلامی قانون ملک میں نافذ ہوگیا۔'' (اسلامی قانون۔۳۳،۳۴)

معاشیات

● کسبِ رزق کا مساویانہ حق ● اسلام اور معاشی مسئلہ

کسب رزق کا مساویانہ حق

''اسلامی نقطۂ نظر سے زمین اور اس کی سب چیزیں خدا نے نوع انسانی کے لیے بنائی ہیں اس لیے ہر انسان کا یہ پیدائشی حق ہے کہ زمین سے اپنا رزق حاصل کرنے کی کوشش کرے اس حق میں تمام انسان برابر کے شریک ہیں۔ کسی کو اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا نہ کسی کو اس معاملے میں دوسروں پر ترجیح ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ کسی شخص نسل یا طبقے پر ایسی کوئی پابندی از روئے شرع عائد نہیں ہوسکتی کہ وہ رزق کے وسائل میں سے بعض کو استعمال کرنے کا حق دار ہی نہ رہے یا بعض پیشوں کا دروازہ اس پر بند کیا جائے۔ اس طرح ایسے امتیازات بھی شرعاً قائم نہیں رہ سکتے جن کی بنا پر کوئی ذریعہ معاش یا وسیلہ رزق کسی مخصوص طبقے یا نسل یا خاندان کا اجارہ بن کر رہ جائے۔ خدا کی بنائی ہوئی زمین پر اس کے پیدا کیے ہوئے وسائل رزق میں سے اپنا حق حاصل کرنے کی کوشش کرنا سب انسانوں کا یکساں حق ہے اور اس کوشش کے مواقع سب کے لیے یکساں کھلے ہونے چاہئیں۔'' (اسلامی معاشیات کے اصول ص:۱)

اسلام اور معاشی مسئلہ

''اسلام نے زائد از ضرورت دولت کو جمع کرنے کو معیوب قرار دیا ہے اس کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ مال تمھارے پاس ہے یا تو اسے اپنی ضروریات خریدنے پر صرف کرو یا دوسروں کو دو کہ وہ اسی سے اپنی ضروریات خریدیں اور اس طرح پوری دولت برابر گردش میں آتی رہے۔ لیکن اگر تم ایسا نہیں کرتے اور جمع کرنے پر ہی اصرار کرتے ہو تو تمھاری اس جمع کردہ دولت سے از روئے قانون ۲½٪ سالانہ رقم نکل والی جائے گی اور اسے ان لوگوں کی اعانت پر صرف کیا جائے گا، جو معاشی جدوجہد میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہیں یا سعی و جہد کرنے کے باوجود اپنا پورا حصہ پانے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اسی چیز کا نام زکوٰۃ ہے اور اس کے انتظام کی صورت جو اسلام نے تجویز کی ہے، وہ یہ ہے کہ اسے جماعت کے مشترک خزانے میں جمع کیا جائے اور خزانہ ان تمام لوگوں کی ضروریات کا کفیل بن جائے جو مدد کے حاجت مند ہیں یہ دراصل سوسائٹی کے لیے انشورنس کی بہترین صورت ہے اور ان تمام خرابیوں کا استیصال کرتی ہے جو اجتماعی امداد و معاونت کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

اسلام زکوٰۃ اور بیت المال کے ذریعے سے ان ساری خرابیوں کا استیصال کرتا ہے۔ بیت المال ہر وقت آپ کی پشت پر ایک مددگار کی حیثیت سے موجود ہے۔ آپ کو فکر فردا کی ضرورت نہیں۔ جب آپ حاجت مند ہوں بیت المال میں جائیے اور اپنا حق لے آئیے۔ پھر بنک ڈپازٹ اور انشورنس پالیسی کی کیا ضرورت۔ آپ اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر باطمینان تمام دنیا سے رخصت ہو سکتے ہیں آپ کی پیچھے جماعت کا خزانہ ان کا کفیل ہے۔ بیماری، بڑھاپے، آفاتِ ارضی و سماوی ہر صورت حال میں بیت المال وہ دائمی مددگار ہے جس کی طرف آپ رجوع کر سکتے ہیں۔ سرمایہ دار آپ کو مجبور نہیں کر سکتا کہ آپ اسی کی شرائط پر کام کرنا قبول کر لیں۔ بیت المال کی موجودگی میں آپ کے لیے فاقہ اور برہنگی اور بے ماے گی کا کوئی خطرہ نہیں۔''

(انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل ص: ۴۰-۴۳)

تعلیمات

● موجودہ نظام تعلیم ● تعلیم میں جدید وقدیم کا جوڑ ● میدان علم کا امام

موجودہ نظامِ تعلیم

''موجودہ نظامِ تعلیم میں ملّتِ اسلامیہ کے نونہالوں کی تعلیم وتربیت کے لیے جو انتظام کیا جاتا ہے، وہ دراصل ان کو اس ملت کی پیشوائی کے لیے نہیں بلکہ اس کی غارت گری کے لیے تیار کرتا ہے۔ ان درس گاہوں میں آپ کو فلسفہ، سائنس، معاشیات، قانون، سیاست، تاریخ اور دوسرے تمام وہ علوم پڑھائے جاتے ہیں جن کی مارکیٹ میں مانگ ہے مگر آپ کو اسلام کے فلسفے، اسلام کی اساس حکمت، اسلام کے اصول معیشت، اسلام کے اصول قانون، اسلام کے نظریۂ سیاسی اور اسلام کی تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کی ہوا تک نہیں لگنے پاتی۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ آپ کے ذہن میں زندگی کا پورا نقشہ اپنے تمام جزئیات اور تمام پہلوؤں کے ساتھ بالکل غیر اسلامی خطوط پر بنتا ہے۔ آپ غیر اسلامی طور پر سوچنے لگتے ہیں۔ غیر اسلامی نقطۂ نظر سے زندگی کے ہر معاملے کو نہ دیکھتے ہیں اور نہ دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اسلامی نقطۂ نظر کبھی آپ کے سامنے آتا ہی نہیں۔ منتشر طور پر کچھ معلومات اسلام کے متعلق آپ تک پہنچتی ہیں مگر وہ غیر مستند اور بسا اوقات اوہام وخرافات کے ساتھ ملی جلی ہوتی ہیں۔ ان معلومات سے اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ آپ ذہنی طور پر اسلام سے اور زیادہ بعید ہوجاتے ہیں۔ آپ میں سے جو لوگ محض آبائی مذہب ہونے کی وجہ سے اسلام کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے ہیں، وہ دماغی طور پر غیر مسلم ہوجانے کے باوجود کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو سمجھاتے رہتے ہیں کہ اسلام حق تو ضرور ہوگا اگرچہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور جو لوگ اس عقیدت سے بھی خالی ہوچکے ہیں وہ اسلام پر اعتراض کرنے اور اس کا مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتے۔'' (خطبہ تقسیم اسناد ۱۹۴۰ء)

تعلیم میں جدید وقدیم کا جوڑ

''جدید تعلیم وتہذیب کے مزاج اور اس کے طبیعت پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح

ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت کے بالکل منافی ہے۔ اگر ہم اس کو بجنسہٖ لے کر اپنی نو خیز نسلوں میں پھیلائیں گے تو ان کو ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے کھو دیں گے۔ آپ ان کو وہ فلسفہ پڑھاتے ہیں جو کائنات کے مسئلے کو خدا کے بغیر حل کرنا چاہتا ہے۔ آپ ان کو وہ سائنس پڑھاتے ہیں جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کا غلام ہے۔ آپ ان کو تاریخ اور سیاسیات، معاشیات، قانون اور تمام علوم عمرانیہ کی وہ تعلیم دیتے ہیں جو اپنے اصول سے لے کر فروع تک اور نظریات سے لے کر عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصول عمران سے یکسر مختلف ہے۔ آپ ان کی تربیت تمام تر ایسی تہذیب کے زیر اثر کرتے ہیں جو اپنی روح اور اپنے مقاصد اور اپنے مناہج کے اعتبار سے کلیتہً اسلامی تہذیب کی ضِد واقع ہوتی ہے۔ اس کے بعد کس بنا پر آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی نظر اسلامی نظر ہوگی۔ ان کی سیرت اسلامی سیرت ہوگی۔ ان کی زندگی اسلامی زندگی ہوگی۔ قدیم طرز پر قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم اس نئی تعلیم کے ساتھ بے جوڑ ہے اس قسم کے عملِ تعلیم سے کوئی خوش گوار پھل حاصل نہ ہوگا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے فرنگی اسٹیمر میں پرانے بادبان محض نمائش کے لیے لگا دیئے جائیں مگر ان بادبانوں سے فرنگی اسٹیمر قیامت تک اسلامی اسٹیمر نہ بنے گا۔ (تنقیحات)

میدانِ علم کا امام

''جو گروہ خیالات کے میدان میں امام بنتا ہے اور کائنات فطرت کی طاقتوں کو اپنے علم سے مسخر کر کے ان سے کام لیتا ہے اس کی امامت صرف خیالات ہی کے عالم تک محدود نہیں رہتی بلکہ زندگی کے پورے دائرے پر چھا جاتی ہے۔ زمین پر اس کا تسلط ہو جاتا ہے۔ رزق کی کنجیاں اس کے قبضے میں ہوتی ہیں۔ حاکمانہ اختیارات اسے حاصل ہوتے ہیں۔ اس لیے انسانی حیاتِ اجتماعی کا سارا کاروبار اس ڈھنگ اور نقشہ پر چلنے لگتا ہے جس پر وہ گروہ اپنی ذہنیت اور اپنے زاویۂ نظر کے مطابق اسے چلانا چاہتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ گروہ جس کو یہ تسلّط دنیا اور اس کی معاملات پر حاصل ہے۔ خدا سے پھرا ہوا ہو تو اس کے حیطۂ اقتدار میں رہتے ہوئے کوئی ایسا گروہ پنپ نہیں سکتا جو خدا کی طرف پھرنا چاہتا ہو۔ جس گاڑی میں آپ بیٹھے ہوئے ہیں اگر

اس کا ڈرائیور اسے کلکتہ کی طرف لے جارہا ہو تو آپ کراچی کی طرف جا ہی کب سکتے ہیں چارو ناچار آپ کو اسی طرف جانا پڑے گا۔ جدھر ڈرائیور جانا چاہتا ہے۔ آپ بہت بگڑیں گے تو اتنا کرلیں گے کہ اس گاڑی میں بیٹھے ہوئے اپنا رخ کلکتہ سے کراچی کی طرف پھیرلیں اور برضا و رغبت نہ سہی کشاں کشاں اس منزل پر جا پہنچیں جو آپ کی منزل مقصود کے عین مخالف سمت میں واقع ہے۔" (نیا نظام تعلیم ص:۱۳۰،۱۴)

تعارفِ تصانیف

مولانا مودودی کی درجنوں تصانیف ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مولانا ان بے شمار مصنفوں میں سے محض ایک مصنف نہیں ہیں، جو ہر زبان میں اس کے علم و ادب کے ذخیرے میں اضافہ کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں جو تصنیف و تالیف کو پیشے کے طور پر اختیار کرتے اور پھر اسے دیگر پیشوں کی طرح پابندی سے کرتے رہتے ہیں۔ ان کے پیش نظر اول تو کوئی خاص مقصد تصنیف و تالیف، علم و ادب کی خدمت اور حصولِ معاش کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو اس کی خدمت بھی لوح و قلم سے آگے بڑھ کر انجام دینا ان کے پیش نظر نہیں ہوتا۔

مولانا ان مصنفین سے مختلف نوعیت کے مصنف ہیں۔ انھوں نے شاید ہی کوئی کتاب محض علم و ادب کی خدمت کے پیشِ نظر لکھی ہو اور شاید ہی کوئی کتاب محض حصولِ معاش کی خاطر ترتیب دی ہو۔ وہ ایک مقصد زندگی رکھتے ہیں۔ اس مقصد زندگی کے لیے عملی جدوجہد میں عمر کا بہترین حصہ صرف کر چکے ہیں اور اس مقصد زندگی کو برپا کرنے کے لیے باقاعدہ ایک تحریک زندگی کے میدانِ عمل میں برپا کر رکھی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے سامنے پے در پے مسائل اٹھتے ہیں۔ سوالات کھڑے ہوتے اور کیے جاتے ہیں۔ لوگ ان سے ان کی بات اور مقصد سمجھنا چاہتے ہیں۔ لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں اور زندگی کا ہر ہر شعبہ مختلف نئے نئے مسائل، سوالات اور اعتراضات کی زد میں آتا رہتا ہے۔ مولانا ایک مشن کے داعی کی حیثیت سے ان مسائل کا حل، ان سوالات کے جوابات، ان اعتراضات کی صفائی اور مختلف غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے رہتے ہیں۔ پھر اس کے علاوہ خود انھیں اپنے مشن کی وضاحت کے لیے اس کے مختلف گوشوں کی نقاب کشائی کے لیے اسلامی نظام کو قابلِ عمل نظامِ زندگی ثابت کرنے کے لیے اس کے گوشے گوشے کو جدید ذہنوں کے مطابق بیان کرنا پڑتا ہے اور بار بار لہجہ، انداز، دلائل اور طرز بیان بدل بدل کر بیان کرنا پڑتا ہے۔ ایک ایک پھول کے مضمون کو سو سو رنگ میں بیان کرنا ہوتا ہے تا کہ دعوت بھی اوجھل نہ ہو اور نئے مسائل بھی اپنے جدید تقاضوں کے ساتھ حل ہوتے رہیں۔ بس یہی سب کچھ

مل جل کر مولانا کی تصانیف کا ڈھانچہ تیار کرتے رہتے ہیں۔ مولانا کی موجودہ تصانیف کا پیش تر حصہ اسی پس منظر کے ساتھ تیار ہوا ہے۔

عام لوگ قرآن پڑھتے ہیں جگہ جگہ قرآن کے بیان اور ادب کے دعوے خود قرآن میں پڑھتے ہیں، لیکن قرآن کی عربی سطروں کے نیچے جو اردو ترجمہ انھیں ملتا ہے، وہ دل پر اثر انداز ہونا تو الگ رہا آسانی سے ذہن کے اندر بھی نہیں اترتا۔ اس پر لوگ حیران ہوتے ہیں اور قرآن کے دعوائے بلاغت پر متحیر ہو کر چپ ہو رہتے ہیں۔ لیکن دلوں میں بے اطمینانی رستی رہتی ہے، جو آگے جا کر غلط نظریات کی قبولیت کے لیے کھاد کا کام کرتی ہے۔ مولانا اس کی شدید ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ قرآن کی ادبی شان قاری پر اردوئے مبین کی صورت میں ظاہر ہو اور جدید ذہن قرآن کے قریب جا سکے اور اس کے اندر اٹھنے والے نئے نئے سوالات کو جدید ضروریات کے مطابق حل کیا جا سکے۔ بس یہی ضرورت تفہیم القرآن کی معرکہ آرا تفسیر لکھنے پر تیار کر دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ضرورت تفسیر لکھنے کی محض ''سعادت'' حاصل کرنے سے کہیں بڑھ چڑھ کر فریضہ کی نوعیت رکھتی ہے۔ لوگ سود کے بارے میں سوالات اٹھاتے ہیں۔ دارالحرب میں اس کا جواز، دارالکفر میں اس کی ضرورت، سود کی اقسام، جدید دور کے اقتصادی نظریات کے درمیان اس کی اہمیت، جدید تجارتی لین دین، بین الاقوامی تجارت اور بنکنگ میں اس کی ناگزیر ضرورت اور ایک اسلامی نظام کی طرف سے سود کی ممانعت کی علّت، غرض کہ بے شمار سوالات ہیں جو کفار تو کیا خود مسلمانوں کو بھی سود کے بارے میں الجھاتے اور پریشان کرتے ہیں، جن کے پاس دولت کے انبار ہیں، وہ بھی اسے بہ طور اضطرار اختیار کرنا ناگزیر سمجھتے ہیں۔ رِبا اور سود کا فرق جاننے اور ایک مسلم ریاست میں سود کے لیے جواز نکالنے کی ضرورت پر سمپوزیم منعقد ہو جاتے ہیں اور وقت کا یہی تقاضا ''اسلام اور جدید معاشی نظریات'' ''اور سود'' جیسی دو نہایت بلند پایہ علمی اور تحقیقی تصانیف تیار کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ بس مولانا کی بیشتر تصانیف کا پس منظر یہی ہے۔ ان میں سے ہر ہر تصنیف کو زمانے نے خود آواز دے کر اسلام کی وضاحت کے لیے بلایا ہے تو مولانا نے اس آواز کے جواب میں قلم اٹھایا ہے۔ ان تصانیف میں سے ہر ہر کتاب اسلامی نظامِ حیات کی عظیم الشان عمارت کی ایک ایک اینٹ اور اس کا قلمی اور کاغذی خاکہ جس کے اندر سے اسلامی نظام کی پوری عمارت چشمِ تصوّر پر ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔

اب میں ان بے شمار تصانیف میں سے چند اہم تصانیف کا مختصر اور ہلکا پھلکا تعارف

کراتا ہوں۔ تا کہ ان کا موضوع اور ان کی اہمیت آپ کے سامنے آ سکے۔ آپ محسوس کریں گے کہ ان کا مطالعہ ایک جدید ذہن کو اسلام فہمی کے لیے کتنا ضروری اور وقت کا اہم ترین تقاضا ہے اور ان کا مطالعہ کیے بغیر نہ ان تقاضوں کو اسلام کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے اور نہ انھیں پورا کیا جا سکتا ہے۔

تفہیم القرآن

یہ قرآن پاک کی تفسیر ہے جو جدید ذہن کو اس ربانی کتاب کی روح تک لے جانے کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس میں مولانا نے دو پہلوؤں کا خصوصی اہتمام کیا ہے۔ ایک تو قرآن کے ادبی اعجاز کو حتی الامکان ہو بہو عربی سے اردوئے مبین میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ قاری یہ محسوس کر سکے کہ کیا وجہ تھی کہ عتبہ جیسے کافر کا بھی اس کی چند آیات سن کر چہرہ متغیر ہو جاتا تھا۔ اور وہ بے تاب ہو کر پڑھنے والے کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا تھا تا کہ یہ اعجاز اس کے دل و دماغ کو مسخر ہی نہ کر لے۔ کیا وجہ تھی کہ چند آیات سن کر ہی نجاشی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی اور وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت قرآن کی بتائی ہوئی حیثیت سے تنکے کے برابر بھی کم و بیش نہیں ہے، کیا وجہ تھی کہ تیغ بکف عمرؓ چند آیات سن کر ہی موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا اور کہتا تھا کہ مجھے بھی اس کے ورق دو۔ میں بھی اسے پڑھنا چاہتا ہوں۔ وہ وجہ قرآن کا ادب اس کے بیان کی شوکت۔ اس کے الفاظ میں الوہیت کی ایک حیرت انگیز شان اور اس کے انداز خطاب میں دلوں کو مسخر کر لینے والی ایک بالاتر لذت تھی۔ یہ اس کی اعلیٰ درجہ کی غیر انسانی الٰہی ادبی شان تھی۔ مولانا نے اپنے قلم کی ساری قوت اس پر صرف کی ہے کہ قرآن کے الفاظ و معانی کو حدود کے اندر رہتے ہوئے اس کیفیت اور ادب کو اردو کی طرف بھی منتقل کیا جائے، لیکن چوں کہ عربی اور اردو کے انداز بیان اور تراکیب میں فرق ہے، اس لیے مولانا نے لفظی ترجمے کی بہ جائے ترجمانی کا انداز اختیار کیا ہے۔ یعنی ایک آیت جو مفہوم اور اثر عربی میں ڈالتی ہے مولانا نے کوشش کی ہے کہ اردو میں اس مفہوم اور اثر کو اپنے الفاظ میں قریب ترین لفظی پابندی کے ساتھ ادا کیا جائے۔ یہ ایک مشکل ترین علمی کام ہے جو انھوں نے اپنے ذمّے لیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اس کا حق ادا کیا ہے۔ سورۂ انفال یا سورۂ توبہ کی ترجمانی جب رواں دواں اردو میں پڑھی جاتی ہے تو حقیقتاً دل و دماغ کو مسخر کرتی چلی جاتی ہے اور یہ قرآن کے ادبی اعجاز کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جسے مولانا نے اپنی ترجمانی میں منعکس کرنے کی کوشش کی ہے۔

تفہیم القرآن کی دوسری خوبی اس کے تفسیری حاشیے ہیں جو قرآن فہمی میں جدید ذہن کی مشکلات کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ لغت، کلام اور منطق کی بحثوں سے بچ کر دورِ حاضر کے مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے اور جو جو ممکن مشکلات قاری کو مطالعہ قرآن میں پیش آسکتی ہیں، ان سب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کی تیسری خوبی ہر سورت پر ایک تعارفی دیباچہ ہے، جو اس کے مرکزی مضمون، اس کے عام مباحث، اس کے تاریخی پس منظر۔ شانِ نزول اور زمانۂ نزول پر بحث کرتا ہے اس طرح پوری سورت کا مضمون اپنے مطالب کے ساتھ قاری کے سامنے سمٹ کر آجاتا ہے اور فہم قرآن کے لیے یہ ایک نہایت مفید ترکیب ہے۔

چوں کہ مولانا اپنی زندگی میں وہی کام سرانجام دے رہے ہیں، جو قرآن چاہتا ہے کہ ملت مسلمہ انجام دے۔ وہی زندگی لانے کی سعی میں مصروف ہیں جو قرآن نے اپنے لانے والے کے ذریعے پیش کیا ہے، اس لیے قرآن کی روح پوری طرح تفہیم القرآن کے ذریعے سمٹ کر سامنے آجاتی ہے۔ قرآن متفرق شذرات کا ایک ضخیم مجموعہ نہیں بلکہ ایک منظّم، مرتّب اور منضبط دعوت کا آرگن معلوم ہوتا ہے اور تفہیم القرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے آدمی محسوس کرتا ہے کہ وہ وہی کچھ سمجھ رہا ہے جو کچھ قرآن سمجھانا چاہتا ہے۔ یہ قلبی اور ذہنی اطمینان ایک بہت بڑی دولت ہے، جو تفہیم القرآن کے مطالعے سے اس کے قاری کو میسر آتی ہے۔

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

اس کتاب میں مولانا نے قرآن کی چار اہم ترین اصطلاحات پر بحث کی ہے۔ الٰہ، رب، عبادت اور دین۔ حقیقت میں یہ اصطلاحات قرآن فہمی کی کلید ہیں۔ قرآن کا قاری جب تک ان اصطلاحات کے صحیح صحیح مفہوم سے آگاہ نہ ہو، وہ قرآن کا فہم حاصل نہیں کرسکتا۔ قرآن کا مطالعہ کرنے والے کے ذہن میں الٰہ کا مفہوم اگر صرف اس قدر رہو کہ جسے ماتھا ٹیکا جائے۔ دین کا مفہوم محض ایک ایسا مذہب ہو جو انسان کا پرائیویٹ مسئلہ ہو۔ عبادت کا مطلب محض پوجا پاٹ ہو اور رب کا مطلب محض مالک ہو تو پھر انسان قرآن کی روح تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لیے کہ یہی تو وہ سب سے بڑی چار اصطلاحات ہیں جو قرآن فہمی کے چار بڑے دروازے ہیں اور جنھیں قرآن اپنے خاص اصطلاحی معنوں میں جگہ جگہ استعمال کرتا ہے۔ جب تک ان اصطلاحات کے جا بجا استعمال کے موقع ومحل اور مفہوم سے قاری اچھی طرح آگاہ اور رمز شناس نہ ہو، اسے قرآن کی سطح کے نیچے اتر کر اس کا حقیقی مفہوم پالینے کی سعادت کبھی حاصل نہیں ہوسکتی۔

مولانا نے مطالعہ قرآن کرنے اور اسلامی نظام فکر کا فہم حاصل کرنے والوں کے لیے ان قرآنی اصطلاحات کا وسیع مفہوم واضح کر کے ایک بہت بڑی قرآنی خدمت انجام دی ہے اور جب تک آدمی ان اصطلاحات کے صحیح صحیح فہم سے آگاہ نہ ہو وہ قرآن کے ساتھ ساتھ اس کا مطلب سمجھتا ہوا چند قدم بھی نہیں چل سکتا۔ یہ کتاب اپنی علمی افادیت کے لیے بڑے پایے کی کتاب ہے اور اس قابل ہے کہ اسلامیات کے ایم۔ اے کے کورس میں لگائی جائے تاکہ اسلامیات کے طلباء قرآن فہمی کے ان بنیادی نکات سے پوری طرح آگاہ ہوں۔

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

آج کل ہمارے ہاں کلچر اور ثقافت کے بارے میں بڑا ذہنی انتشار پایا جاتا ہے اور سوسائٹی کے رہنما طبقے میں اسلامی کلچر کے بارے میں بہت کچھ غلط فہمیاں ہیں۔ اسلام سے بے خبری کے باعث ان کے نزدیک وہ سب کچھ جو مسلمان کریں اسلامی ہوتا ہے اور جو کچھ انھیں پسند ہو وہ اسلام کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اسلام کو بھی اس کی تائید کرنی چاہیے بلکہ حتی الامکان اسلام کو اس کے کار ثواب ہونے کے بارے میں فتوے دینا چاہیے اگر اسلام کو جدید تقاضوں کا شعور اور اپنی زندگی کی ضرورت باقی ہے۔ یہ طرز فکر مغربی تہذیب سے ذہنی مرعوبیت اور شکست اور اسلام سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

کیا اسلام بھی کچھ تہذیبی اقدار دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے؟ کیا اس نے بھی کلچر اور ثقافت کے بارے میں کوئی رہ نمائی مسلمانوں کو دی ہے۔ خود کلچر اور ثقافت کیا شے ہیں۔ اسلامی تہذیب کن بنیادوں پر قائم اور اس کے اصول کیا ہیں؟ کیا توحید، رسالت اور آخرت کے تصورات بھی اپنے اندر کچھ تہذیبی اور کلچرل رہ نمائی کا مواد رکھتے ہیں؟ یہ وہ موضوعات ہیں جن پر مولانا مودودی نے اس کتاب میں بحث کی ہے۔ کسی عقل مند کو مسلمانوں کی تہذیب صرف ایک ٹونٹی اور لوٹا اور ایک اونچا پاجامہ نظر آتا ہے اور کسی ذہین آدمی کو رقص و سرود میں بھی اسلامی تہذیب کے مظاہر نظر آجاتے ہیں اور بڑے بڑے مسلمان اساتذہ فن کی موجودگی ان فنون کے اسلامی ہونے پر گویا خود گواہ ہے۔ ان ساری ہی غلط فہمیوں کا مولانا نے نہایت علمی طریق سے ازالہ کیا ہے اور ایک سلیم الفطرت انسان کو اسلامی تہذیب کے تمام گوشے ایک ایک کر کے سمجھا دیے ہیں۔ یہ کتاب بھی بہت بلند پایہ رکھتی اور اسلامیات منتہی درسیات میں شامل کیے جانے کے

قابل ہے۔ مولانا نے اس دور تہذیب وتمدن اور روشن خیالی میں یہ کتاب لکھ کر اسلام پسند طبقے کی ایک بہت بڑی خدمت سر انجام دی ہے۔

الجہاد فی الاسلام

اسلام میں جہاد ایک نہایت اہم جز و دین ہے۔ لیکن مخالفین اسلام نے اسی کو تختۂ مشق بنا کر اسلام کو زیادہ سے زیادہ بھیانک بنانے کی کوشش کی ہے۔ دور زوال کے مسلمانوں نے بھی غیر مسلموں کے اعتراضات کے مقابلے میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کر کے اس عظیم الشان جزِ دین کو عذر گناہ بتا کر رکھ دیا ہے۔ خصوصاً یورپ کے مقابلے میں تو معذرت کرتے کرتے مسلمانوں کے جدید رہ نما تھک تھک گئے اور خود وہ لوگ جن کی تلواروں سے بے گناہوں کے خون کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور جن کے وحشیانہ بموں نے انسانوں کو چیونٹیوں کی طرح جھلس کر رکھ دیا تھا۔ مسلمانوں کے جہاد کے سامنے امن کے دیوتا بنے پھرتے تھے۔ مولانا مودودی نے اس مرعوبانہ اور معذرت خواہانہ ذہن کے مقابلے میں پہلی بار جہاد کی ضرورت اور اہمیت اسلام کی امن پسندانہ جنگ اور وفادارانہ صلح کی اصل تصویر پیش کی ہے۔ پھر اس کے مقابلے میں دوسرے مذاہب میں جنگ کی حیثیت کیا ہے اور دور جدید میں تہذیب حاضر کس طرح جنگیں برپا کر رہی اور انسانیت کو بلا امتیاز مرد وزن اور مقاتل وغیر مقاتل تباہ کر رہی ہے اس کا مکمل نقشہ کھینچا ہے۔ علامہ اقبال نے اس کتاب کے بارے میں درست فرمایا تھا کہ اردو میں اس موضوع پر اتنی جامع اور علمی کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ یورپ کے مقابلے میں ہر مسئلہ زندگی میں جس طرح دب کر اور معذرت کرتے ہوئے مرعوبانہ ذہن کے ساتھ تہذیب کے ہر جزو کی بے جا تاویل کرنے کی عادت بہت سے ہمارے مصنفین میں چلی آرہی ہے مولانا نے اس کتاب میں اس روش عام سے ہٹ کر استدلال کا بالکل ایک دوسرا ہی انداز اختیار کیا ہے۔ جو ٹھوس حقائق، وزنی استدلال، معقول مباحث اور تقابلی مطالعہ پر مبنی ہے اور انھوں نے ثابت کیا ہے کہ اسلام میں جنگ کا تصوّر ہی دراصل امن عالم کا ضامن اور ظالموں سے مظلوموں کے بچاؤ کا ذریعہ ہے۔ میری نظر میں یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اعلیٰ فوجی تعلیم کی درس گاہوں اور افسروں کی تربیت گاہوں کے نصاب میں شامل کی جانی چاہیے تاکہ مسلمان فوجی جان سکیں کہ اسلام کے اندر جنگ کا کیا مفہوم ہے اور وہ کن اعلیٰ تر مقاصد کے لیے لڑی جاتی ہے اور اس کے اخروی انعامات اور دنیوی برکات کیا کچھ ہیں۔

تجدیدواحیاے دین

اسلام ایک زندہ نظریہ حیات ہے، جو خالق کائنات نے اپنے بندوں پر اس لیے نازل کیا ہے کہ انسان اس کے مطابق زندگی گزار کر فلاح حاصل کر سکیں۔ حضوؐر نے اس نظام کو مکمل کر کے اپنی تمام تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ اسلامی معاشرے میں نافذ کر دیا۔ خلافت راشدہ نے اسے ایک طویل عرصے تک نکتہ بہ نکتہ طریق نبوی کے مطابق چلایا اور جب تاریخ کے ایک غلط الٹ پھیر سے ملوکیت کا اچانک اسلامی نظام پر قبضہ ہو گیا تو اس نے اسلامی نظام کے اندر اپنی خواہشات کے مطابق آہستہ آہستہ اپنے لیے راستے بنانے اور گنجائش پیدا کرنی شروع کر دی یہ راستے اور گنجائشیں ہی بالآخر اسلامی نظام کے رُوئے تاباں کو گرد آلود کرنے کا باعث بنیں اور بہ تدریج یہ تک پہچاننا مشکل ہو گیا کہ اصل اسلام کیا ہے اور اس کی تفصیلات کیا تھیں؟ جب بھی ملّت مسلمہ کے ضمیر میں اس ضرورت کا احساس ابھرا کہ اسلام کے چہرے پر حوادث کی جمی ہوئی تہ بہ تہ گرد صاف ہو تو تاریخ اسلام کے اندر سے کوئی نہ کوئی شخصیت ضرور ابھر آئی جس نے اس کے رخِ تاباں کو صاف کیا۔ اس کے چہرۂ منوّر کو تابندہ تر کیا اس کے اوپر جمی ہوئی گرد و حوادث و بدعات کو جھاڑا اور اسلام کا چہرۂ روشن زمانے کے سامنے کر دیا۔ اس کش مکش میں چاہے اسے کتنی ہی کھکھیڑ اٹھانی اور مصائب برداشت کرنے پڑے ہوں اور بدعت کے متبعین نے چاہے راستے میں کتنے ہی کانٹے بچھائے ہوں لیکن سنت کے وہ علم بردار ہمیشہ سر بکف اور کفن بر دوش رہے اور اپنے کام میں کسی سختی یا ابتلا یا آزمائش کے باعث کبھی کوئی لچک نہ پیدا ہونے دی۔ یہی وہ بزرگ ہستیاں ہیں جو امت کے ۱۳۰۰ سالہ پُر آشوب دورِ زوال میں تجدید دین کا کام کرتی رہی ہیں اور یہی بزرگ مرنے کے بعد مجدّدین اسلام کہلاتے رہے ہیں۔

مولانا مودودی نے اپنی اس معرکہ آرا کتاب میں انھیں بزرگوں کے کارناموں پر ایک مختصر لیکن جامع تبصرہ کیا ہے اور روشنی ڈالی ہے کہ انھوں نے یہ کار تجدید کن کن مراحل سے گزر کر انجام دیا اور ان کا یہ کام کس نوعیت اور پیمانے کا تھا۔ یہ ایک نہایت نازک اور کٹھن کام ہے جو مولانا نے اس کتاب کی تالیف کے ذریعے انجام دیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر آدمی میں یہ بصیرت پیدا ہو جاتی ہے کہ آیندہ بھی جسے یہ کام انجام دینا ہو اسے اپنے کام میں کن کن حدود کا لحاظ رکھنا چاہیے اور امت میں گہری پیوست شدہ کم زوریوں کو دور کرنے کے لیے کیا حکمتِ کار اختیار کرنی چاہیے۔

تنقیحات

ہندستان میں انگریزوں کی آمد اور مسلمانوں کی سیاسی مغلوبیت نے مسلمانوں سے صرف تخت و تاج ہی نہیں چھینا بلکہ تہذیب جدید نے ان کے ذہنی اعتماد، قلبی اطمینان اور ایمان و اعتقاد کو بھی تہ و بالا کر دیا اور مسلمانوں کی جس جس چیز پر مغربی تہذیب نے ناک بھوں چڑھائی مسلمانوں نے اس چیز کے لیے معذرت کی اور اسے اپنے سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ ان کا لباس تھا، ان کی نشست و برخاست تھی، ان کی زبان تھی یا ان کے نہایت قیمتی اعتقادات تھے۔ ہر چیز سے وہ بری الذمّہ ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں اچھا خاصا گروہ ایسا تیار ہو گیا جس کے لیے یورپ سے آئی ہوئی ہر بات وحی بن گئی اور وحی سے آئی ہوئی ہر بات مشکوک ہو گئی۔ حد یہ کہ وہ بجلی کے بلب جلتے دیکھ کر اور آسمان پر غبارے اڑتے اور بے تار برقی پر پیغامات سن سن کر معجزات تک سے معذرت کرنے اور ان کی تاویلیں کرنے لگے۔ جب یہ ذہن کسی قوم میں پرورش پانے لگ جائے تو پھر وہ قوم اپنے ہاتھوں میں کدالیں تھام کر خود اپنے لیے قبریں کھودنے لگتی ہے اور اسے کوئی شخص معجزے سے بھی زندہ نہیں رکھ سکتا۔ مولانا مودودی نے مسلمانوں کے اندر پیدا ہوتے ہوئے اس ذہن پر شدید ضرب لگائی ہے اور اپنی بے پناہ قوت استدلال اور زورِ بیان سے انھیں اس خطرناک راستے پر جانے سے روکا ہے۔ یہ کتاب مولانا مودودی کے علم کلام کا ایک بیش بہا نمونہ ہے اور تہذیب مغرب کے خطرناک زہر کا انتہائی موثر اور قیمتی تریاق ہے۔ اس کا ہر مضمون فرنگی شیشہ گروں کی اس چمکتی تہذیب پر ہتھوڑے کا کام کرتا ہے۔ جس نے بھی یہ کتاب پڑھی ہے وہ خوب جانتا ہے کہ اس کا ایک ایک مضمون ذہنی مرعوبیت اور غلامی کے خلاف کتنا موثر ہتھیار رہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ کالجوں اور اونچی سروسز کے مسلمانوں میں پھیلایا جائے تاکہ ان کے ذہنوں پر سے مغرب کی مرعوبیت کا پردہ اٹھے۔ ان کی اصلاح سے قوم کے دوسرے افراد بھی ان سے نمونہ پکڑیں گے۔

رسائل و مسائل

نوعیت کے اعتبار سے یہ ایک نہایت دل چسپ معلوماتی اور اپ ٹو ڈیٹ کتاب ہے، جو پانچ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ مولانا مودودی ایک نظریۂ حیات کے حامل ہیں، بلکہ اسے لے کر اٹھے ہیں اور اس کے نفاذ کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ کچھ وہ موضوعات ہیں جن پر وہ اپنے

مشن کی وضاحت کے لیے خود لکھتے اور تقریریں کرتے ہیں اور کچھ وہ موضوعات ہیں جو ان کے مشن کو سمجھنے کے لیے سوالات و اعتراضات کی شکل میں اندرون و بیرون ملک سے مسلسل خطوط آتے رہتے ہیں اور مولانا ان خطوط کا جواب لکھتے اور لکھاتے رہتے ہیں۔ اس کتاب میں انھی متفرق موضوعات پر سوالات کے جوابات کو یکجا کر دیا گیا ہے، اسلام کی روشنی میں زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل کا شعور اور فہم پیدا کرنے کے لیے یہ نہایت ہی مفید کتاب ہے۔ قدیم سے قدیم اور جدید سے جدید ذہن کا آدمی اپنے لیے اس کتاب کے اندر دلچسپی اور فہم و شعور کا بے اندازہ مواد پا سکتا ہے۔ رنگ برنگ کے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً قرآن و حدیث، فقہ، سیاسیات، معاشیات معاشرتی مسائل، علمی اور تعلیمی امور غرض ہر نوعیت کا مسئلہ اور اس کا جواب موجود ہے۔ مولانا مودودی کی حاضر دماغی، حاضر جوابی اور جامع نگاری کا بہترین نمونہ اس کتاب میں موجود ہے۔

دینیات

یہ کتاب اسلام کی ابتدائی معلومات کے لیے نہایت مفید ہے اور مولانا مودودی کے نظریۂ اسلام کا تعارف جب اس کتاب کے چند صفحات پڑھنے سے ہی ہوتا ہے تو قاری اچانک چونک پڑتا ہے۔ سویا ہوا ضمیر بیدار ہونے لگتا ہے۔ مذہب کا رسمی اور روایاتی تصوّر ٹوٹنے لگتا ہے اور انسان کے اندر اس کا فعال انسان جو اپنے دین کو چھوڑ کر ہر چیز کے لیے فعال ہوتا ہے۔ دین کے بارے میں بھی عملی نکتۂ نظر سے غور کرنے لگتا ہے۔ پھر جوں جوں اس کتاب کا مطالعہ جاری رہتا ہے ایک ذہنی تغیر کی رو آدمی کے اندر داخل ہوتی چلی جاتی ہے اور کتاب کا مطالعہ ختم ہونے پر انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ کچھ بدل گیا ہے، کوئی داخلی تغیراتی عمل اس پر وارد ہو گیا ہے اور اس نے کچھ پا لیا ہے۔ اس نے اسلام کا صحیح تصوّر جان لیا ہے جسے وہ رسم سمجھتا رہا تھا۔ وہ اس کا دین ہے جو زندگی بھر اپنے مالک کی اطاعت کا دوسرا نام ہے اور اطاعت سے مراد زندگی کے ہر گوشے میں اطاعت ہے اور اسی کا دوسرا نام عبادت ہے۔ جب یہ حیرت انگیز انکشافات ایک روایتی دینداری والے ذہن پر منکشف ہوتے ہیں۔ تو اس کی مسرت بے ٹھکانہ اور اس کی حیرت بلا نہایت ہوتی ہے۔ اسے پہلی بار احساس ہوتا ہے کہ دل و دماغ کے درمیان کوئی پردہ سا تھا جو اٹھ گیا ہے اور اب وہ دل و دماغ کی داخلی کیفیات کو بھی محسوس کرتا اور ان پر نگاہ رکھتا ہے۔ اسلام کے مفہوم کا یہ انکشاف انسان پر کئی دن تک ایک عجیب سی سرخوشی کا عالم طاری رکھتا ہے۔

اس کتاب میں مولانا نے نہایت سہل انداز میں اسلام اور اس کے تمام مقتضیات، ضروریات اور تفصیلات پر بحث کی ہے۔

خطبات

مولانا مودودی کے ۲۹؍آسان لیکچرز (جمعہ کے خطبوں) کا یہ مجموعہ اسلام کی بنیادی عبادات کے بارے میں صحیح صحیح معلومات حاصل کرنے کے لیے نہایت مفید ہے۔ یہ صرف معلومات ہی فراہم نہیں کرتا بلکہ ان عبادات کی اصل روح کی نقاب کشائی بھی کرتا ہے۔ مولانا کی اس کتاب کے سیکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں میں اس کی مانگ حیرت انگیز ہے۔ قرآن کریم شائع کرنے والی ایک مشہور فرم کا مالک تو ان خطبات پر اتنا فریفتہ ہوا کہ اس کے بلاک بنوا کر چھوٹے چھوٹے پمفلٹوں کی شکل میں ہزاروں کی تعداد میں کئی کئی ایڈیشن چھاپ چکا ہے۔ ان پمفلٹوں میں حقیقت صوم وصلوٰۃ اور حقیقت جہاد تو ایسے پمفلٹ ہیں کہ جب پہلے پہل ان کا بنگالی میں ترجمہ ہوا تو بنگالی مسلمانوں میں یہ دونوں بے حد مقبول ہوئے اور ہزاروں کی تعداد میں چھپے اور اب تک نکل رہے ہیں۔ کم پڑھے لکھے عوام میں دین اسلام کا شعور پیدا کرنے کے لیے اس سے مفید تر اور کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری ہے۔ آدمی کتاب شروع کرتا ہے تو اس کی کیفیت اور ہوتی ہے اور ختم کرتا ہے تو اس کی کیفیت اور ہوتی ہے۔ مولانا مودودی کے مشن اور دعوت کو عوام میں متعارف اور مقبول کرنے میں اس کتاب کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اور کچھ اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ مولانا نے یہ تقریریں آج سے ۲۲، ۲۳ سال پہلے پنجاب کے دیہاتی مسلمان میں اسلام کا فہم پیدا کرنے کے لیے دیہات میں جمعہ کے خطبات کی شکل میں کی تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ جس مقصد کے لیے اور جس قسم کے لوگوں کے لیے یہ تقریریں کی گئیں تھیں، وہی کام آج تک یہ کتاب انجام دے رہی ہے۔ یہ کتاب دیہاتی مبلّغین اور مساجد میں خطباتِ جمعہ کے لیے نہایت مفید ہے۔

تفہیمات

یہ کتاب پانچ جلدوں میں ہے۔ یہ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور ان تعلیمات سے متعلق اشکالات اور مباحث پر مبنی ہے۔ مختلف فلسفیانہ بحثیں جو آدمی کی ایمانیات پر اثر انداز ہونے والی اور اس کے روزمرّہ کے مسائل میں اس کی رہ نمائی کرنے والی ہیں اس کتاب میں درج ہیں۔ یہ مولانا

کے ان مضامین کا مجموعہ ہے، جو دین کے مختلف شعبوں کی تشریح، توضیح، وضاحت اور حمایت میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ہر مضمون بڑا خیال انگیز اور ایمان افروز ہے اور قاری کی دینی معلومات میں اتنا بیش بہا اضافہ کرتا ہے کہ پھر وہ ہر مجلس میں دینی موضوعات پر گفتگو کرنے اور مفید مشورے اور رہ نمائی دینے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ایک مبلّغ دین کے لیے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر جس قسم کی بنیادی معلومات کی ضرورت ہے تا کہ وہ مختلف لوگوں کے شکوک و شبہات کا ازالہ کر سکے۔ اس کا کافی مواد اس کتاب میں موجود ہے۔ اسلامی نظریۂ حیات کا ایک مویّد کارکن اس کتاب کے مطالعے کے بغیر اپنے نکتۂ نظر کو زیادہ کامیابی سے ہر جگہ مؤثر طور پر بیان نہیں کر سکتا۔

اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر

یہ مختصر کتاب اسلامی عبادات میں نماز اور روزہ کے بارے میں نہایت تفصیل اور شرح و بسط سے بحث کرتی ہے۔ ان عبادات کے شرعی، اخلاقی، معاشرتی اور جسمانی فوائد۔ ان عبادات کی تہ میں کام کرنے والی حکمت اور مسلم معاشرے پر ان کے اثرات۔ ان عبادات کی روح اور ان کا ظاہری ڈھانچا۔ ان کی فرضیت کا بنیادی فلسفہ اور ان کے نفاذ سے مسلم معاشرے میں پیدا ہونے والی اجتماعی برکات۔ مولانا نے اس کتاب میں لفظ ''عبادت'' کا وہ وسیع مفہوم بیان کیا ہے جو ''اسلام'' اس سے مراد لیتا ہے اور جو محض ''پوجا پاٹ'' کے محدود مفہوم سے بہت وسیع معانی اپنے اندر رکھتا ہے۔ بلکہ تعمیر کردار انسانی اور اطاعت و نظم وضبط کا ایک بہترین مظاہرہ ہے۔ یہ کتاب معمولی فہم کے قاری سے کچھ زیادہ بلند معیار ہے اور سمجھنے کے لیے زیادہ فہم و شعور چاہتی ہے۔

اس کتاب کے ذریعے مولانا نے بتایا ہے کہ اسلامی عبادات محض چند رسوم نہیں ہیں جن کی ادائے گی سے رب کعبہ کی رضا حاصل ہو جاتی ہے۔ بلکہ یہ عبادات ایک وسیع تر مقصد زندگی کی تربیت کے لیے فرض کی گئی ہیں اور وہ وسیع تر مقصد زندگی مکمل اسلامی نظامِ حیات کا نفاذ ہے اس کے لیے پوری پوری جدّو جہد کرنا اور اس جدّو جہد کی راہ میں ساری مشکلات سہ جانا یہی تربیت ہے جو یہ اسلامی عبادات ایک مسلم کو دیتی ہیں۔

اسلام کا نظام حیات

یہ مولانا کی پانچ ریڈیائی تقاریر کا مجموعہ ہے۔ اس کتابچہ میں مولانا نے اسلامی نظام حیات کے مختلف شعبوں پر مختصر لیکن نہایت جامع تقاریر درج کی ہیں۔ اسلام کا سیاسی نظام، اخلاقی

نظام، معاشی نظام، معاشرتی نظام اور روحانی نظام۔ ان پانچ موضوعات پر یہ تقاریر ہیں جو اپنی افادیت کے لحاظ سے بڑی بڑی کتابوں پر بھاری ہیں اور ایک مختصر مطالعے سے قاری اسلام کے بارے میں نہایت عمدہ واقفیت حاصل کرلیتا ہے اور یہ فہم بھی پیدا کرلیتا ہے کہ اسلام حقیقتاً محض ایک جامد مذہب نہیں بلکہ ایک مکمل نظامِ زندگی ہے۔

پردہ

یہ کتاب اس نازک موضوع پر نہایت جامع بحث کرتی ہے جو موضوع اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان زبردست اختلافی مسئلہ سے مغربی تہذیب عورت کو گھر سے نکال کر بازاری زندگی میں جابجا گھسیٹتی پھرتی ہے اور عائلی ذمہ داریوں کے علاوہ اس پر معاشی، معاشرتی، سیاسی اور بہت کچھ مردوں کے دل بہلاوے کی ذمہ داریاں بھی ڈالتی ہے اور عورت کو بازار حیات میں لاکر اس کی چمک دمک سے اپنی ترقی اور جدیدیت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ مولانا نے مغربی تہذیب کے اس موقف کو دلائل کے ساتھ غلط ثابت کیا ہے، دلائل خود مغربی تہذیب کے اپنے گھر سے اس کے زبردست مبلغین اور فلسفیوں کے پاس سے فراہم کیے گئے ہیں۔ مغربی معاشرے میں عورت کی حیثیت مقام اور مظلومیت کے مختلف گوشوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور پھر اسلام کا متوازن معاشرتی نظام پورے دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ ایک پاکیزہ معاشرے کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ عورت کو اس کا اصلی مقام دے اور اس پر وہ بوجھ نہ لادے جس بوجھ کو اٹھانے کے لیے اسے پیدا ہی نہیں کیا گیا۔ مرد اور عورت کی زندگیاں خود فطرت کی طرف سے تقسیم کار کے اصول پر تخلیق کی گئی ہیں اور ان کا مزاج، ان کی جسمانی ساخت، ان کی صحت اور ان کی فطری ذمہ داریاں یہ سب تقاضا کرتی ہیں کہ معاشرے میں دونوں کا دائرہ کار مختلف ہو اور دونوں کو زندگی کے جوئے میں اس طرح نہ جوتا جائے کہ مرد کا بوجھ بھی عورت اٹھائے اور اس کے علاوہ فطرت کی طرف سے دیا ہوا بوجھ بھی وہ اٹھائے۔ یہ دوہرا بوجھ اس پر بھاری ظلم ہے اور جو لوگ عورت کی آزادی کا نام لے لے کر اسے گھر سے باہر گھسیٹ گھسیٹ کر ڈالتے ہیں وہ دراصل اپنے نفس کی لذّت کے لیے ایسا کرتے ہیں اور انھوں نے عورت کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر اسے سخت فریب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس بھاری بوجھ کے نیچے مغرب کی عورت کس طرح کراہ رہی

ہے مولانا نے مستند دستاویزات سے اس کی تصویر پیش کی ہے اور آخر میں اسلام کا وہ نظامِ عدل پیش کیا ہے جو سراسر انصاف اور فطری مساوات پر مبنی ہے۔ مولانا کی یہ معرکہ آرا کتاب اس قابل ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ کر کے مغرب کے سامنے غور وفکر کے لیے پیش کیا جائے۔

اسلام اور ضبطِ ولادت

یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے آج خاندانی منصوبہ بندی کے اس دور میں بہت اہم ہے اور اس قابل ہے کہ ہر تعلیم یافتہ آدمی اس کا غور وفکر سے مطالعہ کرے اور عقلی دلائل کے ساتھ اس مسئلے کے متعلق اپنی ایک رائے قائم کرے۔ یہ بات کہ جو کچھ بھی مغرب کی طرف سے آئے وہ لازماً عقل وخرد کا شاہ کار رہتا ہے سائنٹیفک ہوتا ہے اور ثابت شدہ حقائق ہوتے ہیں اور اس سے ہٹ کر سوچنا قدامت پسندی ہے۔ یہ ایک ایسی احمقانہ بات ہے جو بعض لوگوں کے ذہنوں میں سب سے بڑی عقل کی بات بن کر اتری ہوئی ہے۔

مغرب کی احمقانہ باتوں میں سے ضبط ولادت بھی ایک بڑی احمقانہ بات ہے۔ اگرچہ ان کے منتشر اور بے حیا معاشرے میں یہ ایک اہم معاشرتی ضرورت بن چکی ہے لیکن جس معاشرے میں بدکاری اب تک بری سمجھی جاتی ہو، شرم وحیا کی قدریں اب تک زندہ ہوں اور جزو ایمان قرار دی جاتی ہوں اس معاشرے میں اس کا تجربہ بہت بڑی دھاندلی ہے۔ مولانا مودودی نے اپنی کتاب میں ضبط ولادت کی تحریک، اس کے کھوکھلے دلائل اور اس کے مصنوعی طریقوں کا اچھی طرح پول کھولا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ نظریہ عملی طور پر سخت غیر عقلی، غیر معتبر اور عملی میدان میں نہایت ناکام نظریہ ہے۔

مصنف نے سب سے پہلے تو اس تحریک کی تاریخ، اس کے اسباب، اس کے قائدین اور ان کے دلائل اور اس کی ابتدائی وجوہات پر بحث کی ہے۔ پھر اس کے نتائج جو مختلف مغربی ملکوں میں مترتب ہوئے ہیں ان کا جائزہ لیا ہے پھر اسلام کا نکتۂ نظر پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلام ایک فرد کے لیے اسے کیوں خطرناک اور ہلاکت آفرین سمجھتا ہے اور معاشرتی، نسلی، معاشی اور اخلاقی لحاظ سے ایک معاشرے کے لیے کیوں تباہ کن قرار دیتا ہے۔

آخر میں مصنف نے اس کے حق میں پیش کیے گئے تمام دلائل کا کھوکھلا پن ثابت کیا ہے۔ اور عقلی دلائل سے اسے ایک فضول، لغو اور غیر عقلی تحریک قرار دیا ہے۔ یہ کتاب اس قابل

ہے کہ اس کا انگریز میں ترجمہ ہو اور مسلمانوں کے اوپر کے طبقے میں اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔

اسلامی ریاست

مولانا مودودی کی یہ کتاب ہر مسلمان ملک کے ارباب اقتدار کے لیے لمحۂ فکریہ پیش کرتی ہے۔ اسلامی نظام حیات کیا ہے اس کے نفاذ کی کیا کچھ تدابیر ہوسکتی ہیں۔ خود اسلامی ریاست کیا ہے، اسلامی دستور اور قانون کسے کہتے ہیں، اس کے مآخذ کیا ہیں، جدید دور میں اس کی تدوین کی کیا کیا صورتیں ہوسکتی ہیں اور جدید دَور میں ایک اسلامی ریاست کا ڈھانچا کن بنیادوں پر کس طرح کھڑا کیا جاسکتا ہے، کس طرح ایک اسلامی ریاست بہترین رفاہی ریاست ہوسکتی ہے اس کتاب میں ان سارے مسائل پر اتنی مدلل بحث ہے کہ اس کی موجودگی میں کسی شخص کا یہ کہنا کہ اسلامی دستور کیا ہوتا ہے؟ اسلامی ریاست کیسے قائم ہوسکتی ہے؟ یا اپنی جہالت اور کم علمی کا ثبوت فراہم کرنا ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ یہ کتاب تمام مسلمان ملکوں کے ارباب اقتدار پر ایک اتمام حجت ہے اور اس کی موجودگی میں وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم چاہتے تو ہیں کہ اسلامی نظام ہو لیکن وہ کیا ہوتا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہے اور نہ کوئی بتانے والا ہے۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش

یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ اس دور اور حالات کی بہترین علمی اور تنقیدی تاریخ ہے، جن سے مسلمان آج سے کچھ برس پہلے گزر رہے تھے۔ اس کتاب میں مسلمانوں کے اس وقت کے سیاسی رجحانات، ان کا داخلی انتشار، ان کے اندر کام کرنے والی سیاسی تنظیموں اور ان کے پروگراموں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، جن حالات میں مولانا مودودی نے کام شروع کیا۔

یہ مولانا مودودی کی چند اہم کتابوں کا تعارف ہے جو مختصر طور پر میں نے کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس تعارف سے میرا مقصد یہ ہے کہ قاری یہ جان سکے کہ مولانا کے تصنیفی موضوعات کیا کچھ رہے ہیں۔ اب مزید تعارف کی خاطر میں مولانا کی دوسری کتابوں کو بھی موضوع وار یہاں درج کر دیتا ہوں تاکہ بیک نظر یہ معلوم ہو سکے کہ انھوں نے کس کس موضوع پر کیا کیا کچھ کام کیا ہے ہر کتاب کا نام خود اس کے موضوع کی حدود متعین کر دے گا۔

قرآن وحدیث

تفہیم القرآن (چھے جلدیں)
قرآن وحدیث
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں
قرآن فہمی کے بنیادی اصول

اسلام کی بنیادی تعلیمات

دینیات
تفہیمات (پانچ جلدیں)
خطبات (مکمل)
اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی
مسئلہ جبر وقدر
اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر
رسائل ومسائل (پانچ جلدیں)
اسلام کا نظامِ حیات
اسلام میں مرتد کی سزا
اسلام اور جاہلیت
نشانِ راہ
زندگی بعد موت
سلامتی کا راستہ
دینِ حق

سیاسیات

مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش
مسئلہ قومیت
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے
مطالبہ نظام اسلامی
انتخابی جدوجہد
ہمارے داخلی اور خارجی مسائل
مخلوط انتخاب
مشرقی پاکستان کے حالات کا جائزہ

اسلامی قانون، دستور اور سیاسی نظریات

اسلامی قانون
اسلامی دستور کی تدوین
اسلامی دستور کی بنیادیں
اسلام میں ذمیوں کے حقوق
اسلام کا نظریۂ سیاسی
ایک اہم استفتاء
دستوری تجاویز
دستوری تجاویز پر تنقید وتبصرہ

الجہاد فی الاسلام
اسلامی ریاست

اسلامی اجتماعیات

جہاد فی سبیل اللہ
تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں
دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات
تجدید واحیائے دین
مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل
تحریک اسلامی کا مقصد تاریخ اور لائحہ عمل
ہدایات
شہادتِ حق

تعلیمات

تعلیمات
اسلامی نظام تعلیم
نیا نظامِ تعلیم
خطبہ تقسیم اسناد

معاشیات

انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
اسلامی معاشیات کے بنیادی اصول
مسئلہ ملکیت زمین
اسلام اور جدید معاشی نظریات

معاشرتی مسائل

پردہ
حقوق الزوجین
اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر
مسلم خواتین سے اسلام کے مطالبات
اسلام اور ضبطِ ولادت
معراج کی رات

بامقصد تصنیف و تالیف کا یہ وسیع سلسلہ خود بتاتا ہے کہ مولانا نے عمر بھر اتنا کام کیا ہے کہ ایک بڑی سے بڑی اکیڈمی بھی اس قدر علمی کام اتنے متفرق موضوعات پر انجام نہیں دے سکتی۔ اسے اللہ کی توفیق اور خداداد صلاحیت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

حرفِ آخر

اب ان آخری سطور میں اس کتاب کے قارئین کی خدمت میں چند باتیں خصوصی طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں۔

آپ نے اس کتاب کے مطالعے کے بعد محسوس کیا ہوگا کہ اس میں میرا موضوع تاریخ نہیں رہا ہے اس لیے کہ تاریخ لکھنا ابھی قبل از وقت ہے اور تاریخ خود زمانہ لکھے گا۔ کسی کام کے معاصرین بہت سے نفسیاتی وجوہ کی بنا پر اس کی تاریخ نہیں لکھ سکتے۔ میرا موضوع سوانح بھی نہیں رہا ہے۔ اس لیے کہ مجھے اس سے کوئی خاص دل چسپی نہیں ہے کہ فلاں ابن فلاں کون ہے۔ اور اس نے دنیا کی پر حوادث زندگی میں کیسے ایام گزارے۔ میرا موضوع شخصیت بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اتنی وزنی اور وسیع الاطراف شخصیت کو قلم کے دامن میں سمیٹنا بالکل میرے بس کی بات نہیں۔ میرا موضوع تو ایک متعارف کردار کا اپنے طور اور اپنے انداز میں تعارف کرانے کی اپنی سی کوشش کرنا ہے اور اس کردار سے زیادہ اس کے مقصد زندگی کا تعارف ہے آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ان سارے صفحات کے پردوں میں سے ایک حیرت انگیز کردار ابھر کر سامنے آتا ہے اور وہ کردار ایک با مقصد کردار ہے۔

اپنے آس پاس، بستی، شہر اور ملک میں نظر دوڑائیے کوئی اس نوعیت کا اور کردار بھی ہے جو مقصدِ زندگی کے اس نہایت وزنی بوجھ کے ساتھ شاہراہِ حیات پر چل رہا ہو۔ اپنے ملک میں اگر نہ ملے تو دور و نزدیک دیکھیے اور اوپر اٹھ کر اپنے سے ماضی قریب کے زمانے کی طرف دیکھیے۔

بڑے بڑے مقرر، لیڈر، ادیب، مفسّر اور جوشیلے انقلابی کارکن نظر آئیں گے۔ لیکن اگر بے لاگ طور پر دیکھیں تو شاید ایسا کردار اس انداز کے کام اور مقصد کے ساتھ نظر نہ آئے گا۔ یہ کردار تاریخ کے اسٹیج پر کبھی کبھی ابھرا کرتا ہے۔ یہ حق پرستی، حق گوئی اور حق آگاہی کا ایک مخصوص کردار ہے جو تاریخ کے اسٹیج پر باطل کے مقابلے میں حق کو کھول کھول کر بیان کرتا اور اس کے پلڑے میں اپنا سارا وزن ڈال دیا کرتا ہے جو باطل کو للکارتا اور اسے پچھاڑنے کے لیے امت کے اندر سے اسلام کے انصار و اعوان کو پکار پکار کر جمع کرتا اور معرکۂ حق و باطل برپا کر دیا کرتا ہے۔

زمانے نے ایسے معرکے کئی دیکھے ہیں۔ یہ کردار انحطاط و زوال کے ہر موقعے پر ابھر کر باطل کے خلاف کش مکش کرتا رہا ہے۔ اس کردار کے تاریخ میں مختلف نام ہیں۔ لیکن ان سب کا کام ایک ہے، مقصد ایک ہے، بنیادی طریق کار ایک ہے۔ اخلاقی قدروں کی حفاظت اور قرآن و سنت کی ترازو میں زندگی کے ہر مسئلے کو تول دینے کا داعیہ یکساں ہے۔

جس دور میں بھی یہ کردار ابھرا ہے، اس نے اپنے اپنے وقت کے مسلمان معاشرے کو آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس نے کھلم کھلا معرکۂ حق و باطل برپا کر کے رکھ دیا ہے۔ اس نے زندگی کے ہر معاملے میں قرآن و سنت کے نفاذ کا مطالبہ کر کے ہر زمانے کے جبّاروں کے ساتھ کش مکش برپا کی ہے اور ہر زمانے کے مدعیانِ ایمان کو آزمائش کی کسوٹی پر لا کھڑا کیا ہے۔

کون کس کا ساتھ دیتا ہے!

کون کس نظریۂ زندگی کو برپا کرنے کے لیے اپنا وزن کس پلڑے میں ڈالتا ہے!

یہ امت ایسے بہت سے تاریخی حوادث پر سر پیٹتی چلی آ رہی ہے کہ اس نے فلاں موقع پر فلاں طرزِ عمل کیوں اختیار نہ کیا۔ اس امت نے اپنی روایات کے تاریخی عجائب گھر میں ایسے بہت سے نوادراتِ عزیز و مقدس جمع کر کے رکھے ہوئے ہیں جو ان ہستیوں کی یادگاریں ہیں جنھوں نے ایسے معرکوں میں حق کا ساتھ دیا اور اس کے لیے اپنا سب کچھ لگا دیا لیکن ایسے معرکوں میں اپنی غیر جانب داری پر یہ امت اب تک نادم چلی آتی ہے۔

مولانا مودودی تاریخ کے انھی کرداروں میں سے ایک کردار ہیں۔ جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں حق کا بول بالا کرنے اور اسلام کو سربلند کرنے کی کوشش کی۔ بڑے خوش بخت ہوتے ہیں وہ لوگ جو ایسے کردار کو اپنے درمیان پا کر اس کی بات سننے اور سمجھنے کی کوشش کریں اور پھر اس کی تائید وحمایت کے لیے کھل کر اس کا ساتھ دیں اور ان کی بدبختی کا کیا ٹھکانا ہے جو مزاحمت کر کے تاریخ کے اندر اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے موردِ الزام ٹھہرالیں۔ لیکن جو لوگ ''حق وہی ہے جو غالب ہو'' کے فارمولے کو لیے خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہتے ہیں، ان کا ظلم بھی معمولی درجے کا نہیں ہے اور ان کی آئندہ نسلیں باطل کے نیچے دبی اور کراہتی ہوئی انھیں بھی کبھی معاف نہیں کرتیں۔

مولانا مودودی کوئی محض سرسری چیز نہیں ہیں۔ وہ ایک دوراہے پر کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ دوراہوں میں سے ایک خاص راہ ''قرآن وسنت پر مبنی نظامِ زندگی'' کی طرف ایک مدت سے بلا رہے ہیں۔ اس بات پر ایک نہیں ہزاروں اور لاکھوں گواہ ہیں اسی دوراہے پر اس ملک کا ہر فرد بشر کھڑا ہے اسے شعور کے ساتھ طے کرنا ہے کہ کون سی راہ اختیار کرے اور کس کا ساتھ دے۔ اور اپنا وزن کس پلڑے میں ڈالے اسلام کے ساتھ غیر جانب داری کا وزن غیر اسلام کے پلڑے میں ہی پڑتا ہے اس بات پر ہمیشہ کی اور خود اس ملک کی تاریخ بھی گواہ ہے۔

آپ اپنا وزن کس پلڑے میں ڈالیں!

یہ ایک سوال ہے؟

خاصا ٹیڑھا اور مشکل سوال ہے؟

کیا گزشتہ کی غیر جانب داری اور بے نیازیوں پر ماتم کرتی ہوئی تاریخ کو دہرانا آپ کے لیے، اس ملک کے لیے، اسلام کے لیے، خود آپ کی نسلوں کے لیے مفید ہوسکتا ہے! اگر مفید ہوسکتا ہے تو پھر اس کتاب کو بے نیازی سے ایک طرف رکھ کر اپنے عزیز کاروبار میں لگ جائیے اور کبھی بھول کر بھی مومن کے مقصد زندگی جیسے خطرناک سوال پر غور نہ کیجیے عافیت اور دنیا کی دولت اسی میں ہے۔

اگر مفید نہیں ہو سکتا تو پھر آگے بڑھ کر مولانا مودودی کی دعوت کو سمجھنے، ان کا ہاتھ بٹانے اور ان سے تعاون کرنے کی کوشش کیجیے کہ ممکن ہے دنیا کا خسارہ اس میں نظر آئے لیکن آخرت کی دولتِ بے پایاں اسی راہ میں ہے۔

بہ ہر حال مولانا مودودی سے ضرور ملیے اس لیے کہ ان کے پاس آپ کے لیے ایک اہم پیغام ہے۔